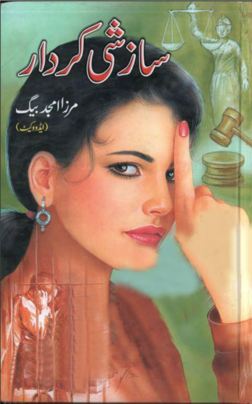
سازشی کردار
مرزا امجد بیگ
(ایڈووکیٹ)

قانونی پیچیدگیاں، عدالتی کارروائی کے اہم رموز ونکات،
زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے مقدمات

سازشی کردار

راوی: مرزا امجد بیگ (ایڈووکیٹ)

تحریر: حسام بٹ

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور

فون: 042-37652546 , 042-37668958

www.alqurai sh.com E.mail:info@alquraish.com

ب سے خوب تر کتابوں کی اشاعت
جدت اور معیار کے ساتھ

بااہتمام.....محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

.... 2013ء

.... نیئر اسد پریس لاہور

.... کلائمکس گرافکس

.... -/200روپے

سازشی کردار..........5

مجرمانہ ذہن..........57

نرم چارا..........105

پکا دھاگہ..........159

ضرورت مند..........209

سازشی کردار

منگل کے روز جو شخص سب سے پہلے میرے چیمبر میں داخل ہوا اس نے نہایت ہی سادہ مگر صاف ستھرا لباس زیب تن کر رکھا تھا جو اس کی نفاست کو ظاہر کرتا تھا۔ لباس سستا سا ہو یا بیش قیمت اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی تراش خراش پاکیزگی اور پہننے کا سلیقہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور یہ تمام خصوصیات آنے والے کی شخصیت میں نظر آ رہی تھیں۔

میں نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر میری ٹیبل کی دوسری جانب بیٹھ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

''جی فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''میرا نام ارشاد حسین ہے۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''اور میں اپنے بیٹے کے لئے سخت پریشان ہوں۔ اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔''

ارشاد حسین جتنا نفیس طبع دکھائی دیتا تھا اتنا ہی خوش کلام اور شائستہ گفتار بھی تھا۔ میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کے بیٹے کو ہوا کیا ہے... ؟''

''میرے بیٹے کو پولیس نے گرفتار کر لیا...'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کس جرم میں؟''

''میرے بیٹے نے کوئی جرم نہیں کیا وکیل صاحب...''

''میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے بیٹے کو پولیس نے کس جرم میں پکڑا ہے؟'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"پولیس نے حنیف پر قتل کا الزام عائد کیا ہے۔" اس نے بتایا۔

ظاہر ہے' حنیف اس کے اسی بیٹے کا نام تھا' جسے پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ میں نے پیڈ پر قلم گھستے ہوئے استفسار کیا۔

"حنیف پر کس کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے؟"

"اس شخص کا نام ڈاکٹر سلیم ہے۔" ارشاد حسین نے جواب دیا۔

"مقتول کس چیز کا ڈاکٹر تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"میرا مطلب ہے' وہ کسی شعبے کا اسپیشلسٹ تھا یا جنرل فزیشن......؟"

"جناب! وہ نہ تو جنرل فزیشن تھا اور نہ ہی اس نے کسی شعبے میں اسپیشلائزیشن کر رکھا تھا۔" اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے بتایا۔

"پھر وہ کس قسم کا ڈاکٹر تھا ارشاد صاحب؟" میں نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

وہ بہ دستور بیزاری سے بولا۔ "وکیل صاحب! میرے خیال میں تو سلیم سرے سے ڈاکٹر تھا ہی نہیں......"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں جناب!" میری حیرت میں خفیف سا طنز بھی شامل ہو گیا۔ "جب آپ اسے ڈاکٹر ہی نہیں سمجھتے تو پھر ڈاکٹر کہہ کیوں رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" کا لفظ لگا ہی کیوں رکھا تھا' یہ تو سراسر جرم ہے۔"

"بے شک یہ جرم ہے' بلکہ ڈاکٹر سلیم کے کیس میں تو یہ جرم تھا' کیونکہ وہ اب باقی نہیں رہا۔" ارشاد حسین میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن جناب! یہاں کون پوچھتا ہے؟"

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو میں نے کہا۔ "آپ کے اس کون پوچھتا ہے سے میں کیا مطلب اخذ کروں؟"

"میرا کوئی خاص مطلب نہیں تھا وکیل صاحب!" وہ بڑی بددلی سے بولا۔ "میں دراصل یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں کوئی بھی شخص اپنے نام کے ساتھ کچھ بھی جوڑ لے' کون پوچھتا ہے۔ ہر فراڈ شخص نے اپنے نام کے ساتھ مختلف قسم کے ساتھ کچھ بھی جوڑ لے' کون پوچھتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر' پروفیسر' حاجی' علامہ وغیرہ وغیرہ......" وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوا' پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اصل ڈاکٹر یا پروفیسر یا حاجی یا علامہ یا شاہ جی ہوتے نہیں ہیں' مگر دھوکا زیادہ ہے۔"

"جب "طوطا فال" نکالنے والا پروفیسر اور بسوں میں سرمہ منجن بیچنے والا آئی اسپیشلسٹ اور ڈینٹسٹ ہو سکتا ہے تو پھر ہمارے معاشرے میں دیگر لوگوں کے لئے بھی بڑی گنجائش نکل آتی ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"میرا اشارہ بھی ایسے ہی نام نہاد ماہرین کی جانب تھا۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اب یہی دیکھ لیں جناب......کیسی دلچسپ بات ہے۔ فال والا لفافہ تو طوطا اپنی چونچ میں پکڑ کر باہر نکالتا ہے اور "پروفیسر" اس شخص کے نام کے ساتھ لگا ہوتا ہے جو محض اس طوطے کو آپریٹ کر رہا ہوتا ہے۔"

"ہاں' بات دلچسپ ہی نہیں' بلکہ عجیب وغریب بھی ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ تمام تر معاشرتی حقائق دل جلانے کا سامان ہے۔ عوام ان کے سدھار کے لئے کچھ نہیں کر سکتی...... آپ مجھے ڈاکٹر سلیم کے بارے میں بتا رہے تھے' جواب مرحوم بلکہ مقتول کے درجے پر فائز ہو چکا ہے۔"

"جی ہاں' وہ بھی ایک ایسا ہی فراڈ تھا۔" وہ ایک بوجھل سانس لیتے ہوئے بولا۔ "وہ اپنی دانست میں بہت پہنچا ہوا بندہ تھا۔ اب نہ وہ باقی رہا اور نہ ہی اس کی دانش......سب کچھ پہنچ گیا ہے......بہت دور۔"

"اور اسی ڈاکٹر سلیم کے قتل کے الزام میں پولیس نے آپ کے بیٹے کو گرفتار کر لیا ہے۔" میں نے واپس اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "ارشاد صاحب! کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ آخر پولیس نے آپ ہی کے بیٹے کو کیوں گرفتار کیا ہے؟ آپ کے بیٹے حنیف اور ڈاکٹر سلیم کے درمیان کیا دشمنی تھی؟"

"کوئی دشمنی نہیں تھی جناب......"

"دشمنی نہیں تھی تو پھر دوستی رہی ہوگی؟"

"ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی وکیل صاحب!" اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"نہ دوستی تھی اور نہ ہی دشمنی!" میں نے قدرے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "پھر کس تعلق اور کن وجوہات کی بنا پر پولیس نے حنیف پر ہاتھ ڈالا ہے۔ آخر ملزم اور مقتول میں کوئی تو رابطہ

یا واسطہ رہا ہوگا۔''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے وکیل صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔'' حنیف اور ڈاکٹر سلیم میں استاد اور شاگرد کا تعلق تھا۔''

''ان میں سے استاد کون تھا اور کون شاگرد؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''ڈاکٹر سلیم کو حنیف نے اپنا استاد چن لیا تھا۔'' ارشاد حسین نے بتایا۔

''کمال کرتے ہیں آپ بھی۔'' میں نے خفگی آمیز نظر سے ارشاد حسین کی طرف دیکھا۔'' جب آپ مقتول ڈاکٹر سلیم کو ایک فراڈ شخص تسلیم کرتے ہیں تو پھر آپ نے اپنے بیٹے کو اس کی شاگردی میں کیسے جانے دیا؟''

''حنیف مجھ سے پوچھ کر اس کے چکر میں تھوڑا ہی پھنسا تھا'' اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔'' مجھے تو جب خبر ہوئی' پانی سر سے اوپر جا چکا تھا۔ بہرحال' میں نے حنیف کو سمجھانے کی بہت کوشش کی' لیکن میں اسے جتنا سمجھاتا' وہ اتنا ہی مجھ سے باغی ہوتا چلا گیا اور پھر یہ دن دیکھنا پڑا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج کل کی اولاد کو کوئی بات سمجھانا کتنا مشکل ہے......؟''

''جی ہاں' بہت مشکل ہے۔'' میں نے اس کا دل رکھنے کی غرض سے کہہ دیا۔'' یہ لوگ کوئی جملہ سننے کو تیار ہی نہیں ہوتے' سمجھانا تو بہت دور کی بات ہے۔''

یہ مسئلہ صرف آج کل کی اولاد کے ساتھ نہیں ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے' یہی سنتا آیا ہوں بڑے بزرگوں کی زبان سے کہ آج کل کی اولاد کچھ سنتی ہی نہیں اور اس نوعیت کا شکوہ کرتے وقت وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے وہ بھی کسی کی اولاد تھے اور ان کے بزرگوں کو بھی ان سے یہی شکایت تھی کہ ان کی کوئی بات سمجھ کر نہیں دیتے اور اس کے ساتھ ہی یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ آج جو اولاد اپنے والدین کی بات پر کان نہیں دھرتی' کل ان کی اولاد بھی یہی سلوک کرے گی۔

میری تائیدی رائے نے ارشاد حسین کو قدرے مطمئن کر دیا تو میں نے معلومات اخذ کرنے کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔'' حنیف نے مقتول کو کس شے کا استاد بنا لیا تھا؟''

''وہ ڈاکٹر سلیم سے ٹیلی پیتھی سیکھ رہا تھا۔''

ارشاد حسین کے جواب نے مجھے چونکا دیا اور میں نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔'' کیا واقعی ڈاکٹر سلیم' آپ کے بیٹے کو ٹیلی پیتھی سکھا رہا تھا؟''

''حنیف تو یہی سمجھ رہا تھا جناب!''

''کیا آپ نے اپنے بیٹے کے اندر اس علم کے کوئی آثار وغیرہ دیکھے تھے؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

''کوئی نہیں جناب!'' اس نے مایوسی سے گردن کو نفی میں جنبش دی اور برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔'' میں تو اس قسم کی چیزوں کو خرافات سے تعبیر کرتا ہوں۔ پتا نہیں' حنیف ان الٹے سیدھے چکروں میں کیوں پڑ گیا تھا۔''

''نہیں صاحب! ٹیلی پیتھی کا علم تو ایک سائنس اور ٹھوس حقیقت ہے۔'' میں نے پُر وثوق انداز میں کہا۔'' آپ اسے خرافات میں شامل نہیں کر سکتے۔''

''وکیل صاحب! میں نے ساری زندگی حساب کتاب اور اعداد وشمار میں گزاری ہے۔'' ارشاد حسین نے کہا۔'' میں دو اور دو چار...... کی فلاسفی پر یقین رکھتا ہوں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ آپ جس بھی شخص سے جو بھی سیکھنا چاہیں' پہلے یہ چیک کر لیں کہ وہ کام اس شخص کو خود بھی آتا ہے یا نہیں......''

''یہ تو بالکل اصولی بات ہے ارشاد صاحب!'' میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔'' اگر میں نے قانون نہیں پڑھ رکھا اور وکالت کے پیشے میں میرا تجربہ نہیں ہے تو پھر آپ مجھے وکیل کر کے اپنا ہی نقصان کریں گے۔''

''میں بھی یہی کہنا چاہ رہا ہوں وکیل صاحب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔'' ڈاکٹر سلیم کو کچھ بھی نہیں آتا تھا اور وہ ماہر بنا بیٹھا تھا ٹیلی پیتھی' ہپناٹزم' مسمریزم اور جانے کون کون سے علوم کا......'' اس نے دو سیکنڈ کا توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

''میری نگاہ میں ڈاکٹر سلیم ایک نمبر کا فراڈ اور دھوکے باز شخص تھا۔ پتا نہیں' کس دکھے ہوئے دل کی آہ اسے کھا گئی ہے۔''

''چلیں جناب...... اچھے یا برے' وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔'' میں نے واپس اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔'' یہ بتائیں کہ پولیس نے حنیف کو کتنے بجے اور کہاں سے

گرفتار کیا تھا؟''

''ٹھیک آٹھ بجے رات۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس وقت وہ گھر پر موجود تھا' بلکہ چند منٹ پہلے ہی وہ گھر پہنچا تھا۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''اسی دن..... جب ڈاکٹر سلیم کا قتل کیا گیا تھا۔''

''میرا مطلب ہے' کس تاریخ کو.....؟''

''سترہ اپریل کو۔'' ارشاد حسین نے جواب دیا۔

''آج انیس اپریل ہے۔'' میں نے ٹیبل کیلنڈر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے' پولیس نے اگلے روز یعنی اٹھارہ اپریل کو حنیف کو عدالت میں پیش کر دیا ہوگا۔''

''جی ہاں' اس وقت وہ عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔''

''ٹھیک.....'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے' عدالتی چارہ جوئی اب ریمانڈ کی مدت پوری ہو جانے کے بعد ہی کی جا سکے گی۔''

''جیسے آپ مناسب سمجھیں۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وقوعہ کے روز مقتول کے کلینک پر کیا واقعات پیش آئے تھے؟'' میں نے ارشاد حسین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اس بارے میں' میں آپ کو تفصیلاً کچھ نہیں بتا سکتا۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''بہتر ہوگا' آپ حنیف سے ایک بھرپور ملاقات کر لیں۔''

''وہ تو میں آج رات کسی وقت کر لوں گا۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا' پھر پوچھا۔ ''وہ کس تھانے میں زیرِ تفتیش ہے؟''

اس نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام بتانے کے بعد سوال کیا۔ ''میں مطمئن رہوں نا کہ آپ نے حنیف کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے؟''

''اس بات کا حتمی فیصلہ تو میں حنیف سے ملاقات کے بعد ہی کروں گا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''لیکن آپ اطمینان رکھیں کہ میں آپ کی بھرپور مدد کے لئے تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

یہ آپ کی ''حتمی فیصلہ'' والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی وکیل صاحب.....؟''

''بڑی سیدھی اور صاف سی بات ہے۔'' میں نے وضاحت ضروری جانی۔ ''عدالت تو کسی کیس کا فیصلہ اس کیس کے اختتامی مراحل میں تمام تر ثبوت' شواہد' گواہان کے بیانات اور دونوں جانب کے وکلاء کے دلائل کی روشنی میں کرتی ہے' لیکن میں.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے گہری نظر سے ارشاد حسین کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنی پوری بات کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں کسی کیس کو لینے یا نہ لینے کا فیصلہ ملزم سے ایک بھرپور ملاقات کے بعد کرتا ہوں۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہو جائے کہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کسی بھی حوالے سے ملزم اس کیس میں ملوث ہے تو پھر میں معذرت چاہتے ہوئے اس کیس سے ہینڈز اپ ہو جاتا ہوں؟''

''یہ آپ کا بہت ہی زبردست اصول ہے۔'' وہ تعریفی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''انشاء اللہ حنیف سے ملاقات کے بعد آپ کو کسی قسم کا شک نہیں گزرے گا۔''

''پھر تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

اس کے بعد ارشاد حسین نے مجھ سے میری فیس کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے اسے اپنی فیس بتا دی اور اس پر یہ بھی واضح کر دیا کہ میں فیس ایڈوانس میں لیتا ہوں۔

اس نے فوراً میری مطلوبہ فیس ادا کر دی۔ میں نے فیس کی وصولی کی رسید اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رقم ایک امانت کی طرح میرے پاس ہے۔ اگر خدانخواستہ میں نے آپ کے صاحبزادے کے کیس میں ہاتھ نہ ڈالا تو کل اسی وقت آپ میرے دفتر آ کر اپنی امانت لے جائیے گا۔''

''اور اگر آپ نے یہ کیس لینے کا فیصلہ کر لیا تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' وہ سوالیہ انداز میں تکنے لگا۔

''اس صورت میں بھی آپ کو میرے دفتر تو آنا ہی ہوگا۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''تاکہ اس کیس کے حوالے سے آئندہ کے لئے منصوبہ بندی کی جا سکے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اطمینان بھرے انداز میں بولا۔ ''تو پھر مجھے اجازت دیں۔''

اور میں نے اسے رخصت کی اجازت دے دی۔

***

عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں پھنسے ہوئے کسی ملزم سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

اس رات میں نے لگ بھگ آدھا گھنٹہ ملزم حنیف کے ساتھ حوالات میں گزارا' اس طرح کہ وہ آہنی سلاخوں کے اس طرف ایک قیدی کی حیثیت سے موجود تھا اور میں اس جانب ایک آزاد شہری کے مانند۔ میرے مختلف سوالات کے جواب میں حنیف نے مجھے بے حساب حقائق کے بارے میں بتایا۔ اس ملاقات کے اختتام پر میں اس کا کیس لینے کا حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔ تمام تر حالات و واقعات کی روشنی میں وہ نوجوان مجھے بے قصور و بے گناہ نظر آیا تھا۔

میں نے وکالت نامے' درخواست ضمانت اور دیگر ضروری کاغذات پر اس کے دستخط لئے اور اسے تسلی دینے کے بعد تھانے سے واپس آ گیا تھا۔

حنیف بھاری بدن کا مالک ایک گندمی رنگت کا ہینڈسم اور پرکشش نوجوان تھا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس کے آس پاس تھی۔ اس سے حاصل ہونے والی قیمتی معلومات کا خلاصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے واقف ہو جائیں اور عدالتی کارروائی کے دوران میں کسی مرحلے پر آپ کا ذہن الجھن کا شکار نہ ہو۔ یہاں پر یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ اس تفصیل کے اندر سے بعض باتیں میں نے دانستہ چھپا لی جنہیں عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مقامات پر ظاہر کروں گا۔

ارشاد حسین اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ گلشن اقبال کے علاقے میں رہتا تھا۔ اس کے پاس دو سو گز کا ذاتی گھر تھا' جو اس نے زندگی بھر کی محنت سے بنایا تھا۔ اس کی ساری زندگی بینک کی ملازمت کرتے گزری تھی اور حال ہی میں وہ اس جاب سے ریٹائر ہوا تھا۔ آج کل وہ اپنے ایک دوست اشتیاق بزمی کی ایجنسی پر بیٹھ کر کاروباری اسرار و رموز سیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اشتیاق بزمی ریئل اسٹیٹ ایجنٹ تھا اور کراچی کے علاقے ایف بی ایریا میں اس کی خوب چلی ہوئی ایجنسی تھی۔

ارشاد حسین نے بینک کے آڈٹ ڈیپارٹمنٹ میں زندگی گزاری تھی۔ اس کے پاس مال بنانے کے بہت مواقع تھے' اس کے ساتھ کے لوگ کہاں سے کہاں چلے گئے تھے' لیکن ارشاد حسین کے اندر رچی بسی ایمانداری نے اسے کبھی کوئی غلط کام نہیں کرنے دیا۔ جب ہی وہ

زندگی بھر کی جمع پونجی سے ایک مکان ہی بنا سکا تھا۔ بہ صورت دیگر اگر وہ چاہتا تو کسی بھی پوش علاقے میں عالیشان بنگلا بنانا کچھ مشکل نہ تھا۔ وہ اپنی اولاد کو رزق حلال کھلانا چاہتا تھا اور اس مقصد میں اسے صد فیصد کامیابی ہوئی تھی۔ یہ اس کی زندگی کی پہلی پریشانی تھی کہ اس کا جوان بیٹا قتل کے ایک کیس میں پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

ارشاد حسین کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی سلمیٰ کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ سلمیٰ کی شادی ایک بینکر فیضان سے ہوئی تھی اور وہ اپنے گھر میں خوش تھی۔

سلمیٰ سے چھوٹے دو لڑکے تھے۔ حنیف اور عمران۔ حنیف کی عمر چوبیس' پچیس سال کے درمیان تھی اور عمران اس سے چار سال چھوٹا تھا۔ ارشاد حسین نے اپنے دونوں بیٹوں کو بھی بنکر بنانے کے بارے میں سوچا تھا' لیکن حنیف نے اس کی ساری آرزوؤں اور امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ البتہ عمران ابھی تک اپنے مقصد پر جما ہوا تھا۔ وہ ان دنوں بی کام کر رہا تھا اور اپنے بڑے بھائی حنیف سے تعلیمی میدان میں آگے نکل گیا تھا۔ ارشاد حسین کو توقع تھی کہ وہ عمران کو ضرور کسی بینک میں فٹ کروا دے گا۔

حنیف انٹر سائنس میں تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر پراسرار قوتوں کے حصول کی طرف نکل گیا تھا۔ اس کا ذہن کچھ اس قسم کا تھا کہ آج کی دنیا میں تعلیمی اسناد انسان کو صرف کلرک ہی بنا سکتی ہیں' اچھا یا برا کلرک۔ اس کی نظر میں کسی بینک کا چپراسی بھی ایک کلرک تھا اور اسی بینک کا وی پی بھی کلرک۔ اس کے خیال میں معاشرے کا تنخواہ دار طبقہ کلرک ہی شمار ہوتا تھا' چاہے اس کی تنخواہ ایک ہزار ہو یا ایک لاکھ۔

ان اونچے خیالات کے ساتھ وہ کیا تعلیم حاصل کرتا اور کیا ارشاد حسین کی' اس کی بینک جاب کے سلسلے میں کوششیں بارآور ہوتیں۔ وہ بس دن رات ماورائی علوم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھا کرنے میں سرگرداں رہتا تھا' پھر کسی میگزین میں اس نے ٹیلی پیتھی کے حوالے سے کوئی مضمون پڑھ لیا۔ اس مضمون کی اثر پذیری نے حنیف کے ذہن اور سوچ کو اس درجہ متاثر کیا کہ اس نے حتمی فیصلہ کر لیا...... چاہے کچھ بھی ہو جائے' وہ ٹیلی پیتھی سیکھ کر ہی رہے گا۔

اس مصمم ارادے کے بعد اس نے کسی ایسے مرد میدان کی تلاش شروع کر دی' جو اسے

ٹیلی پیتھی کا علم سکھا سکے۔ جلد ہی اس کی مراد بر آئی۔

ایک روز وہ دوستوں کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا کہ ماورائی علوم کا ذکر نکل آیا' پھر ان علوم کے ماہرین کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ حنیف ان دنوں چونکہ ٹیلی پیتھی سیکھنے کے جنون میں مبتلا تھا' لہٰذا الیاس کی بات نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

''یار' سننے میں آیا ہے کہ ادھر نارتھ میں کوئی صاحب بہت پہنچے ہوئے ہیں۔'' الیاس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ان کے پاس ایسے علوم کا خزانہ ہے۔''

حنیف' شیخ احمد' الیاس اور مختار اکثر رات میں ''منظور'' نامی اس ہوٹل میں آ بیٹھتے تھے۔ مذکورہ ہوٹل کے مالک کا نام منظور حسین تھا' جو کافی عرصہ پہلے اس دار فانی سے کوچ کر گیا تھا' یہ اپنے علاقے کا ایک خوش ذائقہ ہوٹل سمجھا جاتا تھا' جو لگ بھگ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔

الیاس کی بات سن کر حنیف کے کان کھڑے ہو گئے اور اس نے جلدی سے پوچھا۔

''نارتھ کا علاقہ تو خاصا وسیع وعریض ہے' تم کہاں کی بات کر رہے ہو؟''

''میں نارتھ ناظم آباد کی بات کر رہا ہوں۔'' الیاس نے جواب دیا۔ ''وہ صاحب شادمان کے علاقے میں ہوتے ہیں۔''

''ان کا نام کیا ہے؟'' حنیف نے پوچھا۔

''ڈاکٹر سلیم فاروقی.....'' الیاس نے بتایا۔

اب گفتگو کا دائرہ سمٹ کر الیاس اور حنیف تک محدود ہو گیا تھا۔ شیخ احمد اور مختار بڑی دلچسپی سے انہیں سن رہے تھے۔ حنیف نے سوال کیا۔

''یار الیاس! کیا تم مجھے ڈاکٹر صاحب کا ایڈریس بتا سکتے ہو' مجھے ان سے کسی سلسلے میں معلومات حاصل کرنا ہیں۔''

حنیف نے دانستہ یہ بات ظاہر نہیں کی تھی کہ وہ ٹیلی پیتھی کا علم سیکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکتی تشویش اور تجسس نے الیاس کو بتا دیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے' لیکن گڑبڑ کہاں واقع ہے' اس بات کا اسے اندازہ نہ ہو سکا۔ وہ حنیف کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔

''کس سلسلے میں؟'' اس کے استفسار میں بڑی معنی خیزی تھی۔

''بس' ہے کوئی سلسلہ!'' حنیف نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''بتانا نہیں چاہ رہے ہو نا.....'' الیاس کے لبوں پر شکایت ابھر آئی۔ ''دوستوں سے چھپاؤ گے یار..... کسی لڑکی وڑکی کا چکر ہے تو بتا دو ڈاکٹر صاحب بڑا مجرب تعویذ بھی دیتے ہیں ایسے معاملات کے لئے.....''

''میرا ایسا کوئی چکر نہیں ہے جو تم دوستوں سے پوشیدہ ہو۔'' حنیف نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ''ہمارے ایک دور کے رشتے دار ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے سے بیمار چلے آرہے ہیں' میں ان کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اگر میری بات کا یقین آجائے تو مجھے ڈاکٹر صاحب کا ایڈریس بتا دینا' ورنہ تمہاری مرضی۔''

حنیف نے اب بھی اصل بات نہیں بتائی تھی۔ شیخ احمد نے کہا۔ ''یار حنیف! ہم تو پُراسرار اور ماورائی علوم کے حوالے سے بات کر رہے تھے اور الیاس نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کا ذکر کر دیا۔ بیچ میں تمہارے کسی عزیز کی بیماری کہاں سے آگئی؟''

''بتائے گا..... یہ ضرور بتائے گا۔'' مختار نے بڑے وثوق سے کہا۔ ''ہم کیا اس کی عادت سے واقف نہیں ہیں..... اسے مشرق کی طرف جانا ہو تو یہ شمال کی جانب سے سفر کا آغاز کرتا ہے اور جنوب کے قریب سے گزر کر بالآخر اپنی منزل مطلوب تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ جانتے نہیں ہو' شیرازی صاحب نے اس کے لئے کون سا ٹائٹل منتخب کر رکھا ہے.....؟''

شیرازی صاحب ان کے علاقے کے ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے' لیکن نہایت ہی زندہ دل اور خوش مزاج۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا زیادہ تر جوانوں اور نوجوانوں کے ساتھ ہوتا تھا اور وہ نئی نسل کے اندر بڑی آسانی سے گھل مل جاتے تھے۔ مختار نے انہی شیرازی صاحب کا حوالہ دیا تو الیاس پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''شیرازی صاحب نے حنیف کو کیا ٹائٹل دے رکھا ہے؟''

''چپ چھنال.....!'' مختار نے ڈرامائی انداز میں بتایا۔

''حنیف نے کسی زبانی یا عملی برہمی کا اظہار نہیں کیا' بلکہ شاکی نظر سے مختار کو گھور کر رہ گیا۔ شیخ احمد نے پوچھا۔

''ہاں تو یار حنیف' اب تم اپنی زبان ہی سے ہمیں بتا دو کہ کسی عزیز کی بیماری سے شروع ہونے والا معاملاتی سفر کہاں جا کر ختم ہونے کا نام لے گا؟''

''آپ لوگوں نے اگر آج میری بھد اڑانے کا پروگرام بنا ہی لیا ہے تو میں تمہیں کچھ

نہیں کہوں گا۔'' حنیف کی آواز میں خفگی کا عنصر بڑھ گیا۔''آپ لوگ بڑے شوق سے اپنا رانجھا راضی کر سکتے ہیں۔''

''ہم تو اپنے رانجھے کے ساتھ ساتھ تمہاری ہیر کو بھی راضی کرنا چاہتے ہیں یار!'' الیاس نے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔''لیکن پتا تو چلے کہ وہ ہے کون؟ اس کا نام کیا ہے؟ مقام کیا ہے؟ اور تم دونوں کے ملاپ میں گھمسان کیا ہے......؟''

''کرلو...... جتنی بھی بکواس کرنا ہے۔'' حنیف نے تیز آواز میں کہا۔''مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا' جب ایسا کوئی معاملہ ہے ہی نہیں تو خوانخواہ میں کیوں چڑوں؟''

''ارے بے وقوف ایسے معاملات پر چڑا نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے ہیں۔'' شیخ احمد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔''تم اس دنیا کی ساری لڑکیوں کو مجھ سے منسوب کر کے دن بھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہو' میں تمہارا شکر گزار ہوں گا اور تمہیں اپنی جیب سے مرغی فرائی کھلاؤں گا' دودھ پتی اس کے علاوہ ہے......''

حنیف یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔''اپنی بات سے پھرو گے تو نہیں؟''

شیخ احمد یہی سمجھا کہ حنیف کا اشارہ مرغی فرائی اور دودھ پتی کی جانب ہے۔ وہ بڑی کشادہ دلی سے بولا۔

''زبان سے جو کہہ دیا' سو کہہ دیا یار! میں اپنی بات سے نہیں پھروں گا۔ یہ دونوں گواہ بھی ہیں اور اگر پھر بھی تمہیں میرا یقین نہ آئے تو میں تمہاری ضمانت کے بل کی رقم نکال کر ابھی میز پر رکھ دیتا ہوں۔''

''ہاں' ٹھیک ہے...... یہ بھی کر دیکھو۔'' حنیف نے معنی خیز انداز میں کہا۔

شیخ احمد نے بڑے جوش سے پتلون کی ہپ پاکٹ میں سے بٹوا نکالا اور پھر اس بٹوے میں سے پچاس روپے کا ایک نوٹ برآمد کر کے میز پر دے مارا' جیسے تاش کے کھیل میں ترپ کا پتا دوسرے پتوں کے اوپر پٹخا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس نے بڑے حاتم طائی کے انداز میں کہا۔

''آج سب لوگ میری جیب سے مرغی فرائی کھائیں گے۔''

حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے پچاس روپے میں چار افراد بہ آسانی مرغی فرائی کھا لیتے تھے اور ان کی چائے یا کولڈ ڈرنک وغیرہ کا آسرا بھی ہو

جاتا تھا۔ آج کل پچاس روپے میں مرغی کی ایک ٹانگ بھی دستیاب نہیں ہوتی...... اللہ اللہ کیا انقلاب زمانہ ہے۔

''اب شروع ہو جاؤ تم جلدی سے۔'' شیخ احمد نے کہا۔''میں نے اپنی زبان پوری کر دی ہے۔''

''میں سب سے پہلے دو لڑکیوں کا ذکر کروں گا۔'' حنیف نے گمبھیر انداز میں کہا۔''اگر یہ ذکر تم ہضم کر پائے تو پھر میں آگے بھی کوشش کروں گا' ورنہ یہ سلسلہ یہیں ختم سمجھو......''

شیخ احمد نے ٹٹولنے والی نظر سے حنیف کو دیکھا اور سوال کیا۔''تم کن دو لڑکیوں کی بات کر رہے ہو؟''

''ان کے نام ہیں......'' حنیف نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔''سحرش اور نازنین......''

''ابے یار...... اس کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے......'' مختار نے بے ساختہ کہا۔

الیاس بے اختیار بولا۔''اس نے تو شیخ احمد کی بہنوں ہی سے ابتداء کر دی......''

شیخ احمد اس دوران میں لال بھبوکا ہو چکا تھا۔ چیخ سے مشابہ لہجے میں اس نے حنیف سے کہا۔''میری بہنوں کا اگر دوبارہ نام لیا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ تمہاری یہ ہمت کیسے ہوئی......؟''

''یہ ہمت تو مجھے آپ ہی نے دلائی ہے شیخ صاحب!'' حنیف نے نہایت ہی مہذب' ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔''آپ نے ایسی تو کوئی شرط نہیں لگائی تھی کہ آپ کی بہنوں کو بیچ نہیں کرنا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ اس دنیا کی ساری لڑکیوں کو آپ سے منسوب کر سکتا ہوں۔ اب یا تو آپ سارا غصہ تھوک کر اپنے کہے پر شرمندہ ہو جائیں یا پھر یہ ثابت کریں کہ سحرش اور نازنین اس دنیا کی نہیں' بلکہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہیں......'' وہ بڑے جذباتی انداز میں متوقف ہوا' پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''افسوس کہ ہم دوسری لڑکیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی کسی کی بہنیں یا کسی کی بیٹیاں ہوں گی۔ ہم اپنے نفس کی تسکین اور ذہن کی تفریح کے لئے اپنے پسندیدہ زاویوں پر انہیں فٹ کر کے حظ اٹھانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے اور جب کوئی دوسرا شخص ہماری چال ہم پر لوٹا کر ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو ٹارگٹ کرتا ہے تو ہمارے لہو

میں ڈیڑھ ہزار سینٹی گریڈ کا ابال آ جاتا ہے۔ کیوں...... آخر کیوں...... کیا ہمارا خون صرف اپنی عزت کے لئے جوش مارتا ہے‘ دوسروں کی عزت تفریح طبع کا سامان ہے بس......‘‘

’’مجھے پتا نہیں تھا یار! کہ تمہارے اندر کوئی مولوی چھپا بیٹھا ہے۔‘‘ شیخ احمد نے اٹھ کر بازو آگے کر دیئے۔’’مجھے معاف کر دو حنیف! تم نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔‘‘

اگلے ہی لمحے وہ دونوں بغل گیر ہو چکے تھے۔

آئندہ دس منٹ میں سب کچھ نارمل ہو گیا۔ دوستوں میں روٹھنا اور مان جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ ویسے حنیف نے جتنی بڑی حقیقت کو شیخ احمد کے سامنے اجاگر کیا تھا‘ ان میں سے کسی کو بھی اس سے اختلاف نہیں تھا۔ مختار نے شیخ احمد کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’تو پھر ان پچاس روپے کی مرغی فرائی منگوالی جائے؟‘‘

’’میری طرف سے پوری اجازت ہے۔‘‘ وہ خجل سا ہو کر بولا۔

’’میرا خیال ہے‘ اس سلسلے میں ہمیں حنیف کا مشورہ ماننا چاہئے۔‘‘ الیاس نے تجویز دینے والے انداز میں کہا۔’’کیونکہ ان پچاس روپے کا فاتح تو یہی ہے نا!‘‘

سب نے الیاس کی بات سے اتفاق کیا تو حنیف سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

’’میرے خیال میں مرغی ٹھیک نہیں‘ وہ تو اور بلڈ پریشر بڑھائے گی۔ یہاں پہلے ہی خاصی گرما گرمی ہو چکی ہے‘ لہٰذا اس رقم کی ہم آئس کریم کھائیں گے‘ لیکن ایک شرط ہے......‘‘

حنیف نے جملہ نامکمل چھوڑا تو الیاس نے فوراً پوچھا۔’’کیسی شرط......؟‘‘

’’منظور سے اٹھنے سے پہلے تم مجھے ڈاکٹر سلیم فاروقی کا ایڈریس بتاؤ گے۔‘‘ حنیف نے دوٹوک انداز میں کہا۔

’’سچی بات تو یہ ہے حنیف...... کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے کلینک کا ایڈریس معلوم نہیں ہے۔‘‘ الیاس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔’’مجھ سے بھی ایک دوست نے ذکر کیا تھا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ شادمان کے علاقے میں ہوتے ہیں۔‘‘

’’تو ٹھیک ہے‘ پھر تم اپنے اس دوست ہی سے پوچھ کر بتا دینا۔‘‘ حنیف نے کہا۔’’لیکن یار! میرے اس کام کو یاد رکھنا۔‘‘

’’تم بے فکر ہو جاؤ۔‘‘ الیاس نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔

اور حنیف...... واقعی بے فکر ہو گیا۔

اگلے روز الیاس نے حنیف کو اپنے ساتھ لے جا کر اس دوست سے ملوا دیا‘ جس کا اس نے ’’منظور‘‘ میں ذکر کیا تھا۔ اس شخص کا نام طارق شاہ تھا اور وہ ایف سی ایریا کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ حنیف کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ طارق شاہ‘ ڈاکٹر سلیم فاروقی کے ساتھ ہی ہوتا تھا‘ بلکہ کلینک کے معاملات میں وہ ڈاکٹر صاحب کا اسسٹنٹ تھا۔

طارق شاہ ایک گورا چٹا اور درمیانہ قد شخص تھا۔ جسم مائل بہ فربہی اور چہرے پر ہلکی سی ڈاڑھی مونچھیں۔ وہ اپنے سر پر ہر وقت ٹوپی لگائے رہتا تھا۔ طارق شاہ نے بڑی محبت اور اخلاص سے ان کا استقبال کیا۔ راستے میں حنیف نے الیاس کو اپنے مقصد سے تفصیلاً آگاہ کر دیا تھا کہ ڈاکٹر سلیم سے ملنے کے لئے اتنا بے تاب کیوں ہے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد الیاس نے حنیف کا تعارف کرانے کے بعد طارق شاہ سے کہا۔’’شاہ جی! یہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ یہ آپ کے ڈاکٹر صاحب سے ٹیلی پیتھی سیکھنا چاہتا ہے۔‘‘

’’بڑی خوشی سے جناب!‘‘ طارق شاہ نے دوستانہ انداز میں کہا۔’’ہم بیٹھے کس لئے ہیں آخر......؟‘‘ وہ پھر براہ راست حنیف سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

’’آخر سرکار سے ملاقات کے لئے کبھی کلینک پر تشریف لائیں۔‘‘

’’سرکار!‘‘ سے اس کی مراد یقیناً ڈاکٹر سلیم ہی سے تھی۔ حنیف نے عقیدت بھرے انداز میں کہا۔

’’آپ مجھے کلینک کی لوکیشن بتا دیں میں حاضر ہو جاؤں گا۔‘‘

طارق شاہ نے نہایت سہل انداز میں اسے ’’فاروقی کلینک‘‘ کی لوکیشن سمجھا دی تو حنیف نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔

’’کلینک کی کوئی مخصوص ٹائمنگ ہے یا......؟‘‘

’’بالکل ٹائمنگ ہے بھائی۔‘‘ طارق شاہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔

’’دن میں گیارہ بارہ سے لے کر چار بجے تک اور شام میں پانچ بجے سے لے کر رات دس بجے تک کلینک کھلا رہتا ہے۔ ان اوقات میں آپ کسی وقت بھی آ سکتے ہیں۔‘‘

’’کیا اس دوران میں تمام وقت ڈاکٹر صاحب کلینک پر موجود رہتے ہیں۔‘‘ حنیف نے

اپنی تسلی کے لئے پوچھ لیا۔

''دراصل میں ایسے وقت میں ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں' جب ذرا فرصت ہو تاکہ میں اپنے معاملے پر ذرا تفصیلاً ان سے بات کرسکوں۔''

''بس' تو پھر آپ شام میں ہی آئیں تو اچھا ہے۔'' طارق شاہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''صبح کے وقت تو زیادہ رش عورتوں ہی کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے مسائل سنا سنا کر سرکار کا دماغ خالی کر دیتی ہیں۔ سرکار چار بجے سے پانچ بجے تک آرام فرماتے ہیں۔ پانچ بجے فریش ہو کر دوبارہ بیٹھ جاتے ہیں اور اس وقت سائلین کا سب سے کم ہجوم ہوتا ہے' بلکہ میں نے تو دیکھا ہے کہ پانچ اور ساڑھے پانچ کے درمیان تو کلینک خالی ہی پڑا ہوتا ہے۔ سرکار ہوتے ہیں' میں ہوتا ہوں یا پھر آصف جو کلینک میں اوپری کام کے لئے رکھا گیا ہے۔ کلائنٹس وغیرہ چھ بجے کے بعد ہی آنا شروع ہوتے ہیں۔''

''بس تو جناب! میں کل ٹھیک پانچ بجے کلینک پر حاضر ہو رہا ہوں۔'' حنیف نے ولولہ انگیز لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرانا آپ کا کام ہے......''

''میں سرکار سے آپ کی ملاقات ضرور کرادوں گا۔'' طارق شاہ نے یقینی لہجے میں کہا۔ ''بلکہ میں دن ہی میں ان سے آپ کا ذکر کردوں گا۔''

''یہ تو آپ کا بڑا احسان ہوگا مجھ پر۔'' حنیف نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔

وہ دس پندرہ منٹ مزید طارق شاہ کے فلیٹ پر رکے' چائے بسکٹ سے معدے کو محظوظ کیا' پھر صاحب خانہ سے پرجوش مصافحہ کرکے واپس آگئے۔

آئندہ روز سے حنیف نے فاروقی کلینک پر جانا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر سلیم فاروقی نے پہلی ہی ملاقات میں اسے سرتاپا متاثر کرلیا تھا۔ ڈاکٹر کو ٹیلی پیتھی آتی تھی یا نہیں اور مجھے یقین ہے...... بالکل نہیں آتی تھی' ورنہ وہ ایسی بے بسی اور بے کسی کی موت ہرگز نہ مرتا۔ بہرحال' تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ وہ شخص مختلف ماورائی علوم کے بارے میں گہری معلومات ضرور رکھتا تھا۔ شعور' لاشعور' تحت الشعور' حواس خمسہ' چھٹی حس' پچیوٹری گلینڈ' تھرڈ آئی اور دیگر ایسی ہی درجن بھر دماغی ونفسیاتی اصطلاحات کی مار مار کر ڈاکٹر نے حنیف کو اپنا مرید بنالیا' بلکہ اس کے دماغ میں یہ خیال جاگزیں کر دیا کہ وہ اسے بہت عزیز رکھتا ہے اور اس احساس نے حنیف کے اندر اس کی اوقات سے زیادہ ہوا بھر دی اور وہ بعض اوقات تو دن میں بھی ''سرکار'' کی

خدمت میں حاضریاں دینے لگا۔

حنیف لگ بھگ تین ماہ تک ٹیلی پیتھی سیکھنے کے شوق میں ڈاکٹر سلیم فاروقی کے کلینک جاتا رہا۔ ٹیلی پیتھی کا تو ''ٹ'' بھی اس کے دماغ میں نہیں سمایا تھا' البتہ اس نے اس دوران میں کلینک پر عجیب عجیب کلائنٹس کو دیکھا اور ان کے مسائل کو سنا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ کیس عورتوں کے ہوتے تھے' جن میں سے بیشتر اپنے شوہروں کو سیدھا کرنے کے لئے ڈاکٹر سے مختلف قسم کے تعویذات اور بندشیں وغیرہ بنوا کر لے جاتی تھیں۔ ایسی احمق عورتیں اگر اس سے آدھی توجہ بھی اپنے شوہروں پر مرکوز کرتیں' جتنی وہ ڈاکٹر صاحب کے لئے بچا کر رکھتی ہیں تو انہیں کسی تعویذ یا بندش کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ ان کے بگڑے ہوئے شوہر نہ صرف یہ کہ سیدھے ہو جاتے' بلکہ ان کے مطیع وفرماں بردار بھی بن جاتے۔

کیونکہ وہ محبت کے بھوکے' رومانس کے متلاشی اور پرسکون گھریلو ماحول کے پیاسے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بیوی کو ہر رات ایک بنی سنوری دلہن کے روپ میں دیکھنے کے بھی متمنی ہوتے ہیں' لیکن دوسری جانب معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

اسے باہر والوں کے ''دیکھنے'' کا اتنا زیادہ خیال اور اس خیال کا ایسا شاندار اہتمام کا احساس ہوتا ہے' مگر جس شخص کو انہیں دیکھنا چاہئے' جب یہ اس کے قریب جاتی ہیں تو کچن والا' پسینے میں بسا ہوا لباس ان کے بدن پر سجا ہوتا ہے' جس میں سے لہسن' پیاز کے علاوہ مختلف چٹنیوں کی مہک اٹھ رہی ہوتی ہے۔

ان کے اس حسن سلوک کی تاب نہ لاتے ہوئے اگر کوئی شوہر گھر سے باہر ''سکھ چین'' کے لئے نگاہ دوڑانے کی کوشش کرے یا ایسی کوشش کے دوران پکڑا جائے تو سب سے پہلے تو گھر کے اندر ایک فساد عظیم برپا کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سلیم فاروقی جیسے عامل کامل فراڈ لوگوں کے آستانے پر شوہروں کو سیدھا کرنے کے لئے تعویذات اور بندشیں وغیرہ لینے پہنچ جاتی ہیں۔

ایک بیوی کسی سیانے کے پاس پہنچی اور عرض کیا۔ ''حضرت! کوئی ایسا عمل کریں کہ میرا شوہر سدھر جائے......''

''اس میں ایسی کیا خرابی ہے؟'' سیانے نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''سرکار! وہ مجھ پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتا۔'' اس بیوی نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ ''مجھے گھر

کی مرغی اور گھڑے کی مچھلی سمجھتا ہے۔ اس کی ساری توجہ اور محبت باہر کی رنگین تتلیوں پر نچھاور ہوتی ہے۔ میں سخت پریشان ہوں۔''

''بات تو واقعی پریشانی کی ہے۔'' سیانے نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''لیکن تم فکر نہ کرو میں کرتا ہوں کچھ......''

''وہ میری طرف راغب ہو جائے گا نا......؟'' بیوی نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''بالکل ہو جائے گا۔'' سیانا تیقن سے بولا۔ ''میرا عمل خطا نہیں جاتا لیکن......''

''لیکن کیا بابا جی......؟'' سیانے کے ادھورے جملے پر اس بیوی نے تڑپ کر پوچھا۔

''لیکن یہ کہ......'' سیانا گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مجھے اس عمل کے لئے شیر کی گردن کا ایک بال چاہئے ہوگا۔ میں چاہوں تو وہ بال کسی سے بھی منگوا لوں، لیکن اس عمل کا تقاضا یہ ہے کہ جس کا کام ہو، بال بھی اسی کو لانا ہوگا۔''

''لیکن قبلہ!'' بیوی جز بز ہوتے ہوئے بولی۔ ''شیر تو بہت ہی خطرناک جانور ہے۔ میں اس کی گردن میں سے کوئی بال......؟''

''مجھے یقین ہے، تم یہ کام کر سکتی ہو۔'' سیانے نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''مجھے تمہارے اندر چھپی ہوئی وہ صلاحیت صاف نظر آ رہی ہے، جس کو بروئے کار لا کر تم ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہو۔ جاؤ...... شیر کی گردن کا صرف ایک بال لے آؤ۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

وہ بیوی سیانے کے آستانے سے واپس آ گئی اور اگلے ہی روز سے اس نے باقاعدگی کے ساتھ چڑیا گھر جانا شروع کر دیا، جہاں ایک پنجرے میں شیر ببر بھی بند تھا۔ اس کے سامنے چونکہ ایک مقصد آن کھڑا ہوا تھا، لہٰذا وہ پوری مستقل مزاجی کے ساتھ اس مہم کو سر کرنے میں لگ گئی۔ وہ ہر قیمت پر شیر کی گردن کا بال حاصل کر کے، سیانے کے طلسماتی اور کرشماتی عمل سے اپنے شوہر کو قابو کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

ابتداء میں اس نے اپنے ساتھ گوشت کا ایک پارچہ لے جانا شروع کیا۔ وہ شیر کے پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی اور گوشت کے ٹکڑے کو پنجرے کے اندر پھینک کر شیر کو اس کی جانب متوجہ کرنے کے لئے اشاروں اور سیٹیوں کی ترکیب آزمانے لگی۔ دوسری یا تیسری کوشش پر ہی شیر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا...... وہ شیر ببر کو

گوشت کی جھلک دکھا کر آنکھوں سے مخصوص اشارہ کرتی تو وہ اس کی دعوت پر فوراً گوشت سے فیض یاب ہونے کے لئے لپک پڑتا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ شیر اس بیوی سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ گوشت سے لذت آشنا ہونے کے بعد وہ اس کے قریب بیٹھ جاتا اور وہ بیوی اس کی گردن کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر اسے مزے دلاتی رہتی...... پھر ایک روز اس نے موقع دیکھ کر شیر کی گردن سے ایک بال نوچ ہی لیا۔

اپنی اس کامیابی پر بے حد شاداں و فرحاں وہ بھاگتی ہوئی اس سیانے کے پاس پہنچی اور مذکورہ بال اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''حضرت! یہ لیں بال۔ میں نے تو اپنا کام کر دیا۔ اب آپ بھی اپنا عمل شروع کریں۔''

سیانے نے حیرت بھری نظر سے اس بیوی کو دیکھا، پھر پوچھا کہ اس نے یہ بال حاصل کرنے کے لئے کیا ترکیب آزمائی ہے۔ بیوی نے اپنی کوشش کو پوری تفصیل سے بیان کر دیا۔ سیانے کی حیرت دوچند ہو گئی۔ وہ پُرمعنی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''اللہ کی بندی! سمجھ لو کہ تمہارا کام ہو گیا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اب میرے کسی عمل کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔''

''آپ عمل نہیں کریں گے تو میرا کام کیسے ہوگا؟'' وہ تعجب خیز لہجے میں بولی۔

''میں نے کہا نا، تمہارا کام ہو گیا۔'' سیانے نے اصراری لہجے میں کہا۔ ''بس، اب تمہیں میری ایک بات دھیان سے سننا ہوگی۔ اگر تم نے میری بات کو پوری توجہ سے سن کر اپنے ذہن میں بٹھا لیا تو سمجھو کہ تمہارا بیڑا پار ہو گیا۔''

وہ بیوی ہمہ تن گوش ہو گئی۔ سیانے نے اس کے انہماک اور سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''او جھلئے...... جتنی مہارت اور عقل مندی سے تم نے گوشت دکھا دکھا کر جنگل کے بادشاہ کو رام کر لیا تھا، اگر تم خلوص تن من سے...... اس سے آدھی محنت بھی اپنے شوہر پر کرو تو وہ ساری زندگی تمہارے قدموں میں پڑا رہے گا۔ پھر تمہارے سارے گلے شکوے جاتے رہیں گے۔''

تو میں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم حنیف کو ٹیلی پیتھی

سیکھنے کی غرض سے ڈاکٹر سلیم فاروقی کے کلینک پر جاتے ہوئے لگ بھگ تین ماہ ہوئے تھے کہ ایک روز اسے اسی ڈاکٹر سلیم کے قتل کے الزام میں پولیس نے گرفتار کرلیا تھا۔

***

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی اور اپنے مؤکل کی ضمانت کے لئے دلائل دینا شروع کر دیئے۔

قتل کے ملزم کی ضمانت بہت مشکل سے ہوتی ہے' بلکہ یہ کام ناممکن کی حدود کو چھوتا محسوس ہوتا ہے۔ میں یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کروں گا کہ میں اپنے مؤکل کی ضمانت کروانے میں قطعی ناکام رہا تھا۔

پولیس نے اپنی تفتیش کی روشنی میں میرے مؤکل کو ڈاکٹر سلیم فاروقی کا قاتل نامزد کیا تھا اور اسی رپورٹ کو استغاثہ کہا جاتا ہے۔ یہ رپورٹ کئی صفحات پر مشتمل تھی' جس کے اہم مندرجات گاہے بہ گاہے آپ کی نظروں سے گزرتے رہیں گے۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول ڈاکٹر سلیم فاروقی کی موت سترہ اپریل کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ وہ اپنے کلینک کے آخری یعنی تیسرے اور عقبی پورشن میں مردہ حالت میں پایا گیا تھا۔ اس کی موت کا سبب ایک آہنی سلاخ تھی' جس کی خطرناک ضرب نے مقتول کی کھوپڑی کے پچھلے حصے کو بڑی بے دردی سے ''پاش پاش'' کر دیا تھا' یعنی وہ حصہ بری طرح چٹخ گیا تھا۔ اس کاری وار نے اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔

رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں یہ بھی درج تھا کہ مقتول کو حالت نیند میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ کلینک کا وہ عقبی پورشن اس نے اپنے آرام کے لئے مختص کر رکھا تھا' جہاں فرش پر ایک گداز بستر بچھا دیا گیا تھا۔ مقتول کے معمول میں یہ بات شامل تھی کہ وہ روزانہ سہ پہر میں چار بجے سے لے کر پانچ بجے تک اسی پورشن میں لیٹ کر ایک آرام دہ نیند لیا کرتا تھا' جس کے بعد وہ فریش ہو کر دوبارہ اپنے کلینک پر آ بیٹھتا تھا۔ اس کی بیٹھک کلینک کے دوسرے یعنی وسطی پورشن میں ہوا کرتی تھی' جہاں وہ اپنے پاس آنے والے مصیبت زدہ لوگوں کے مسائل سنتا تھا اور ان کے مسائل کے لئے مختلف ماورائی اور غیر ماورائی حل تجویز کیا کرتا تھا اور ظاہر ہے' یہ کام وہ مفت میں یا فی سبیل اللہ نہیں کرتا تھا۔

مقتول ڈاکٹر نے اپنی کوئی مخصوص فیس مقرر نہیں کر رکھی تھی۔ اس کے پاس معاشرے کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے کلائنٹس آیا کرتے تھے' جن میں ایسے بھی ہوتے تھے کہ جنہیں تعویذ کے علاوہ کھانے کے پیسے بھی دینا پڑتے تھے اور بعض ''پارٹیاں'' ایسی بھی تھیں' جن سے وہ ''بندش'' کرنے یا ''بندش'' کاٹنے کی مد میں ہزاروں وصول کرلیا کرتا تھا۔ اس نے حصہ بہ قدر جثہ کے مصداق ایک ایسی نادیدہ چھری ہاتھ میں پکڑ لی تھی' یہ موقع محل دیکھ کر کلائنٹس کو کاٹتی تھی اور وہ ہر صورت میں فائدے ہی میں رہتا تھا۔ وہ جن سے رقم وصول نہیں کرتا تھا' ان سے کچھ اور وصول کرلیا کرتا تھا اور یہ ''کچھ اور'' فرد بہ فرد بدلتا رہتا تھا۔ اس معاملے میں وہ مرد اور عورت میں تمیز کرنا خوب جانتا تھا۔

مقتول کے کلینک کا پہلا یعنی ابتدائی پورشن ریسپشن کی حیثیت کا حامل تھا' جہاں مقتول ڈاکٹر کا اسسٹنٹ طارق شاہ براجمان ہوا کرتا تھا۔ طارق شاہ کی مخصوص نشست کے علاوہ سائلین کے لئے دو تین صوفے ڈال دیئے گئے تھے' جہاں بیٹھ کر وہ اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔ گویا وہ ابتدائی پورشن بیک وقت طارق شاہ کا کمرہ بھی تھا اور کلائنٹس کے لئے انتظار گاہ بھی' جہاں پر موجود ضرورت مند طارق شاہ کی مرضی ہی سے مقتول ڈاکٹر کے پاس شرف باریابی پاتے تھے۔

جب ملزم کی درخواست ضمانت مسترد ہو چکی تو عدالت کی جانب سے اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا تھا۔

ابتدائی چند پیشیوں پر کوئی بھی قابل ذکر عدالتی کارروائی نہ ہو سکی۔ اس ٹیکنیکل تفصیل کو بیان کر کے میں آپ کو بور نہیں کروں گا۔ لگ بھگ دو ماہ کے بعد' عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ اس دوران میں' میں مختلف پہلوؤں سے' ڈھیروں اہم نکات جمع کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا گویا' میں اس کیس سے نمٹنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔

آئندہ پیشی پر جب اس کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی تو جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی' جس کے جواب میں' میرے مؤکل نے صحت جرم سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔

ملزم نے معزز عدالت کے سامنے کم و بیش وہی بیان دیا تھا' جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکا تھا۔ وکیل استغاثہ نے جج کی اجازت کے بعد ملزم پر کڑی جرح کی' لیکن ملزم میری

ہدایات کی روشنی میں بڑی ثابت قدمی سے وکیل مخالف کی جرح کے سامنے ڈٹا رہا۔

اپنی باری پر میں اکیوزڈ باکس کے قریب چلا گیا۔ پھر ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ تم مقتول کے کلینک پر اکثر جایا کرتے تھے؟''

''جی ہاں...... یہ بات سچ ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''یہ سلسلہ کب سے جاری تھا؟''

''لگ بھگ تین ماہ سے۔''

''تمہارا مطلب ہے......'' میں نے تصدیق طلب لہجے میں پوچھا۔ ''مقتول کی بھیانک موت سے تین ماہ پہلے سے؟''

''جی ہاں' میرا یہی مطلب تھا......''

''کیا تم پر کوئی جن وغیرہ آتا تھا یا کسی بندش کو کٹوانے تم مقتول کے کلینک پر جایا کرتے تھے۔'' میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے استفسار کیا۔ ''سنا ہے' مقتول بہت ہی پہنچا ہوا ماہر عامل تھا......؟''

''سنا تو میں نے بھی یہی تھا جناب......'' وہ بددلی سے بولا۔ ''لیکن وہ کہتے ہیں کہ...... دور کے ڈھول سہانے......تو میرے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوا تھا اور جہاں تک آپ کے سوال کے پہلے حصے کا تعلق ہے نا تو......'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس لی' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''مجھ پر نہ تو کوئی جن آتا تھا اور نہ ہی میرے ساتھ بندش جیسا کوئی معاملہ تھا۔ جن اس لئے نہیں آ سکتا تھا کہ میں کوئی حسین وجمیل دوشیزہ نہیں تھا اور بندش کا سوال اس لئے نہیں پیدا ہوتا تھا کہ دور دور تک میرا کوئی دشمن نہیں تھا۔''

''تم مقتول ڈاکٹر کے ساتھ رہ کر کافی ٹیکنیکل ہو گئے ہو۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا' پھر پوچھا۔ ''جب تمہارے ساتھ کوئی عارضہ نہیں تھا تو پھر تم مقتول کے کلینک پر کیوں جایا کرتے تھے؟''

''ٹیلی پیتھی سیکھنے......''

''اوہ' ٹیلی پیتھی......'' میں نے چونکنے کی اداکاری کی۔ ''کیا تمہیں معلوم بھی ہے کہ یہ ٹیلی پیتھی کیا بلا ہوتی ہے؟''

''جناب! یہ بلا نہیں بلکہ ایک سائنٹفک علم ہے۔'' وہ بڑے مدبرانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جسے خیال خوانی اور مینٹل کمیونی کیشن بھی کہا جاتا ہے۔''

''اچھا تو مقتول ڈاکٹر نے تمہیں ٹیلی پیتھی کے حوالے سے بہت کچھ پڑھا رکھا ہے؟'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ساری معلومات تو ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے ہی مجھے حاصل تھیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے اس موضوع پر بہت کچھ پڑھ رکھا ہے۔ ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا انسان کسی دوسرے انسان کی سوچ تک رسائی حاصل کر کے اسے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔''

''کیا مقتول ڈاکٹر کے پاس تمہاری بیان کردہ ٹیلی پیتھی کی یہ صلاحیت موجود تھی......؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور کیا اس نے تمہیں بھی اس حیرت انگیز صلاحیت سے روشناس کرایا تھا؟''

''میں سمجھتا ہوں' وہ ٹیلی پیتھی نہیں جانتا تھا۔'' وہ خاصے جرأت مندانہ انداز میں بولا۔ ''اور جب وہ خود کچھ نہیں جانتا تھا تو بے چارہ بھلا مجھے کہاں سے سکھاتا۔''

''اس کے باوجود بھی تم اس کے پاس ٹیلی پیتھی یا تھاٹ ریڈنگ سیکھنے لگ بھگ تین ماہ تک جاتے رہے......؟''

''مجھے یہ احساس بہت بعد میں ہوا تھا کہ ڈاکٹر سلیم اس معاملے میں عملی طور پر بالکل کورا ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''وہ مجھے الّو بنانے کے لئے موم بتی اور آئینے کی مختلف مشقیں بتاتا رہتا تھا۔ کبھی میں رات میں شمع بینی کر رہا ہوتا اور کبھی آئینے میں اپنے عکس کو گھورا کرتا۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ میں ڈاکٹر کے پاس حاضریاں لگا کر محض اپنا وقت برباد کر رہا ہوں تو میں نے اس سلسلے کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وقوعہ کے روز میں مقتول کو اپنے اسی فیصلے سے آگاہ کرنے گیا تھا کہ مصیبت میں پھنس گیا......''

''تم وقوعہ کے روز مقتول کے کلینک پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''کم وبیش سوا پانچ بجے۔'' ملزم نے جواب دیا۔

''کیا تم ہمیشہ اسی وقت وہاں جایا کرتے تھے؟''

''میں عموماً پانچ اور ساڑھے پانچ کے درمیان وہاں جایا کرتا تھا۔''

"وقوعہ کے روز تم وہاں کتنی دیر رکے تھے؟"

"زیادہ سے زیادہ دس منٹ۔"

"یعنی تم پانچ پچیس پر کلینک سے نکل گئے تھے؟"

"جی ہاں، آپ کا اندازہ درست ہے۔"

"گویا وقوعہ کے روز تم نے مقتول کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور وہاں سے واپس آ گئے۔" میں نے دانستہ چند زمینی حقائق کی نقاب کشائی کے لئے یہ سوال کیا تھا۔ "تم نے وہاں زیادہ دیر رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی؟"

"جناب! یہ بات تو درست ہے کہ میں وقوعہ کے روز بہ مشکل دس منٹ کلینک پر رکا تھا۔" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن اس روز مقتول سے میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔"

"کیوں..... کیا وہ اپنے کلینک پر موجود نہیں تھا؟"

"موجود تو تھا، لیکن خلاف معمول وہ دیر تک آرام کمرے میں سوتا رہا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے اس کے اٹھنے کا انتظار نہیں کیا اور واپس آ گیا۔"

"کیا تم نے کلینک کے تیسرے اور آخری پورشن یعنی بہ قول تمہارے آرام کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا کہ مقتول وہاں سو رہا ہے؟"

"جی نہیں، میں نے اندر تو نہیں جھانکا تھا۔"

"پھر تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ وقوعہ کے روز مقتول آرام کمرے میں خلاف معمول زیادہ دیر تک سو رہا تھا؟" میں نے کرید جاری رکھی۔

"یہ بات مجھے شاہ جی نے بتائی تھی۔"

"شاہ جی..... مطلب طارق شاہ؟"

"جی ہاں، میں طارق شاہ ہی کی بات کر رہا ہوں۔"

"معزز عدالت کو مختصر الفاظ میں بتاؤ کہ وقوعہ کے روز جب تم مقتول کے کلینک پر پہنچے وہاں دس منٹ کے وقفے میں حالات کس ترتیب سے پیش آئے تھے۔" میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ "مختصر الفاظ میں حالات بیان کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم کسی اہم واقعے ہی کو گول کر دو۔ معزز عدالت چھوٹی سے چھوٹی حقیقت کو بھی جاننا چاہتی

ہے..... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی، میں سمجھ رہا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلانے کے بعد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس روز میں پانچ پندرہ پر یعنی سوا پانچ بجے مقتول کے کلینک پر پہنچا تھا۔ میں پچھلے تین ماہ سے وہاں جا رہا تھا۔ ہفتے میں دو تین بار تو جانا ہوتا ہی تھا، لہٰذا میں ڈاکٹر سلیم کے معمولات سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ وہ روزانہ سہ پہر چار بجے سے پانچ بجے تک آرام کرتا تھا، پھر تروتازہ ہو کر دوبارہ کلینک کرنے لگتا تھا۔ اس حساب سے اسے کلینک میں بیٹھے ہونا چاہئے تھا، لیکن جب میں سوا پانچ بجے وہاں پہنچا تو ڈاکٹر کی سیٹ خالی تھی....."

"سیٹ خالی تھی....." میں نے لقمہ دینا ضروری سمجھا۔ "کیا مطلب.....؟"

"مطلب یہ کہ وہ اپنی کرسی پر موجود نہیں تھا۔"

"کرسی پر نہیں تھا تو پھر کہاں تھا؟" میں نے پوچھا۔

"جناب! میں وہی تو آپ کو بتانے جا رہا تھا۔" وہ ایک مضمحل سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "جب میں نے ڈاکٹر سلیم کو اس کی سیٹ پر نہ پایا تو طارق شاہ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ طارق شاہ نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب اندر ہی ہوں گے۔ میں نے کہا اندر تو میں دیکھ چکا ہوں۔ ان کی سیٹ خالی ہے، اس پر طارق شاہ بولا۔

"تو پھر وہ ابھی تک آرام ہی کر رہے ہوں گے۔"

میں نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا۔ "ابھی تک وہ کیسے سو سکتے ہیں؟ وہ تو ٹھیک پانچ بجے اٹھ جاتے ہیں اور اس وقت سوا پانچ بج رہے ہیں....."

میری وضاحت کے جواب میں طارق شاہ نے بڑی عجیب سی بات کی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا ڈاکٹر صاحب تمہیں اس کمرے میں کہیں نظر آ رہے ہیں؟"

"نہیں....." میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو وہ نہیں ہیں۔"

"اور وہ اپنے کلینک والے کمرے میں بھی نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔ "یہ بات ابھی تم نے ہی مجھے بتائی ہے، ہیں نا.....؟"

"ہاں....." میں نے اثبات میں جواب دیا۔

"اب باقی رہ جاتا ہے ایک ہی کمرہ....." وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جہاں ڈاکٹر

صاحب روزانہ آرام کیا کرتے ہیں۔ میں نے انہیں کلینک سے باہر جاتے ہوئے تو دیکھا نہیں۔ جب وہ دو کمروں میں نہیں ہیں تو یقیناً وہ آرام کمرے میں ہوں گے اور آرام کر رہے ہوں گے......'' وہ لمحے بھر کے لئے تھما' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اگر تمہیں زیادہ جلدی ہے تو انہیں سوتے سے اٹھادو' یا پھر تم بعد میں آ جانا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ تم یہاں بیٹھ کر ان کے جاگنے کا انتظار کرو......''

اس روز میرا عجیب سا موڈ ہو رہا تھا۔ میں تو صرف ڈاکٹر سے یہ کہنے گیا تھا کہ اب میں وہاں نہیں آیا کروں گا۔ جب وہ ابھی تک سویا پڑا تھا تو پھر میں وہاں بیٹھ کر کیا کرتا۔ میں نے یہ سوچ کر وہاں سے واپس ہی آ جانے کا فیصلہ کیا کہ بعد میں کسی وقت فون کر کے ڈاکٹر کو بتا دوں گا۔''

''تو تم وقوعہ کے روز سوا پانچ بجے مقتول کے کلینک پہنچے تھے۔'' میں نے ضروری حقائق کو تازہ کرتے ہوئے ملزم سے تصدیق چاہی۔ ''لگ بھگ دس منٹ تک تم کلینک میں رکے' طارق شاہ سے بات چیت کی اور پھر کم و بیش پانچ پچیس پر تم کلینک سے واپس آ گئے۔'' میں نے رک کر سانس لی' پھر اپنا استفسار مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ان دس منٹ کے دوران میں تم نے مقتول کی جھلک دیکھی اور نہ ہی اس کے آرام کمرے میں داخل ہو کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ وہاں موجود بھی ہے یا نہیں اور اگر موجود ہے تو وہ......سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے؟ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں......آپ بجا فرما رہے ہیں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''بالکل یہی ہوا تھا جو آپ نے بیان کیا ہے۔''

''وقوعہ کے روز تم پانچ پچیس پر مقتول کے کلینک سے باہر آ گئے تھے۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس کے بعد تم سیدھے گھر چلے گئے تھے یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟''

''میں سیدھا گھر نہیں گیا تھا جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے بتایا ہے نا' اس روز میری طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ میں اپنے علاقے گلشن اقبال میں پہنچا تو گھر سے قریبی پارک میں چلا گیا۔ وہاں اپنے ہی علاقے کے لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ میں بھی دل بہلانے کے لئے ان کے کھیل میں شامل ہو گیا۔ پھر جب اندھیرا پھیلنے لگا تو میں نے کھیل

چھوڑ دیا اور ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں پارک سے نکلا اور اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔''

''وقوعہ کے روز تم کتنے بجے گھر پہنچے تھے؟'' میں نے سوال کیا۔

''لگ بھگ پونے آٹھ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور پولیس نے تمہیں کتنے بجے گھر سے گرفتار کیا تھا؟''

''اس وقت آٹھ یا آٹھ پانچ ہوئے ہوں گے۔'' اس نے بتایا۔ ''بس' یوں سمجھیں کہ میں نے آ کر منہ ہاتھ دھویا' لباس تبدیل کیا اور پولیس آ دھمکی۔''

''جب پولیس کی زبانی یہ پتا چلا کہ وہ لوگ تمہیں ڈاکٹر سلیم کے قتل کے الزام میں گرفتار کر رہے ہیں تو کیسا لگا تھا؟''

''ایک دم شاک لگا تھا۔'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ یہی محسوس ہوا کہ وہ لوگ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔''

''لیکن یہ ان کا مذاق نہیں تھا۔'' میں نے افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے تمہیں نہ صرف یہ کہ ڈاکٹر کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا' بلکہ اس سلسلے میں سخت ترین سزا دلوانے کے لئے تمہیں حوالہ عدالت بھی کر دیا......؟''

''جی ہاں' یہ تلخ حقیقت تو آپ سب کے سامنے ہے۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''ایک آخری سوال......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس سوال کا جواب بہت سوچ سمجھ کر دینا ہوگا۔''

''جی' میں ذہنی طور پر تیار ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ پوچھیں' کیا پوچھنا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ وقوعہ کے روز تم نے سہ پہر چار بجے سے لے کر پانچ بجے تک کا وقت کہاں گزارا تھا......؟''

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول سلیم فاروقی کی موت چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ نیند کی حالت میں اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر آہنی بار کی طوفانی ضرب لگا کر اسے موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ اس حوالے سے میرا یہ سوال نہایت ہی اہمیت کا حامل تھا۔ آپ اسے حاصل جرح بھی کہہ سکتے ہیں۔

ملزم نے اس اہم سوال کے جواب میں بتایا۔ ''جناب! اس روز میں کوئی سوا تین بجے گھر سے نکلا تھا۔ باہر آیا تو شیخ احمد سے ملاقات ہوگئی اور ہم ''منظور'' پر چائے پینے بیٹھ گئے۔ ہمارے درمیان گپ شپ بھی ہوتی رہی اور ہم چائے وغیرہ بھی نوش کرتے رہے۔ الیاس کی زبانی مختار اور شیخ احمد کو بھی خبر ہوگئی تھی کہ میں آج کل ٹیلی پیتھی سیکھنے ڈاکٹر سلیم فاروقی کے کلینک پر جایا کرتا ہوں۔ شیخ احمد نے اسی حوالے سے پوچھ لیا۔

''اور سناؤ یار...... تمہارا وہ ٹیلی پیتھی والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟''

''بس' یوں سمجھو کہ بیچ میں لٹکا ہوا ہے۔'' میں نے بددلی سے بتایا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' شیخ احمد نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ یار...... کچھ ہو ہی نہیں رہا......''

''میں نے تو تمہیں شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ اس چیز کے پیچھے مت بھاگو' جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔'' شیخ احمد نے کہا۔ ''یہ سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں میری جان!''

''نہیں یار!'' میں نے بڑے وثوق سے کہا۔ ''ٹیلی پیتھی قصے کہانیوں کی بات نہیں۔ یہ ایک باقاعدہ اور مستند علم ہے' ایک سائنس ہے۔''

''اگر یہ ایک سائنس ہے تو پھر اس کے مروجہ اصول اور قاعدے بھی ہوں گے۔'' وہ قدرے سخت لہجے میں بولا۔ ''جو بھی شخص سائنس کے قانون' قاعدے اور اصولوں کو اپناتا ہے' وہ سائنس کی روح کو پالیتا ہے' پھر ٹیلی پیتھی کے سلسلے میں تم پچھلے تین ماہ سے جھک کیوں مار رہے ہو؟''

''میں سمجھتا ہوں' اس میں بے چاری ٹیلی پیتھی کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے استاد ہی میں سیکڑوں آنچوں کی کمی ہے۔''

''تو ایسے استاد کو تم چولہے میں کیوں نہیں ڈال دیتے جہاں وہ اپنی آنچوں کی کمی پوری کر کے کندن بن جائے۔'' شیخ احمد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''جان چھڑاؤ یار' تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو؟''

''آج میں جان چھڑانے ہی تو جا رہا ہوں۔'' میں نے ولولہ انگیز انداز میں کہا۔ ''میں ڈاکٹر سلیم کو صاف صاف بتا دوں گا کہ اب میں اس کے پاس نہیں آیا کروں گا۔''

''شاباش!'' شیخ احمد نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھا۔ ''یہ تم ایک نیک کام کرنے جا رہے

ہو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

میں تھوڑی دیر مزید شیخ احمد کے ساتھ بیٹھا اور پھر ایک بس پر سوار ہو کر ڈاکٹر سے ملنے اس کے کلینک کی جانب چل پڑا تھا۔''

''کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ وقوعہ کے روز سہ پہر میں تم ''منظور'' سے کتنے بجے اٹھے تھے؟'' میں نے اپنی جرح کو وائنڈ اپ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس وقت چار بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے۔''

''تو گویا اس روز سہ پہر تین' تیس سے لے کر چار پینتالیس تک ''منظور'' میں بیٹھے چائے پیتے اور گپ شپ کرتے رہے تھے؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں' یہی حقیقت ہے۔''

''اور شیخ احمد اس حقیقت کا چشم دید گواہ ہے؟''

''جی بالکل میں اسی کے ساتھ تو ''منظور'' میں بیٹھا ہوا تھا۔''

''کیا تمہارا دوست شیخ احمد اس امر کی گواہی دینے کے لئے عدالت میں حاضر ہو سکتا ہے کہ وقوعہ کے روز سہ پہر ساڑھے تین بجے سے لے کر پونے پانچ بجے تک تم اس کے ساتھ بیٹھے ''منظور'' میں گپ شپ کر رہے تھے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''اور تم نے اس کے سامنے ان خیالات کا بھی اظہار کیا تھا کہ آج تم آخری مرتبہ مقتول ڈاکٹر کے کلینک پر جا رہے ہو؟''

''جی ہاں' سو فیصد!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''شیخ احمد اس حقیقت کو بیان کرنے ضرور عدالت میں حاضر ہو سکتا ہے۔''

میں نے فاتحانہ نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا' پھر روئے سخن جج کی طرف پھیر کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں چند منٹ ہی باقی رہ گئے تھے۔ جج نے دیوار گیر کلاک کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا' پھر اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

آئندہ پیشی پندرہ روز بعد تھی۔

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا کہ استغاثہ کی جانب سے لگ بھگ نصف درجن گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی‘ لیکن میں یہاں پر صرف اہم گواہان کی گواہی اور ان پر ہونے والی جرح کا ہی ذکر کروں گا۔

***

میں نے پچھلی پیشی پر بڑے مفصل انداز میں اپنے موکل کی پوزیشن صاف کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق‘ مقتول کی موت کا جو وقت متعین کیا گیا تھا‘ اس دوران میں میرا موکل نارتھ ناظم آباد سے کافی فاصلے پر گلشن اقبال کے ایک معروف ہوٹل ”منظور“ میں اپنے ایک دوست شیخ احمد کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا‘ لہٰذا اس کا کسی بھی زاویے سے قتل کی اس واردات میں ملوث ہونے کا امکان نہیں تھا۔ میں اپنی پیشہ وارانہ کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔

لیکن یہ ایک طرف کا یعنی ڈیفنس کا سٹینڈ تھا اور عدالت کوئی فیصلہ صادر فرمانے سے پہلے استغاثہ اور صفائی دونوں کا موقف سنتی ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ دوسری جانب سے میری پچھلی محنت کا کیا جواب آتا ہے۔

اس پیشی پر میں نے کسی گواہ کے کٹہرے میں آنے سے پہلے ہی جج سے درخواست کر کے کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنے کی اجازت لے لی۔

تفتیشی افسر یا آئی۔ او کو ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اس کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک آپ تمام عدالتی امور و نکات سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں اور وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انسان بھی ہوں اور غلطی و انسان لازم و ملزوم ہیں‘ لہٰذا آپ بھی مجھے اور میری غلطیوں کو معاف کر دیا کریں۔

تفتیشی افسر عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ ”آئی او صاحب! آپ کو کب اور کس نے اس واقعے کی اطلاع دی تھی؟“

”پولیس کے روزنامچے کے مطابق اس افسوسناک واقعے کی اطلاع سترہ اپریل کی شام چھ بجے دی گئی تھی۔“

اس نے جواب دیا۔ ”اور یہ اطلاع مقتول کی بیوی فریدہ خانم نے فون کے ذریعے دی

تھی۔“

”فریدہ خانم!“ میں نے معنی خیز انداز میں دہرایا‘ پھر اپنی تحقیق کی روشنی میں آئی۔ او سے پوچھا۔ ”یعنی مقتول کی پہلی بیوی......؟“

”یہ تو آپ ہی کو پتا ہوگا کہ وہ مقتول کی پہلی بیوی ہے یا آخری بیوی!“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”میں نے ابھی تک اس سلسلے میں تفتیش نہیں کی۔ فریدہ خانم نے فون پر بتایا تھا کہ وہ مقتول سلیم فاروقی کی بیوی ہے‘ بس......“

”اگر آپ نے مقتول کی بیویوں کے حوالے سے ابھی انوسٹی گیشن نہیں کی تو یہ نیک کام کیس کے فیصلے سے پہلے مکمل کر لیجئے گا۔“ میں نے طنز کا جواب طنز ہی میں دیا۔ ”آپ کے لئے بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔“

اس نے مجھے گھور کر دیکھنے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ ”فریدہ خانم نے یہ فون اپنی رہائش گاہ سے کیا تھا یا......؟“

میں نے جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔

”نہیں‘ اس نے کلینک سے پولیس سٹیشن فون کیا تھا‘ یعنی جائے وقوعہ سے۔“

”آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”ساڑھے چھ بجے۔“

”کیا اس وقت بھی مقتول کی بیوی فریدہ خانم جائے حادثہ پر موجود تھی؟“

”جی ہاں‘ وہ وہیں موجود تھی۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”آپ نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر کیا دیکھا تھا؟“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

”جب ہم جائے وقوعہ پر پہنچے تو......“

”ہم کیا مطلب؟“ میں نے اسے شروع ہی میں ٹوک دیا۔

”میں اور دو کانسٹیبل۔“ آئی او نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے بے اعتنائی سے کہا۔ ”آگے کیا ہوا؟“

”جائے وقوعہ پر بہت سے لوگ جمع تھے۔“ وہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”لیکن مقتول کی بیوی فریدہ خانم اور اس کا اسسٹنٹ طارق شاہ سب سے نمایاں تھے اور انہی

دونوں افراد کی رہنمائی میں ہم کلینک کے سب سے آخری کمرے میں پہنچے تھے' جہاں مقتول ڈاکٹر سلیم فاروقی ایک بستر پر مردہ پڑا تھا۔''

''آپ نے پہلی نظر ہی میں اندازہ لگا لیا تھا کہ ڈاکٹر سلیم اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہو چکا ہے یا کوئی معائنہ وغیرہ بھی کیا تھا اس کا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''کسی معائنے یا جائزے کی ضرورت تو نہیں تھی۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''لیکن پھر بھی میں نے مقتول کی لاش کو الٹ پلٹ کر موقع کی کارروائی کا تقاضا نبھایا تھا۔''

''کسی معائنے یا جائزے کی ضرورت نہیں تھی۔'' میں نے تلخی بھرے انداز میں انکوائری آفیسر کے جملے کو دہرایا اور پھر پوچھا۔ ''ایسا کیوں آئی۔ او صاحب کیا مقتول کی لاش پکار پکار کر اپنی موت کا اعلان کر رہی تھی؟''

''ہاں ایسا ہی سمجھ لیں.....'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ضرور سمجھ لوں گا۔'' میں نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ ''لیکن اگر آپ اپنے مضمون کی تھوڑی وضاحت کر دیں تو بڑی نوازش ہوگی۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ کوئی لاش کس پیرائے میں اپنی موت کا اعلان کر سکتی ہے.....؟''

''بہ زبان خاموشی!'' وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''قبلہ!'' میں نے فرماں برداری کی اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تو وضاحت کرنے کے بجائے معاملے کو اور زیادہ الجھا دیا ہے۔''

''لگتا ہے' آپ کو بچوں کی طرح سمجھانا پڑے گا؟'' وہ جھنجلا گیا۔

میں نے اس کی جھنجلاہٹ میں پتنگے لگاتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں' بالکل۔ آپ مجھے اس وقت مونٹیسوری یا نرسری کا کوئی بچہ ہی تصور کریں اور ''اے با کا ڈا.....'' کے لیول پر اس گمبھیر معاملے کی وضاحت فرمائیں۔''

وہ میری اس چوٹ پر تلملا کر رہ گیا' پھر خاصے جارحانہ انداز میں بتانے لگا۔ ''مقتول اپنے بستر پر مردہ پڑا تھا اور وہ اس طرح کہ اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو کسی ناریل کے مانند چٹخا کر رکھ دیا گیا تھا۔ سر سے خارج ہونے والے خون نے بستر کے بیشتر حصے کو بھی آلودہ کر دیا تھا۔ اس حالت میں بے حس و حرکت پڑے ہوئے کسی شخص کو دیکھ کر کوئی بھی بڑے یقین سے یہ اندازہ قائم کر سکتا ہے کہ اس کی موت واقع ہو چکی ہے.....'' وہ ایک ہی سانس میں

وضاحت کی بیشتر منازل طے کرنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے متوقف ہوا' پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''لاش کے قریب ہی ہمیں آلہ قتل بھی پڑا ہوا مل گیا تھا' جو کہ ایک آہنی بار تھی اور جس کے ایک سرے پر مقتول کا تازہ بہ تازہ خون بھی چمک رہا تھا۔''

''آلہ قتل..... آہنی بار.....'' میں نے معنی خیز انداز میں دہرایا' پھر اس چوبی میز کی جانب بڑھ گیا' جہاں ایک سیلوفین بیگ میں آلہ قتل محفوظ حالت میں رکھا نظر آ رہا تھا۔

میں نے مذکورہ آہنی بار والے سیلوفین بیگ کو بڑی احتیاط سے اٹھا لیا' پھر چلتے ہوئے آئی۔ او کے قریب پہنچا اور مذکورہ سیلوفین بیگ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ اسی آہنی بار کی بات کر رہے ہیں نا؟''

''جی ہاں۔''

''آپ کے خیال میں یہی آلہ قتل ہے؟''

''جب اسی آہنی بار کی ضرب سے مقتول کی کھوپڑی کو چٹخا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے تو پھر قانون کی زبان میں اسی آہنی بار کو آلہ قتل ہی کہا جائے گا۔'' وہ خاصے کٹیلے انداز میں بولا۔ ''مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ آپ تو مجھ سے زیادہ قانون جانتے ہیں.....؟''

''اس میں کوئی شک ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

وہ خفیف سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی جرح میں تندی بھرتے ہوئے سوال کیا۔

''آئی۔ او صاحب آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ اس آہنی بار کی مدد سے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا؟''

''آلہ قتل کے لیبارٹری ٹیسٹ سے۔'' وہ متحمل لہجے میں بولا۔ ''اس بار کے ایک سرے پر پایا جانے والا خون' مقتول کے خون سے میچ کر گیا تھا۔ پھر بار کے خون آلود حصے پر چند انسانی بال بھی چپکے ہوئے ملے تھے۔ لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ میں اس امر کی وضاحت موجود ہے کہ وہ بال مقتول ہی کے سر کے تھے۔''

''وری گڈ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں تفتیشی افسر کو دیکھا اور پھر پوچھا۔ ''یہ اندازہ آپ نے کس بنا پر قائم کیا کہ میرے موکل ہی نے اس آہنی بار کی مدد سے مقتول کی

جان لی تھی؟''

''اس بنا پر کہ آہنی بار کے دوسرے یعنی صاف سرے پر ملزم کی انگلیوں کے بڑے واضح نشانات پائے گئے تھے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''کیا کسی شے پر کسی شخص کے فنگر پرنٹس کا پایا جانا اسے ملزم قرار دینے کے لئے کافی ہوتا ہے؟''

''نہیں جناب، ہمیں اس سلسلے میں اور بھی بہت سی چیزوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''مثلاً.....؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''مثلاً سب سے اہم پوائنٹ تو ایف پی (فنگر پرنٹس) کی میچنگ ہوتی ہے۔'' وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''اس میں آلہ قتل پر ملنے والے انگلیوں کے نشانات اور ملزم کے فنگر پرنٹس کو آپس میں ملا کر دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم کسی حتمی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔''

''تو میرے موکل کے سلسلے میں آپ حتمی نتائج تک پہنچ گئے تھے؟''

''جی ہاں، ہم نے پرفیکٹ ایف پی میچنگ کر لی تھی۔''

''یہ کام تو ملزم کی گرفتاری کے بعد ہی ہوا ہوگا؟''

''ظاہر ہے، اس سے پہلے کیسے ہو سکتا تھا۔''

''گویا جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے، آپ نے مقتول کی لاش کو دیکھا اور آلہ قتل آپ کے قبضے میں آ گیا، اس وقت آپ وثوق سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ڈاکٹر سلیم فاروقی کو میرے موکل ہی نے قتل کیا ہوگا؟''

''ظاہر ہے، یہ وثوق تو ایف پی میچنگ کے بعد ہی حاصل ہوا تھا۔''

''کیا آپ ملزم کو اس واقعے سے پہلے بھی جانتے تھے؟''

''ہرگز نہیں!'' اس نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی۔

''اس کے گھر کا پتا تو آپ کو معلوم ہوگا۔''

''جب میں ملزم ہی کو نہیں جانتا تھا تو پھر اس کے گھر کا پتا کیسے معلوم ہو سکتا تھا؟'' وہ چڑ کر بولا۔''آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں جناب.....؟''

''میں اس قسم کی باتیں کر رہا ہوں جناب.....'' میں نے اسی کے انداز میں کہا۔''کہ آپ تو پولیس والے ہیں۔ ملزم کے گھر کا پتا ٹھکانہ تو بہت معمولی بات ہے۔ آپ تو ان چیزوں کے بارے میں بھی مکمل معلومات رکھتے ہیں جو دنیا میں موجود ہی نہیں ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں وکیل صاحب!'' وہ خفگی آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ وکیلوں نے ہم پولیس والوں کو کچھ زیادہ ہی بدنام کر رکھا ہے۔''

''چلیں اس'' کچھ زیادہ کو ذرا کم کر لیتے ہیں۔'' میں نے اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔''لیکن آپ یہ تو مانیں گے نا کہ رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے۔ یہ تو آپ کو ماننا ہی پڑے گا کہ'' میں نے ڈرامائی انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر آئی۔ او کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا، پھر دوستانہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''چلیں چھوڑیں ان تلخ اور ترش باتوں کو۔ میں آپ کی بات ہی رکھ لیتا ہوں کہ آپ ملزم کے گھر ٹھکانے سے بالکل واقف نہیں تھے۔ اب ذرا میری معلومات میں اضافے کے لئے اتنا بتا دیں کہ ملزم کی گرفتاری کے لئے اس کے گھر کی جانب آپ کی رہنمائی کس نے کی تھی؟''

''فریدہ خانم نے..... طارق شاہ نے.....'' وہ الجھن زدہ انداز میں جملہ مکمل چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔''ایک جواب دیں آئی۔ او صاحب؟''

''فریدہ خانم نے.....''

''پھر آپ نے طارق شاہ کا نام کیوں لیا؟''

''وہ بھی جائے وقوعہ پر موجود تھا۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔''اس نے بھی مجھے ملزم کے بارے میں بتایا تھا، بلکہ.....'' وہ ذرا دیر کے لئے رکا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''بلکہ ملزم کے گھر کا ایڈریس مجھے مقتول کے اسسٹنٹ طارق شاہ ہی نے دیا تھا.....''

''تو گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دراصل آپ طارق شاہ کی نشاندہی پر ملزم کے گھر پہنچے تھے اور اسے گھر سے گرفتار کر لیا تھا؟''

''جی ہاں..... بالکل.....'' اس نے تصدیقی انداز میں گردن ہلائی۔

"ڈیٹس آل یور آنر......" میں نے تیز آواز میں کہا۔ "مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا......"

میں نے اس کیس کے تفتیشی افسر پر اپنی جرح موقوف کرنے کا اعلان کیا تو استغاثہ کی جانب سے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس پیشی پر دو ایسے گواہوں کو شہادت کے لئے وٹنس باکس میں لایا گیا' جس کے بیان اور بعد ازاں ان پر ہونے والی جرح میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی' جو اس کیس میں کسی حوالے سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہو۔ ان دو گواہوں میں ایک "فاروقی کلینک" میں چپڑاسی کی حیثیت سے کام کرنے والا آصف محمود تھا اور دوسرا ڈاکٹر سلیم فاروقی کا پڑوسی دکان دار امتیاز حسین۔ ان دونوں گواہوں کے بیانات سے صرف یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ وقوعہ کے روز سہ پہر میں ملزم حنیف "فاروقی کلینک" پر آیا تھا۔

اگلی گواہی مقتول کی بیوی فریدہ خانم کی تھی۔ میری نظر میں یہ ایک اہم گواہی تھی۔ فریدہ خانم وٹنس باکس میں آ کر کھڑی ہوئی اور اس نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ سوالات کے لئے فریدہ خانم کے قریب چلا گیا۔

فریدہ خانم ایک دراز قامت اور قبول صورت عورت تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ فریدہ خانم کا رنگ سانولا تھا' تاہم اس کی شخصیت میں جنس مخالف کے لئے ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی۔ وکیل استغاثہ نے چند ایک رسمی اور سرسری نوعیت کے سوالات کے بعد گواہ کو فارغ کر دیا۔

اس کے بعد میں اپنی باری پر جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ فریدہ خانم کی اس کیس میں دہری حیثیت تھی۔ وہ اس کیس کی مدعی بھی تھی اور اس کیس میں استغاثہ کی ایک گواہ بھی۔ ان لمحات میں وہ خاصی محتاط نظر آ رہی تھی۔

"فریدہ صاحبہ!......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

"مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ آپ کے شوہر کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کو واپس تو نہیں لا سکتا' لیکن ان کے قاتل کو بے نقاب کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔"

"بے نقاب ......" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ پھر ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے کوئی برقع وغیرہ تو نہیں پہنا ہوا جو آپ اسے بے نقاب کریں گے؟"

"میں نے "ڈاکٹر فاروقی" کے قاتل کو بے نقاب کرنے کی بات کی ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بے چارہ تو اس کیس کا ملزم ہے جسے میں بہت جلد باعزت بری کروا لوں گا۔"

"اگر یہ اس کیس کا ملزم ہے تو پولیس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی اسے گرفتار کیا ہوگا نا۔" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔

"میری معلومات کے مطابق اسی بدبخت نے میرے شوہر کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔"

ملزم کے لئے فریدہ خانم کے لب و لہجے سے زہر ٹپکتا تھا اور آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں سی صاف محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے بڑے تحمل سے استفسار کیا۔

"فریدہ صاحبہ! کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گی کہ آپ کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟"

"کیا مطلب......؟" وہ سوالیہ انداز میں مجھے تکنے لگی۔

"مطلب یہ کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو ملزم کے قاتل ہونے کے بارے میں کس نے بتایا تھا۔ پولیس نے یا......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولی۔ "طارق شاہ نے۔"

"طارق شاہ!" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں دہرایا۔ "آپ کا مطلب ہے' ڈاکٹر صاحب کے اسسٹنٹ طارق شاہ نے؟"

"جی ہاں' میرا یہی مطلب ہے۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"طارق شاہ نے آپ کو یہ اطلاع کس طرح دی تھی؟" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کے پاس آ کر یا آپ کو فون کر کے یا آپ اس وقت جائے وقوعہ پر موجود تھیں......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"جائے وقوعہ پر آپ کی موجودگی کی بات میں نے اس لئے کی ہے کہ اس کیس کے تفتیشی افسر کے مطابق آپ نے ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے پولیس اسٹیشن فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی تھی اور جب پولیس وقوعہ پر پہنچی تو آپ پہلے سے وہاں موجود تھیں......؟"

"تفتیشی افسر نے آپ کو غلط نہیں بتایا وکیل صاحب۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "میں نے واقعی ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے تھانے فون کیا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ پولیس کی آمد کے وقت میں کلینک میں موجود تھی' بلکہ موقع کی تمام تر کارروائی کے دوران میں' میں کلینک پر ہی تھی' لیکن جب طارق شاہ نے مجھے اس واقعے کی اطلاع دی اس وقت میں اپنے گھر پر تھی۔"

"اپنے گھر پر....." میں نے سرسری انداز میں کہا' پھر پوچھا۔ "آپ کی رہائش کہاں پر ہے؟"

"ناگن چورنگی کے قریب۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"آپ کو طارق شاہ نے کتنے بجے اس واقعے کی اطلاع دی تھی؟"

"اس وقت پانچ بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

"طارق شاہ نے آپ کو کیا بتایا تھا؟"

"اس نے کہا تھا' ڈاکٹر صاحب کو ان کے عقیدت مند نے قتل کر دیا ہے۔"

"کیا طارق شاہ نے مذکورہ عقیدت مند کا نام بھی لیا تھا؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "مجھے قاتل کا نام 'حنیف' بتایا گیا تھا۔"

"یعنی....." میں نے اکیوزڈ باکس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ حنیف جو اس وقت ملزموں والے کٹہرے میں سر جھکائے کھڑا ہے؟"

"جی ہاں..... بالکل یہی۔" اس نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

"کیا آپ ملزم کو پہلے سے جانتی تھیں؟" میں نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے' ڈاکٹر صاحب کا یہ عقیدت مند ان کے پاس کس غرض سے آیا کرتا تھا؟"

"جی نہیں۔" وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں اس بندے کے بارے میں پہلے سے کچھ نہیں جانتی تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ اسے پولیس کی تحویل میں دیکھا تھا' یا اس کے بعد عدالت کے کمرے میں دیکھ رہی ہوں۔ البتہ طارق شاہ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ ان کے پاس' میرا مطلب ہے ڈاکٹر صاحب کے پاس پُراسرار علوم سیکھنے آیا کرتا تھا۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے مقتول شوہر ڈاکٹر سلیم فاروقی مختلف نوعیت کے پُراسرار علوم کے ماہر تھے؟" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں' بالکل....." وہ بڑے وثوق سے بولی' تاہم اس کے لہجے کا کھوکھلا پن عیاں تھا۔ "اگر ان میں یہ خصوصیات نہ ہوتیں تو پھر ان کے کلینک پر عقیدت مندوں کا ہجوم لگا نظر نہ آتا۔"

"ہجوم..... والی بات کو فارمولا نہیں بنایا جا سکتا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "ڈگڈگی تماشا دکھانے والے حضرات چٹکی بجاتے میں اپنے گرد "ہجوم" لگا لیتے ہیں۔ یہ تو تماشا ختم ہونے کے بعد بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا سوچ کر انہوں نے اپنا قیمتی وقت برباد کر دیا....." لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی' پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گی کہ مقتول ڈاکٹر سلیم فاروقی نے ٹیلی پیتھی' ہپناٹزم' مسمریزم اور دیگر ماورائی علوم کس یونیورسٹی سے سیکھے تھے؟"

"جی....." وہ گڑبڑا گئی۔

"آپ مقتول کی شریک حیات ہیں؟" میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ "یہ بات آپ سے زیادہ اور کوئی نہیں جان سکتا کہ یہ تمام تر پُراسرار علوم ڈاکٹر صاحب نے کہاں سے سیکھے ہوں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا نا.....؟"

"وہ بات دراصل یہ ہے جی کہ....." وہ صورت حال کو سنبھالا دیتے ہوئے بولی۔ "یہ سارے علوم انہوں نے اپنی محنت اور ریاضت سے حاصل کئے تھے۔ میں اس بات کی گواہ ہوں کہ وہ اکثر راتوں کو جاگ کر وظیفے اور چلے کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے اللہ والے تھے۔ اللہ نے انہیں بہت سی روحانی طاقتوں سے نواز رکھا تھا۔"

"اوہ وا..... سبحان اللہ!" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "آج پہلی بار مجھ پر اور حاضرین عدالت پر یہ انکشاف ہو رہا ہے کہ ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم جیسے سائنسی علوم وظیفوں اور چلوں کے رہین منت ہیں۔"

"آبجیکشن یور آنر!" میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ نے مداخلت کی۔ "مقتول کے پاس کون کون سے پُراسرار علوم تھے اور اس نے یہ علوم کہاں سے حاصل کئے تھے' اس کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے فاضل دوست خوامخواہ فریدہ خانم سے الٹے سیدھے سوال کر کے انہیں ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"ان پُراسرار علوم کا زیرِ سماعت کیس سے بہت گہرا تعلق ہے جناب عالی!" ملزم کو ٹیلی پیتھی سیکھنے کا شوق تھا اور یہی شوق اسے مقتول کے کلینک تک لے آیا تھا' لیکن تین ماہ کی خواری کے بعد جب ملزم کو محسوس ہوا کہ مقتول اسے بے وقوف بنا رہا ہے تو اس نے مقتول کو خدا حافظ کہنے کا فیصلہ کیا تھا' چنانچہ وقوعہ کے روز جب وہ یہی بات کہنے مقتول کے کلینک پر پہنچا تو مقتول سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی' کیونکہ مقتول خلاف معمول اس روز دیر تک سوتا رہا تھا' چنانچہ مقتول کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد ملزم واپس لوٹ آیا اور...... پھر اسی رات کو آٹھ بجے کے قریب ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا......" میں نے تھوڑا وقفہ کر کے ایک آسودہ سانس لی' پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"جناب عالی! یہ تمام تر تفصیلات گزشتہ پیشیوں پر معزز عدالت کے سامنے دہرائی گئی ہیں اور عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔"

"فریدہ بی بی!" جج نے مقتول کی بیوہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تو آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ یہ تمام علوم آپ کے مقتول شوہر نے "اپنی مدد آپ" کے تحت سیکھ رکھے تھے؟"

"جی...... جی سر!" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "بالکل' میرا یہی مطلب تھا۔"

"بیگ صاحب......" جج میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "پلیز پروسیڈ۔"

"فریدہ خانم صاحبہ!" میں نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔ "آپ جائے وقوعہ یعنی اپنے شوہر کے کلینک پر کتنے بجے پہنچی تھیں؟"

"پونے چھ بجے۔" اس نے جلدی سے جواب دیا۔ "طارق شاہ نے پانچ پچیس پر مجھے اس واقعے کی اطلاع دی تھی اور یہ خبر سنتے ہی میں فوراً گھر سے نکل پڑی تھی۔ ناگن چورنگی سے شادمان زیادہ دور نہیں' اس لئے میں بیس منٹ میں بڑی آسانی سے کلینک پر پہنچ گئی تھی۔"

"فریدہ صاحبہ! ایک بات تو آپ بھی تسلیم کریں گی کہ کوئی بلاوجہ کسی کو قتل نہیں کر ڈالتا۔" میں نے مقتول کی بیوہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند فرمائیں گی کہ ملزم کی آپ کے شوہر کے ساتھ ایسی کون سی دشمنی تھی جس کی بنا پر اس نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ بڑی سادگی سے بولی۔

"طارق شاہ نے آپ کو اس بارے میں کچھ تو بتایا ہوگا؟"

"جی بالکل نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"آپ نے پہلی مرتبہ ملزم کو پولیس کی تحویل میں اس وقت دیکھا جب اسے آپ کے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے آپ نے کبھی اس کو دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ جانتی تھیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا فریدہ صاحبہ؟"

"جی نہیں' آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"لیکن ملزم نے آپ کو پہلے بھی ایک مرتبہ دیکھ رکھا ہے۔" میں نے حنیف سے حاصل ہونے والی کارآمد معلومات کی روشنی میں کہا۔ "جب دو ماہ پہلے آپ نے...... میرا مطلب ہے' وقوعہ سے دو ماہ پہلے آپ نے کلینک پر تابندہ نامی ایک حسین و جمیل عورت کے ساتھ جھگڑا کیا تھا۔ ان دنوں ملزم نے نیا نیا کلینک آنا شروع کیا تھا......؟"

"دیکھا ہوگا۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "یہ کون سی خاص بات ہے۔ میں تو اکثر و بیشتر کلینک کا چکر لگاتی ہی رہتی ہوں۔"

"خاص بات آپ کے کلینک پر چکر لگانے کی ہے اور نہ ہی ملزم کے آپ کو دیکھنے کی فریدہ صاحبہ!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اصل معاملہ تابندہ سے جھگڑا کرنے کا ہے...... آپ کا کسی خوب صورت اور دلکش عورت سے مقتول کے کلینک پر جھگڑا ہوا تھا یا نہیں؟"

"ہوا ہوگا......" ایک مرتبہ پھر اس نے بے پروائی کا انداز اختیار کرنا چاہا' تاہم اس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ دانستہ کسی بات کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہوا ہوگا نہیں فریدہ صاحبہ...... ہوا تھا۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

"مجھے تو کچھ یاد نہیں آ رہا......" وہ ٹالنے والے انداز میں بولی۔

"میں یاد دلاؤں گا تو سب یاد آ جائے گا۔" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ "میرے فاضل دوست غیر متعلقہ معاملات کو اچھال کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں

اس قسم کی تاخیری حربے استعمال کرنے سے روکا جائے۔"

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔" بیگ صاحب! آپ نے وقوعہ سے دو ماہ پہلے' فریدہ خانم کے کسی عورت سے جھگڑے کا جو ایشو اٹھایا ہے' کیا اس کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نکلتا ہے؟"

"یس سر.....!" میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

"آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔" جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"جی فریدہ صاحبہ!" میں نے دوبارہ مقتول کی بیوہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔
"آپ کو کچھ یاد آیا یا اس سلسلے میں' میں آپ کی مدد کروں؟"

جب میں نے تھانے جا کر اپنے موکل حنیف سے ملاقات کی تھی تو دیگر تفصیلات کے ساتھ ہی اس نے مجھے مقتول کی بیوہ اور تابندہ نامی ایک پری وش کے جھگڑے کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ بعدازاں میں نے اس حوالے سے کچھ تحقیقات خود بھی کی تھیں' جو اس وقت جرح کے دوران میں کام آ رہی تھیں۔ میرے سوال کے جواب میں وہ قدرے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں..... کچھ یاد تو آ رہا ہے....."

"جی..... کیا یاد آ رہا ہے؟" میں سوالیہ نظر سے اسے تکنے لگا۔

"میں نے کلینک پر پہنچتے ہی براہ راست ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں جانا چاہا تھا۔" وہ مکاری سے بولی۔" تابندہ اپنی باری کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ میں ڈاکٹر صاحب کی بیوی ہوں' اسی لئے وہ مجھ سے الجھ پڑی تھی کہ میں اپنی باری کا انتظار کئے بغیر ڈائریکٹ کیسے اندر جا رہی ہوں۔ اسی بات پر ہمارے درمیان تلخ کلامی ہوگئی تھی' لیکن جب اسے حقیقت کا پتا چلا تو معاملہ رفع دفع ہوگیا تھا۔"

"آپ کو جھوٹ بولتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آ رہی....." میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"مم..... میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے.....؟" وہ لڑکھڑائی ہوئی آواز میں بولی۔

"کون سا جھوٹ بولا ہے۔" میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔" کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ کو تابندہ اور مقتول کے باہمی' تیزی سے بڑھتے ہوئے تعلقات کا علم ہوگیا تھا۔ وہ جھگڑا

آپ نے اسی سلسلے میں کیا تھا۔ کلینک سے کسی نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ اس وقت تابندہ آپ کے شوہر سے ملنے آئی ہوئی ہے۔ آپ آن واحد میں وہاں پہنچیں اور خوب ہنگامہ آرائی کی..... کہ نہیں؟"

"ہاں..... یہ سچ ہے۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔" مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب تابندہ نامی اس چڑیل سے شادی کرنے والے ہیں۔ وہ ہنگامہ آرائی میں نے اسی سلسلے میں کی تھی۔ میں نے جو بھی کیا اس پر مجھے ایک ذرا سی بھی ندامت نہیں ہے۔ ایک بیوی اپنے سہاگ کو بچانے کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

"تو اس ہنگامہ آرائی سے آپ اپنے سہاگ کو بچانے میں کامیاب ہوگئی تھیں؟" میں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں' بالکل....." وہ جلدی سے بولی۔" اس دن کے بعد سے تابندہ کبھی ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر نظر نہیں آئی تھی۔"

"کلینک پر وہ اس لئے نظر نہیں آتی تھیں کہ پھر وہ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں نظر آنے لگی تھی' دوسری بیوی کی حیثیت سے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔" ڈاکٹر صاحب نے تابندہ کو گلشن اقبال کے ایک فلیٹ میں آباد کر دیا تھا۔"

"یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں وکیل صاحب.....؟" وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"ننھی بچی بننے کی کوشش نہ کریں فریدہ صاحبہ!" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔" اس معاملے کی کوئی بھی بات آپ سے ڈھکی چھپی نہیں۔ کلینک میں آپ کا کوئی ایسا جاسوس ضرور موجود تھا' جو آپ کو تابندہ اور ڈاکٹر صاحب کے تعلقات کی خبریں پہنچاتا تھا' جس دن آپ نے کلینک پر جا کر تابندہ سے پھڈا کیا' اس روز بھی آپ کے جاسوس ہی نے آپ کو تابندہ کے کلینک پر آنے کی اطلاع دی تھی۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے' اس روز آپ کس کی اطلاع پر تابندہ سے دو' دو ہاتھ کرنے کلینک پر پہنچی تھیں؟"

وہ ایک دم برسوں کی بیمار نظر آنے لگی' پھر کٹہرے کی ریلنگ کو تھام کر اس نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا۔" وہ اطلاع مجھے طارق شاہ نے دی تھی۔"

***

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں استغاثہ کا گواہ طارق شاہ کھڑا تھا۔

طارق شاہ کی حیثیت مقتول کے اسسٹنٹ ایسی تھی۔ وہ ''فاروقی کلینک'' کے تمام معاملات کا نگران بھی تھا۔ طارق شاہ مائل بہ فربہی ایک درمیانہ قد اور گورا چٹا شخص تھا۔ اس نے ہلکی سی ڈاڑھی اور مونچھیں بھی رکھ چھوڑی تھیں اور سر پر ٹوپی لگا رکھی تھی۔

طارق شاہ نے بڑے نستعلیق انداز میں سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جراح کے لئے اس کے کٹہرے کے پاس چلا گیا۔ وکیل استغاثہ نے مختلف زاویوں سے چند ایسے سوالات کئے جن کے جواب سے ملزم کا تاثر خراب ہوتا تھا' مثلاً یہ کہ ملزم ایک آوارہ' غیر سنجیدہ اور کھسکا ہوا نوجوان تھا۔ مقتول نے کئی بار اسے اپنے پاس سے بھگانے کی کوشش کی تھی' تاہم وہ خبطی پھر چلا آتا تھا' وغیرہ وغیرہ۔

وکیل استغاثہ نے اپنی جرح ختم کی تو میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''شاہ جی! کیا یہ سچ ہے کہ آپ مقتول کے قابل اعتماد ساتھی' اس کے دست راست اور اسسٹنٹ تھے؟''

''جی ہاں' یہ درست ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مجھے ڈاکٹر صاحب کی موت کا دلی صدمہ ہے۔''

''افسوس کہ میں آپ کے اس صدمے کو کم کرنے کے لئے کسی قسم کی مرہم کاری نہیں کر سکتا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا' پھر پوچھا۔ ''کیا یہ بات بھی درست ہے کہ آپ مقتول کے اسسٹنٹ ہونے کے علاوہ فریدہ خانم کے لئے بھی کام کرتے تھے..... ایک جاسوس کی حیثیت سے؟''

''یہ جھوٹ ہے.....'' وہ نیم احتجاجی انداز میں بولا۔ ''مجھ پر الزام ہے۔''

''ٹھیک ہے' میں آپ کی بات کا یقین کر لیتا ہوں۔'' میں نے غیر محسوس انداز میں طارق شاہ کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ جھوٹ ہے کہ آپ فریدہ خانم کے لئے جاسوسی کیا کرتے تھے تو پھر آپ معزز عدالت کو بتائیں کہ سچ کیا ہے.....؟'' میں نے چند لمحے رک کر اسے تیز نظر سے گھورا اور ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''شاہ جی! کوئی بھی جواب دینے سے پہلے ایک بات ذہن میں رکھئے گا کہ پچھلی پیشی پر

فریدہ خانم عدالت کو بتا چکی ہے کہ اس روز آپ ہی نے فون کر کے انہیں تابندہ کی کلینک پر آمد کے بارے میں بتایا تھا۔''

''اس فون کی حد تک تو یہ بات درست ہے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''بیگم صاحبہ کو تابندہ کے حوالے سے کس قسم کا شک تھا' یہ بات انہوں نے مجھے پہلے نہیں بتائی تھی۔ انہوں نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ جب تابندہ کلینک پر آئے تو مجھے بتانا اور میں نے فون کر کے انہیں تابندہ کے بارے میں بتا دیا تھا' پھر جب کلینک پر ان دونوں کے بیچ جھگڑا ہوا تو یہ بات سامنے آئی کہ بیگم صاحبہ کو شک تھا کہ ڈاکٹر صاحب تابندہ سے شادی کرنے والے ہیں۔ یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ میں بیگم صاحبہ کے لئے کسی جاسوس کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔''

''آپ کی یہ بات بھی میں نے مان لی۔'' میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ''اب یہ بتائیں کہ آپ کی ڈاکٹر صاحب اور تابندہ کے بارے میں کیا رائے تھی۔ کیا ان کے بیچ شادی کے حوالے سے کسی قسم کی کھچڑی پک رہی تھی؟''

''جی..... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اپنی موت سے چند ماہ پہلے ڈاکٹر سلیم فاروقی نے تابندہ سے شادی کر لی تھی اور اسے گلشن اقبال کے ایک فلیٹ میں رکھا تھا۔ کیا یہ بات بھی آپ کے علم میں نہیں؟''

''جی نہیں..... بالکل نہیں۔'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔

''کمال ہے..... آپ تو ان کے راز دار اسسٹنٹ تھے۔ آپ کے علم میں لائے بغیر مقتول یہ کام کیسے کر سکتا تھا۔'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''جب مجھے اس دلچسپ حقیقت کا علم ہے تو آپ کیسے بے خبر ہو سکتے ہیں۔''

''جو سچ تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''یقین کریں یا نہ کریں' یہ آپ کی مرضی ہے۔''

''او کے..... اگر آپ کے بیان کی تصدیق کے لئے مجھے تابندہ کو عدالت میں لانا پڑا تو میں یہ کام ضرور کروں گا.....'' میں نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔ ''فی الحال' ہم دوسری طرف چلتے ہیں۔''

تابندہ کو عدالت میں حاضر کرنے والی بات پر طارق شاہ خاصا نروس دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ اس نے مقتول اور تابندہ کی شادی کے حوالے سے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ وہ اس شادی کے حوالے سے اول آخر سب کچھ جانتا تھا۔

''شاہ جی! کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول ڈاکٹر سلیم فاروقی کی موت کا وقت کیا ہے؟''

''سترہ اپریل کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''اور یہ وہی وقت ہے جب مقتول ایک گھنٹے کے لئے اپنے کلینک کے تیسرے پورشن یعنی آخری عقبی حصے میں آرام کیا کرتا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مقتول کی لاش بھی کلینک کے اسی حصے میں بیڈ پر پڑی ملی تھی۔ قاتل نے آہنی وزنی راڈ کا وار کر کے مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو بری طرح چٹخا دیا تھا؟''

''جی ہاں۔'' میں اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اوندھے سونے کے عادی تھے' اس لئے قاتل کا وار ان کے سر کے عقبی حصے پر پڑا اور کھوپڑی چٹخ گئی۔ آپ نے جس آہنی راڈ کا ذکر کیا ہے اس کے ایک سرے پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات بھی پائے گئے ہیں' جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسی بدبخت نے ڈاکٹر صاحب کو قتل کیا ہے۔''

''گویا آپ کو یقین ہے کہ ملزم ہی نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کو قتل کیا ہے؟''

''جی...... بالکل......'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔

''اس یقین کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔

''دیکھیں جی...... سیدھی اور سچی بات ہے۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا اور اس رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر صاحب کی موت سترہ اپریل کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے اور اس دوران میں صرف ایک ہی شخص ان کے آرام کمرے میں گیا تھا اور وہ شخص ہے...... ملزم حنیف!''

''وقوعہ کے روز حنیف کتنے بجے کلینک پہنچا تھا؟'' میں نے طارق شاہ کی عالمانہ تقریر کو

طع انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ساڑھے چار بجے۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''کیا اس وقت آپ کلینک پر موجود تھے؟''

''جی ہاں میں اس وقت اپنے کمرے میں تھا۔''

''یعنی کلینک کے پہلے حصے' ریسیپشن والے کمرے میں؟'' میں نے تصدیقی نظر سے اس ل طرف دیکھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اور آخری حصے میں ڈاکٹر صاحب اپنے ں آنے والے لوگوں سے ملاقات کے لئے استعمال کرتے تھے۔ جس آہنی راڈ سے انہیں ل کیا گیا ہے وہ ان کے کمرے میں میز پر رکھی رہتی تھی۔ دراصل' ڈاکٹر صاحب اس راڈ کو اپنے کلائنٹ کے سر پر رکھ کر کچھ عمل وغیرہ پڑھا کرتے تھے' جس سے یہ پتا چل جاتا تھا کہ کسی نے اس شخص پر کچھ کیا ہوا تو نہیں......''

''یہ...... کچھ کیا ہوا سے آپ کی کیا مراد ہے شاہ جی؟''

''مطلب یہ کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''اگر اس شخص پر کسی ہوائی مخلوق کے اثرات ہوتے یا کسی نے سفلی یا بندش وغیرہ کرائی ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کو فوراً پتا چل جاتا تھا۔ اس طرح مریض کے علاج میں بہت آسانی ہو جاتی تھی۔''

''اچھا اچھا' میں سمجھ گیا۔'' میں نے اس طرح گردن ہلائی جیسے اس کی بیان کردہ خرافات سے اتفاق کر رہا ہوں۔ لہٰذا اپنے مقصد پر ثابت قدم رہتے ہوئے میں نے استغاثہ کے گواہ طارق شاہ سے استفسار کیا۔ ''ملزم ساڑھے چار بجے کلینک پر پہنچا۔ اس نے کلینک کے ابتدائی مے میں آپ سے ملاقات کی...... اس نے آپ سے کیا کہا تھا؟''

''جناب! اس وقت ملزم خاصا گھبرایا ہوا تھا۔'' وہ مجھے تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ ''اس نے مجھ سے کہا کہ یہ فوری طور پر ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب تو سو رہے ہیں اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ چار سے پانچ بجے کے درمیان آرام کرتے ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا' کچھ بھی ہے۔ مجھے اسی وقت ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے' لہٰذا میں انہیں جگا دوں۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں تو نہیں جگا سکتا۔ اگر اتنا

ہی ضروری کام ہے تو خود جا کر انہیں جگا لو۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''یہ برا سا منہ بناتے ہوئے اس حصے کی جانب بڑھ گیا جہاں ڈاکٹر صاحب آرام کر رہے تھے۔'' طارق شاہ نے بتایا۔ ''تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ واپس آیا اور بتایا کہ ڈاکٹر صاحب سے بات ہوگئی ہے...... پھر یہ کلینک سے واپس چلا گیا تھا۔''

''ذرا سوچ کر بتائیں شاہ جی!'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کے خیال میں ملزم زیادہ سے زیادہ کتنی دیر کلینک پر رکا ہوگا؟''

''بہ مشکل پانچ منٹ۔'' اس نے جواب دیا۔ ''زیادہ سے زیادہ چھ‘ سات منٹ۔''

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! وقوعہ کے روز ملزم نے سہ پہر ساڑھے تین بجے سے لے کر پونے پانچ بجے تک کا وقت اپنے ایک دوست احمد شیخ کے ساتھ جائے وقوعہ سے پانچ کلومیٹر دور گلشن اقبال کے ایک ریسٹورنٹ میں گزارا تھا‘ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ وہ ساڑھے چار بجے سے لے کر چار پینتیس یا چار چالیس پر ''فاروقی کلینک'' میں موجود رہا ہو۔ احمد شیخ عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہے۔ میں گواہی کے لئے اسے اندر بلانا چاہتا ہوں۔''

''اجازت ہے......'' جج نے اپنے مخصوص بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔

آئندہ دس منٹ کے اندر احمد شیخ نے صفائی کے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہو کر حقیقت حال بیان کر دی۔ ملزم نے وقوعہ کے روز جو سوا گھنٹے کا وقت اپنے دوست احمد شیخ کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے گزارا تھا۔ شیخ احمد نے اس کی تفصیل بڑے جامع انداز میں پیش کر دی۔ شیخ احمد کی گواہی مکمل ہونے کے بعد میں دوبارہ طارق شاہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''جی شاہ صاحب...... اب آپ کیا کہیں گے؟''

''جو سچ تھا‘ وہ میں نے بتا دیا۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔''

میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''تو آپ کے خیال میں صفائی کے گواہ شیخ احمد نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔''

''جی ہاں...... سو فیصد۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔

''آپ کو کب پتا چلا کہ ڈاکٹر سلیم کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے؟'' میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب پانچ بجنے سے دس منٹ پہلے خود ہی اٹھ جایا کرتے تھے اور ٹھیک پانچ بجے وہ فریش ہو کر اپنی سیٹ پر براجمان ہو جاتے تھے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب تک وہ فریش ہوتے‘ میں ان کے کمرے کی کرسیوں اور ٹیبل وغیرہ کو سیٹ کر دیا کرتا تھا‘ لیکن وقوعہ کے روز جب وہ مقررہ وقت پر بیدار نہیں ہوئے تو مجھے تشویش ہوئی‘ ملزم تھوڑی دیر پہلے بتا کر گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے اس کی بات ہوگئی ہے۔ اس وقت تو ڈاکٹر صاحب کو بیدار ہی ہونا چاہئے تھا‘ پھر وہ سامنے کیوں نہیں آئے؟ اسی سوال کے جواب کے لئے میں جا کر کلینک کے اس حصے میں جھانکا جہاں وہ آرام کیا کرتے تھے اور اسی وقت مجھ پر حقیقت آشکار ہوئی کہ انہیں بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا......''

''آپ نے کتنے بجے ان کے آرام کمرے میں جھانکا تھا؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''اس وقت پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔''

''ڈاکٹر سلیم فاروقی کے قتل کا انکشاف ہونے کے بعد آپ نے سب سے پہلا کام کون سا کیا تھا؟'' میں نے لہجے میں درشتی کو شامل رکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے فوراً بیگم صاحبہ کو فون کیا تھا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''پہلی بیگم صاحبہ یا دوسری بیگم صاحبہ......؟''

''پہلی بیگم صاحبہ...... فریدہ خانم کو...... آں......'' وہ اچانک جملہ ادھورا چھوڑ کر ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا‘ جیسے اس سے کوئی سنگین جرم سرزد ہو گیا ہو۔

''بہت خوب شاہ جی!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تو آپ بڑے دعوے کے ساتھ یہ کہہ چکے ہیں کہ آپ کو مقتول اور تابندہ کی شادی کا کچھ علم نہیں اور اب ''پہلی بیگم'' اور ''دوسری بیگم'' کا حساب بہ خوبی بیان کر رہے ہیں۔ یہ کیا انداز ہے شاہ جی؟''

''وہ...... وہ...... میں کنفیوژ ہو گیا...... تھا......'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں لنگڑی وضاحت

کرتے ہوئے بولا۔

''مم...... میرا...... مطلب یہ تھا کہ...... میں نے ڈاکٹر صاحب کی بیگم...... فریدہ خانم کو...... فون کیا تھا......''

''شاہ جی! آپ کنفیوژ ہو نہیں گئے تھے' بلکہ ابھی تک کنفیوژ ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''خیر' میں بھی آپ کو اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہوں...... تو آپ نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کو مردہ حالت میں پڑے دیکھ کر فوراً ان کی بیگم فریدہ خانم کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی؟''

''جی...... میں نے ایسا ہی کیا تھا۔'' وہ قدرے سنبھلتے ہوئے بولا۔

''آپ نے پانچ منٹ کم پانچ پر ڈاکٹر سلیم فاروقی کو مردہ حالت میں پڑے دیکھا۔'' میں اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ ''اور فوراً آپ نے فریدہ خانم کو فون کر دیا' یعنی جب آپ نے یہ فون کیا تو اس وقت پانچ بجنے میں چار منٹ ہوں گے یا تین یا دو یا زیادہ سے زیادہ پانچ بج چکے ہوں گے...... ہیں نا؟''

''جی ہاں...... اس سے زیادہ نہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''لیکن فریدہ خانم نے اپنے بیان میں معزز عدالت کو یہ بتایا ہے کہ آپ نے ٹھیک پانچ بج کر پچیس منٹ پر انہیں فون کیا تھا اور وہ ٹھیک پونے چھ بجے کلینک پر موجود تھیں۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟''

''مم...... میں...... کیا...... کہہ سکتا ہوں۔'' وہ کٹہرے کی ریلنگ کو تھامتے ہوئے بولا۔

اس کے چہرے پر بے پناہ خوف ابھر آیا تھا۔

''آپ کیوں نہیں کچھ کہہ سکتے......'' میں نے نفرت بھری نظر سے اسے گھورا۔ ''بڑے آرام سے کہہ دیں کہ وقت کے معاملے میں فریدہ خانم جھوٹ بول رہی ہیں' جیسا کہ...... ملزم نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ...... ساڑھے تین بجے سے لے کر پونے پانچ بجے تک گلشن اقبال کے ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا؟''

''پپ...... پانی۔'' وہ کٹہرے کی ریلنگ کو تھامے تھامے اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے منمنایا۔

''پانی ملے گا...... ضرور ملے گا مگر...... سچ بولنے کے بعد۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور

دیتے ہوئے بے رحم لہجے میں کہا۔ ''بتاؤ...... تم نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کو کیوں قتل کیا؟''

اس سے پہلے کہ وہ میرے سنسنی خیز سوال کے جواب میں کچھ کہتا' اس کی ٹانگیں کپکپائیں اور وہ دھڑام سے کٹہرے کے فرش پر گرا اور...... بے ہوش ہو گیا۔

***

پچھلی پیشی پر میرے تیکھے سوالات اور طارق شاہ کے ڈرامائی طرز عمل نے اس کیس کا نقشہ پوری طرح کھول کر رکھ دیا تھا۔ جج نے طارق شاہ کو شامل تفتیش کرنے کے احکام صادر کر دیئے تھے۔ جب شاہ جی کی گردن چھری کے نیچے آئی تو اس نے اپنی زبان سے حقیقت حال بیان کر دی۔ ڈاکٹر سلیم فاروقی کے قتل کا اقرار کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ یہ کام اس نے فریدہ خانم کی شہ پر کیا تھا۔ آلہ قتل یعنی وہ آہنی راڈ جو مقتول کی میز پر رکھی رہتی تھی' چند روز پہلے طارق شاہ نے اس پر ملزم کی انگلیوں کے نشان حاصل کر کے اسے غائب کر دیا تھا اور ڈاکٹر کے استعمال کے لئے اس کی جگہ اس کی ''جڑواں راڈ'' میز پر رکھ دی تھی۔ ڈاکٹر فاروقی نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ دونوں ایک جیسی راڈز اس لئے بنوائی تھیں کہ ان میں اگر ایک اِدھر اُدھر ہو جائے تو اس کی پڑھائی والا ''مخصوص کام'' نہ رکے۔ فاضل راڈ طارق شاہ کی تحویل میں رہتی تھی' لہٰذا اسے اس ''ادلی بدلی'' میں کسی قسم کی مشکل پیش نہیں آئی اور اس نے دستانے پہن کر اس آہنی راڈ سے اوندھے سوئے ہوئے ڈاکٹر کو موت کے گھاٹ اتار دیا' جس کے ایک سرے پر ملزم کے فنگر پرنٹس موجود تھے۔ اس طرح طارق شاہ کی نشاندہی پر پولیس نے ملزم کو گرفتار کر کے ڈاکٹر سلیم فاروقی کے قتل کے الزام میں حوالہ عدالت کر دیا تھا۔

جب طارق شاہ کے اقبال جرم پر فریدہ خانم کو شامل تفتیش کیا گیا تو پہلے تو وہ اس بات سے انکار کرتی رہی کہ وہ بھی شریک سازش ہے' لیکن جب پولیس نے اپنے مخصوص تفتیشی ''ہتھکنڈے'' استعمال کئے تو وہ زیادہ مزاحمت نہ کر سکی اور اسے بھی اقبال جرم کرتے ہی بنی۔

واقعات کے مطابق فریدہ خانم کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ تابندہ سے شادی کے بعد ڈاکٹر سلیم فاروقی اسے طلاق دے کر فارغ کرنے والا ہے' لہٰذا اس نے طارق شاہ کے ساتھ مل کر ڈاکٹر فاروقی کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ فریدہ نے اسے یہ پیشکش کی تھی کہ اگر وہ ڈاکٹر کو موت کی نیند سلا دے تو وہ نہ صرف یہ کہ ''فاروقی کلینک'' اس کے حوالے کر دے گی' بلکہ اس سے شادی بھی کر لے گی۔ طارق شاہ کو جب پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں نظر آیا

تو وہ بلا چون و چرا فریدہ خانم کی پیشکش کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

صدیوں سے یہ سنتے چلے آ رہے ہیں کہ ''برے کام کا برا نتیجہ'' سو اس کیس میں بھی کچھ ایسا ہی نتیجہ برآمد ہوا تھا۔ ڈاکٹر سلیم فاروقی' طارق شاہ اور فریدہ خانم نے اپنی اپنی سطح پر جو کچھ بھی کیا اسے برے کام ہی میں شمار کیا جائے گا۔ لہٰذا ان میں سے ایک تو جان سے گیا اور باقی دونوں عدالت سے لمبی سزا پانے کے بعد جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے۔

فریدہ خانم اور طارق شاہ جیسے ''سازشی کردار'' ہمارے معاشرے میں ہر جگہ موجود ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان پر گہری نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے' بلکہ اگر موقع ملے تو ان کا سر کچلنے کی کوشش بھی کرتے رہنا چاہیے...... اور ڈاکٹر فاروقی جیسے معاشرتی ناسوروں کو بھی کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے......

***

مجرمانہ ذہن

ٹیلی فون کی گھنٹی نے میرے انہماک کا خانہ خراب کر دیا تھا۔ میں اس وقت دفتر میں بیٹھا ایک نہایت اہم کیس کی فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس روز عدالت میں میرا کوئی کیس نہیں تھا' لہٰذا صبح ہی سے میں اپنے آفس میں جم کر بیٹھ گیا تھا

دوسری گھنٹی پر میں نے گھور کو ٹیلی فون سیٹ کو دیکھا' پھر ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ''ہیلو......!''

''ہیلو بیگ صاحب!'' ایک جانی پہچانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''میں جمیل صدیقی بات کر رہا ہوں۔''

''جی صدیقی صاحب السلام علیکم!'' میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو آپ کی ''ہیلو'' سنتے ہی پہچان لیا تھا' حکم کریں......؟''

جمیل صدیقی سے میرے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے تو ایک رائٹر تھے' لیکن اس کے علاوہ بھی انہوں نے بہتر جگہ اپنی ٹانگیں اور بازو پھنسا رکھے تھے۔ اس کی من جملہ سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا مرکز و محور معاشرت ہی تھا۔ وہ مختلف نوعیت کے فلاحی اور سماجی کاموں میں گردن گردن تک ڈوبے نظر آتے تھے' جبھی ان کا سوشل سرکل بھی خاصا وسیع تھا۔

''حکم نہیں' عرض ہے بیگ صاحب!'' وہ میری بات کے جواب میں ''وعلیکم السلام'' کہنے کے بعد بولے۔ ''آپ سے ایک کام پڑ گیا ہے' آج کل مصروفیت کیسی چل رہی ہے؟''

''مصروفیت تو جناب ایک متحرک بلا کا نام ہے جو ہر وقت چلتی رہتی ہے۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''آپ فرمائیں' آج کیسے یاد کیا؟''

''ایک کیس آپ کے سپرد کرنا ہے......'' جمیل صدیقی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں

جواب دیا۔

''کیس کی نوعیت کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

انہوں نے بتایا۔ ''فوج داری کا کیس ہے۔''

''آپ کا اپنا یا......؟''

''اپنا نہیں بیگ صاحب!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''ایک جاننے والے کے توسط سے یہ معاملہ مجھ تک پہنچا ہے' لیکن آپ فکر نہ کریں...... آپ کی فیس کہیں نہیں جائے گی۔ یہ چیریٹی کیس ہرگز نہیں ہے۔''

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ صدیقی صاحب سے میرے بڑے دیرینہ تعلقات تھے' لہٰذا وہ میری عادات سے بھی بہ خوبی واقف تھے۔ فیس کے معاملے میں' میں خاصا اصول پرست اور سخت گیر واقع ہوں۔ بغیر فیس کے میں کوئی کیس اپنے ہاتھ میں نہیں لیتا تھا اور یہ فیس بھی مجھے ایڈوانس میں چاہئے ہوتی تھی۔ یہی اصول میں نے دوسرے ماہرین شعبہ جات کے لئے بھی اپنا رکھا تھا۔ اگر مجھے کسی کنسلٹنٹ یا کسی کونسلر کی ضرورت پیش آ جاتی تو میں متعلقہ ماہر فن اور تجربہ کار شخص کو اس کی پوری فیس ادا کرنے کے بعد ہی خدمات سے استفادہ کرتا تھا۔ البتہ قریبی دوستوں اور رشتے داروں سے میں تھوڑی رعایت کرنا بھی نہیں بھولتا تھا۔ دوسرے ماہرین فن کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہوں گا' لیکن اپنے پیشے کے حوالے سے میری ایک فلاسفی تھی۔ میں اکثر لوگوں سے کہا کرتا تھا۔

ایک وکیل اور پہلوان میں کوئی فرق نہیں ہوتا' دونوں اپنے اپنے اکھاڑوں میں کشتی لڑتے ہیں اور دونوں کے پاس اپنے اپنے میدان کی مناسبت سے مخصوص داؤ پیچ ہوتے ہیں' جن کے استعمال سے وہ مدمقابل کو پچھاڑنے کا کام کرتے ہیں۔ ان دونوں سے اگر اچھی اور تسلی بخش کارکردگی مطلوب ہو تو پھر ان کی ضروریات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایک فاتح پہلوان خوش خوراک بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک تجربہ کار کانٹے کا وکیل بھاری بھرکم فیس بھی وصول کرتا ہے۔ سیدھا سادا حساب آپ یوں سمجھ لیں کہ...... جتنا گڑ' اتنا ہی میٹھا......

''تو پھر میں کتنے بجے آپ کے آفس آ جاؤں؟'' صدیقی صاحب کے استفسار نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے' آپ شام میں چھ بجے تک تشریف لے آئیں۔''

''بہتر ہے۔'' صدیقی صاحب نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''تو پھر چھ بجے آپ سے ملاقات ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''اللہ حافظ بیگ صاحب!''

میں نے بھی ''اللہ حافظ'' کہہ کر ریسیور کریڈل کر دیا۔

ٹھیک چھ بجے شام جمیل صدیقی میرے آفس میں موجود تھا۔ اس کی آمد کی اطلاع مجھے میری سیکرٹری نے انٹرکام پر دی تھی۔ میں نے بزر بجنے پر ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو میری سیکرٹری عالیہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''سر! جمیل صدیقی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ خود کو آپ کا دوست بتا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صبح فون پر انہوں نے اپائنٹمنٹ لے لیا تھا۔''

''ٹھیک ہے' انہیں اندر بھیج دیں۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمیل صاحب میرے چیمبر میں موجود تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے ان سے پوچھا۔ ''صدیقی صاحب! ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟''

''باہر گرم چل رہا ہے تو اندر بھی گرم ہی چلنا چاہئے۔'' انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔ ''آپ تو جانتے ہیں' لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔''

وہ ستمبر کے ابتدائی ایام تھے۔ کراچی میں' ماہ ستمبر میں بڑی غضب کی گرمی پڑتی ہے۔ میں نے صدیقی صاحب کی فرمائش کے عین مطابق اپنی سیکرٹری سے عمدہ قسم کی چائے بھجوانے کے لئے کہہ دیا' پھر ہم گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ میں جلد ہی اصل موضوع پر آ گیا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''جی صدیقی صاحب! اب فرمائیں' کیا معاملہ ہے......؟''

''لاہور میں میرے ایک دوست ہوتے ہیں...... ملک بشیر۔'' صدیقی وضاحت کرتے وئے بولا۔ ''ان کا بیٹا کراچی کے ایک بنگلے میں ڈکیتی اور قتل کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔ میں ی کے سلسلے میں آپ کی خدمت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کے دوست ملک بشیر لاہور میں کیا رتے ہیں؟''

"جی..... ان کا وہاں سینٹری فٹنگ کا وسیع کاروبار ہے۔" صدیقی صاحب نے بتایا۔

"اور ان کا بیٹا گرفتار ہوا ہے اس کا کیا نام ہے؟"

"جاوید....."

"یہ جاوید..... یہاں کراچی میں کیا کر رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنے والد کے کاروبار کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا تھا۔"

"قتل اور ڈکیتی والا یہ واقعہ کہاں پیش آیا ہے؟" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے' جاوید کو کراچی کے کس علاقے سے پکڑا گیا ہے؟"

"جائے وقوعہ حیدری کے علاقے میں واقع ایک بنگلا ہے۔" صدیقی نے بتایا۔

"ہوں....." میں نے پرسوچ انداز میں جمیل صدیقی کی جانب دیکھا۔ "جاوید کو حیدری کے ایک بنگلے میں ڈکیتی اور قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟"

میرے تصدیق طلب سوال کے جواب میں صدیقی صاحب نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مختصراً کہا۔ "جی ہاں' یہی حقیقت ہے۔"

"جاوید پر کس کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"مقتول کا نام فضل کریم ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"فضل کریم!" میں نے زیرلب دہرایا' پھر پوچھا۔ "یہ فضل کریم یعنی مقتول کرتا کیا تھا؟"

"اس کا ہول سیل کا بزنس تھا کپڑے کا۔" جمیل صدیقی نے بتایا۔ "ادھر بولٹن مارکیٹ میں اس کی بہت بڑی دکان اور گودام وغیرہ ہیں۔"

"ایک بات بتائیں صدیقی صاحب!" میں نے جمیل صدیقی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مانا کہ ملزم کا باپ ملک بشیر آپ کا بہت اچھا دوست ہے' لیکن جاوید کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"جی....." اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا بیگ صاحب!"

"میرا مطلب یہ تھا....." میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "جاوید پر عائد کردہ اس دہرے الزام کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے۔ کیا اس الزام میں کوئی صداقت ہو سکتی ہے یا آپ کی نظر میں وہ بے گناہ ہے؟"

"دیکھیں بیگ صاحب! میں اپنے دوست ملک بشیر کو عرصہ دراز سے جانتا ہوں۔" جمیل صدیقی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "وہ ماشاءاللہ کروڑ پتی شخص ہے۔ پورے ملک میں اس کا سینٹری فٹنگز مصنوعات کا کام پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کراچی تک میں ان کی سپلائی آتی ہے۔ ملک بشیر نے جاوید کو کاروباری سلسلے میں ہی کراچی بھیجا تھا۔ ماشاءاللہ کا دیا سب کچھ ان کے پاس ہے اور جاوید ان کی اکلوتی اولاد بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں' جاوید کو اس قسم کی حرکت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

"آپ اسے کوئی فارمولا نہیں بنا سکتے صدیقی صاحب!" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"آج کل تو کھاتے پیتے آسودہ حال گھرانے کے من چلے نوجوان بطور فیشن بھی اس قسم کے جرائم کر رہے ہیں۔"

"میں آپ کی بات کی تردید نہیں کروں گا بیگ صاحب۔" وہ گمبھیر انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے....." وہ لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"میرے پاس علی الصباح ملک بشیر کا فون آیا تھا۔ اسے بھی گزشتہ رات ہی اس واقعے کے بارے میں پتا چلا ہے۔ اس نے مجھ سے تعاون کی درخواست کی تو ایک دیرینہ دوست ہونے کے ناتے میں نے آپ کو فون کھڑکا دیا اور اب آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ ملک بشیر نے مجھے بتایا ہے کہ وہ آج رات کسی وقت کراچی پہنچ جائے گا۔ باقی کی تفصیلات اور معاملات آپ اسی کے ساتھ طے کر لیجئے گا۔"

"صدیقی صاحب! آپ مجھے سال ہا سال سے جانتے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں سیدھی اور کھری بات کرنے کا عادی ہوں۔"

"ہاں' مجھے اچھی طرح معلوم ہے بیگ صاحب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جس طرح آپ میرے دیرینہ دوست ہیں' ویسے ہی ملک بشیر سے بھی خاصے پرانے

مراسم ہیں۔ آپ کسی بھی سلسلے میں جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں' بے دھڑک کہہ ڈالیں۔''

اور میں نے بے دھڑک کہہ ڈالا۔ ''میں آپ کے کہنے پر یہ کیس تو لے لیتا ہوں' لیکن آگے چل کر کسی بھی مرحلے پر اگر مجھے محسوس ہوا کہ ملزم جاوید بے گناہ نہیں تو میں کیس کو وہیں چھوڑ دوں گا' پھر آپ مجھ سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کیجئے گا۔''

''گلے شکوے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بیگ صاحب۔'' جمیل صدیقی نے اپنایت بھرے انداز میں کہا۔ ''میں آپ کی عادت اور مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ جس مرحلے پر جو بھی مناسب سمجھیں وہی فیصلہ کرنے کے لئے آزاد ہوں گے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ نے ہمیشہ انصاف کی جنگ لڑی ہے۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ''آپ نے کبھی مجرموں کی اعانت نہیں کی' اسی لئے تو میرے ذہن میں فوراً آپ کا نام چمکا تھا' ورنہ اس شہر میں اور بھی بہت سے وکیلوں کو میں جانتا ہوں جو آپ سے آدھی فیس میں کسی بھی قسم کا کیس پکڑنے کے لئے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی' پھر سرسری لہجے میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے' فیس والا معاملہ تو ملزم کے باپ کی آمد پر ہی زیر بحث لایا جائے گا۔''

''جی ہاں' ظاہری بات ہے۔'' جمیل صدیقی نے جواباً کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟''

''آج تیسرا دن ہے بیگ صاحب۔'' اس نے بتایا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ پولیس نے ملزم کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہو گا۔''

''جی ہاں' آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' صدیقی صاحب نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''جاوید اس وقت ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔''

''ٹھیک ہے صدیقی صاحب!'' میں نے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا۔ ''میں آفس سے اٹھنے کے بعد تھانے کا چکر لگا لیتا ہوں۔''

''مجھے یقین ہے ملزم سے ملاقات اس کیس کے لئے بڑی سودمند ثابت ہو گی۔''

صدیقی صاحب پُر یقین انداز میں بولے۔ ''جاوید اس حوالے سے بڑی قیمتی معلومات فراہم کر سکتا ہے۔''

میں نے جمیل صدیقی سے متعلقہ تھانے کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے مجھے تھانے کا نام بتایا' پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اچھا بیگ صاحب!'' اس نے مصافحے کے لئے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے تو آپ اجازت دیں۔ کل ملک بشیر کے ہمراہ کسی وقت آپ کی خدمت میں حاضری دوں گا۔''

''ضرور......ضرور......'' میں نے بھی اٹھ کر اس سے الوداعی مصافحہ کیا۔

پھر وہ میرے دفتر سے رخصت ہو گیا۔

***

اس روز جب میں اپنے آفس سے اٹھنے لگا تو میں نے اپنی سیکرٹری عالیہ سے کہا۔ ''عالیہ تمہیں اگر گھر جانے کی جلدی ہو تو رانا سے کہہ کر ٹیکسی منگوا لو۔''

رانا نواز میرے آفس میں کام کرتا تھا۔ اس کی عمر تو پینتیس سے متجاوز تھی' تاہم اپنے عہدے کے اعتبار سے وہ ''آفس بوائے'' کہلاتا تھا اور ایسا کہلائے جانے پر وہ بہت خوش بھی تھا۔ کسی بیوی بچوں والے شخص کو اگر بوائے یعنی ''لڑکا'' کہلوانے کا موقع ملے تو اسے اچھا کیوں نہیں لگے گا۔

''سر! لگتا ہے آج آپ کو زگ زیگ ہو کر اپنے گھر پہنچنا ہے۔'' عالیہ نے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ میرے لئے ٹیکسی منگوانے کی بات اسی وقت کرتے ہیں' جب آپ کو اپنے روٹ سے ہٹ کر ڈرائیو کرنا ہوتی ہے۔''

عالیہ کا گھر میرے گھر کے راستے میں پڑتا تھا اور اکثر و بیشتر آفس سے واپسی پر وہ میری کار ہی میں بیٹھ جاتی تھی۔ میں اسے اس کے گھر کے نزدیک ڈراپ کر کے آگے بڑھ جاتا تھا۔ اس کی رائے زنی کے جواب میں' میں نے کہا۔

''تمہارا اندازہ درست ہے عالیہ۔ آج میں اپنے ایک کلائنٹ سے ملاقات کے لئے تھانے جاؤں گا اور نہیں معلوم کہ وہاں کتنی دیر ہو جائے' اس لئے زیادہ مناسب یہی ہے کہ تم ٹیکسی پکڑ کر اپنے گھر چلی جاؤ۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اپنی بات

مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''ایسے بھی متعلقہ تھانہ بالکل مختلف روٹ پر واقع ہے۔''
''ٹھیک ہے سر آپ جائیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''رانا میرے لئے سواری کا بندوبست کر دے گا۔''
میں نے ان دونوں کو ''خدا حافظ'' کہا' پھر اپنی کار میں بیٹھ کر اس تھانے کی جانب روانہ ہو گیا' جس کے لاک اپ میں میرا تازہ ترین موکل جاوید بند تھا۔ پولیس عدالت سے اس کا ریمانڈ حاصل کر چکی تھی اور اب وہ گویا ''زیر تفتیش'' تھا۔
میں نے متعلقہ تھانے پہنچ کر اپنی کار کو تھانے کی باؤنڈری وال کے ساتھ پارک کیا' پھر گاڑی کی چابیوں والے چھلے کو انگشت شہادت میں گھماتے ہوئے تھانے کے اندر داخل ہو گیا۔ سوئے اتفاق کہ اس وقت تھانہ انچارج صاحبان ''راؤنڈ'' پر پائے جاتے ہیں۔ نام راؤنڈ یعنی ''گشت'' کا ہوتا ہے' لیکن اس حقیقت کا علم صرف خدا کو یا خود انہیں ہی ہوتا ہے کہ ان کے مذکورہ اور مبینہ راؤنڈ کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔
میں سیدھا انچارج کے کمرے میں پہنچا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔''
اس نے بڑی بددلی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنے نام کا آخری حصہ تو اس طرح چھپا رہے ہیں' جیسے میں آپ کو پکڑ کر فوراً حوالات میں بند کر دوں گا؟''
اس کے اشارے کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے اس کی پیشکش سے فائدہ اٹھانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کی اور کرسی سنبھالنے کے بعد حیرت بھرے انداز میں اسی سے پوچھ لیا۔
''انچارج صاحب! میں نے تو آپ کو اپنا مکمل نام ہی بتایا ہے۔ پتا نہیں' آپ کو یہ ادھورا کس سینس میں لگا.....؟''
''بالکل کامن سینس میں.....'' وہ بے ساختہ بولا۔
میں بھی ایک لمحے کے لئے نہیں چوکا اور تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
''اچھا اچھا..... آپ اس ''سینس'' کا ذکر کر رہے ہیں' جس کے بارے میں کسی انگریز کا مقولہ

ہے..... کامن سینس از آ سینس وچ از ناٹ کامن!''
وہ میری اس سنارانہ چوٹ پر تلملا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ میرا انگلش کا جملہ اسے بہت زور کا لگا تھا۔ میرے احساس کی تائید میں اس کا فوری ردعمل بھی سامنے آ گیا۔ اس نے برہمی سے کہا۔
''مجھے تو یہ اس نامعلوم انگریز کا نامعقولہ لگتا ہے۔''
میں چاہتا تو اس موقعے پر انگریزی اور انگریز بہادر کی معقولیت اور نامعقولیت والی بحث کو بہت دور تک دراز کر سکتا تھا' لیکن میں چونکہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا' لہٰذا زیر لب مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔
''چھوڑیں جناب انگریز کو..... یہ لوگ تو برسوں پہلے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر یہاں سے جا چکے ہیں۔ آپ مجھے میرے نام کے ادھورے پن کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے؟''
''انگریز تو یہاں سے چلا گیا ہے' لیکن اپنا انگریزی نظام قانون ادھر ہی چھوڑ کر گیا ہے' جسے ہم ایک عرصے سے بھگت رہے ہیں۔'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ''اور جہاں تک آپ کے نام کی بات ہے تو میں آپ کو کسی دوسرے مکمل نام سے بھی جانتا ہوں۔''
''وہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
''آپ کا پورا نام ہے.....'' وہ ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ.....''
''تو آپ میرے پیشے سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔''
''نہ صرف نام اور پیشے سے واقف ہوں' بلکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ یہاں خوامخواہ ہی نہیں آئے۔'' وہ طنزیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی کوئی ضرورت ہی کھینچ کر آپ کو یہاں لا سکتی ہے۔''
''اوہ.....'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو بڑے جید قسم کے نجومی ہیں۔''
''نجومی میں نہیں' آپ ہوں گے۔'' وہ تڑخ کر بولا۔ اس کے ردعمل نے مجھے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا' جیسے ''نجومی'' کہہ

کر میں نے اسے کوئی گالی دے دی ہو۔ اس کے دماغ کی گرمی کو کم کرنے کی غرض سے میں نے کہا۔

''آپ ناراض نہ ہوں بچارج صاحب! سمجھ لیں کہ آپ نہیں' میں ہی نجومی ہوں۔ بس' اب غصہ تھوک دیں۔''

''میں غصے میں نہیں ہوں بیگ صاحب!'' وہ چہرے کے تاثرات کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''خیر' چھوڑیں اس فضول بحث کو یہ بتائیں کہ آپ یہاں کس مقصد سے آئے ہیں......؟''

''آپ نے میرے ایک معصوم اور بے گناہ موکل کو اپنی حوالات میں بند کر رکھا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں اس سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔''

وہ محتاط نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا تو ہر موکل ہی معصوم اور بے گنا ہوتا ہے......ابھی آپ کس سے ملنے آئے ہیں؟''

''جاوید پردیسی سے......'' میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

''جاوید پردیسی؟'' وہ بھنویں سکیڑتے ہوئے بولا۔

''ہاں' وہ نوجوان جو لاہور سے کراچی آیا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کر دی۔ ''اور آپ لوگوں نے اس بے چارے کو قتل اور ڈکیتی کے الزام میں پکڑ کر تھانے میں بند کر رکھا ہے۔ میں اپنے اسی موکل سے ملنے آیا ہوں۔''

''بیگ صاحب! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ لڑکا عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور ریمانڈ کی مدت کے دوران میں ہم ملزم سے کسی کی ملاقات نہیں کراتے' اس سے انویسٹی گیشن پر منفی اثر پڑتا ہے۔''

''آپ مجھے قانون پڑھانے کی کوشش نہ کریں انچارج صاحب۔'' میں نے جواباً طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس شعبے کی سیکڑوں بلکہ ہزاروں یہ موٹی موٹی کتابیں میرے دفتر میں اور گھر میں رکھی ہیں' جو نہایت پابندی کے ساتھ میرے مطالعے میں بھی رہتی ہیں۔''

''میں آپ کو قانون پڑھانے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا بیگ صاحب۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''میں تو آپ کو اپنے تھانے کے قواعد وضوابط سے آگاہ کر رہا تھا۔''

''میں تھانوں کے سارے قواعد اور آپ کے تمام تر ضوابط سے بہ خوبی واقف ہوں انچارج صاحب!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جہاں ایک وکیل کو اپنے موکل سے ملاقات کی اجازت دیتے ہوئے آپ کی جان نکلتی ہے' وہیں آپ لوگ ملزم کے ورثا سے موٹی موٹی رقمیں نکلوا کر انہیں ملاقاتوں کے مواقع فراہم کرتے ہیں اور ملزم پر ہلکی دفعات لگانے کا سبز باغ دکھا کر ورثا کے ساتھ لاکھوں کی ڈیل بھی کرتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ میرے آخری جملے کے جواب میں خاصا دوستانہ انداز میں بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ کو ایک مشورہ دوں......''

''لیکن میں اس مشورے کی فیس نہیں دوں گا۔'' میں نے انگشت شہادت کو وارننگ دینے والے انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

''یہ مشورہ بالکل مفت ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''مجھے یقین تو نہیں آ رہا انچارج صاحب......'' میں نے شک بھری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال' میں انتظار کر رہا ہوں......آپ ارشاد فرمائیں؟''

''آپ اس کیس میں ہاتھ نہ ہی ڈالیں تو اچھا ہے۔'' وہ دونوں کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولا۔

''کیوں......؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''اس مشورے کا مقصد کیا ہے؟''

''کیونکہ اس کیس میں آپ کے لئے کچھ نہیں رکھا۔'' وہ گہری ہمدردی سے بولا۔ ''یہ آپ کا پردیسی نوجوان کسی قیمت پر نہیں بچنے والا۔ آپ کو اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر نہ مانیں میری بات۔''

''بات ماننے یا نہ ماننے کا فیصلہ تو میں بعد میں کروں گا۔'' میں نے انچارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا میرے مؤکل نے آپ کی کسٹڈی میں اقبال جرم کر لیا ہے اور یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ عدالت میں جا کر اپنے اقبالی بیان سے منحرف نہیں ہوگا؟''

''ایسی تو کوئی بات نہیں......'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''پھر آپ نے یہ فتویٰ کس روشنی میں صادر فرمایا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور

دیتے ہوئے کہا۔ ''کہ میرا موکل کسی بھی قیمت پر نہیں بچنے والا......؟''

''اور وکیل صاحب!'' وہ میرے چبھتے ہوئے سوال پر برہم ہو گیا۔ ''کیا آپ نے ہم لوگوں کو بالکل ہی نکما سمجھ لیا ہے؟''

''یہ بات تو آپ خود ہی اپنے منہ سے کہہ رہے ہیں۔'' میں نے بڑی سادگی سے پلکیں جھپکائیں۔ ''میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا......''

وہ میری اس گہری چوٹ پر اندر ہی اندر بلبلا کر رہ گیا' تاہم کوئی خطرناک [illegible] ظاہر کرنے کے بجائے بڑے فخر سے بولا۔

''ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں جن کی بنا پر یہ بندہ عدالت سے سیدھا جیل اور جیل سے سیدھا پھانسی کے پھندے تک جائے گا۔''

''اچھا......'' میں نے طنزیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے بھی تو پتا چلے کہ ایسے کون سے ٹھوس ثبوت آپ کے ہاتھ لگ گئے ہیں؟''

''فنگر پرنٹس......'' وہ معنی خیز انداز میں مجھے تکنے لگا۔

''فنگر پرنٹس......'' میں نے منہ بگاڑ کر اس کے الفاظ دہرائے۔ ''یعنی انگلیوں کے نشانات......اس سے مطلب کیا ہے آپ کا؟''

''میں آپ کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ......'' وہ رازدارانہ انداز میں میری معلومات کو صحت مند بنانے لگا۔ ''کہ آلۂ قتل اور مال مسروقہ پر سے ملزم یعنی آپ کے موکل کی انگلیوں کے نشانات حاصل کر لئے گئے ہیں۔''

''اوہ......'' میں نے ایسی اداکاری کی' جیسے مجھے اس انکشاف سے ذہنی دھچکا پہنچا ہو۔ ''یہ تو بہت برا ہوا انچارج صاحب۔''

اس نے میری اداکاری سے بھی یہ تاثر لیا تھا کہ میرے غبارے کی ساری ہوا خارج ہو گئی ہے۔ اس پر ایک اور ردا چڑھاتے ہوئے اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''بیگ صاحب! اب آپ کیا کہتے ہیں؟''

''معاملہ خاصا گمبھیر نظر آ رہا ہے۔'' میں نے مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب تو آپ کو میری فرمائش پوری کرنے میں کسی احتیاط یا ہچکچاہٹ سے کام نہیں لینا چاہئے۔''

وہ چونک کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا' پھر بکھرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کون

سی فرمائش......؟''

''ملزم سے ملاقات کی فرمائش۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جب آپ کی اس کیس پر بڑی جاندار گرفت ہے تو پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

وہ لاجواب سا ہو کر رہ گیا۔ میں نے اسے ایک بند گلی میں لا کھڑا کیا تھا' جہاں سے فرار کی کوئی راہ اسے میسر نہیں تھی۔ ملزم سے ملاقات کرنے کے لئے یہ سارا بکھیڑا پھیلانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے درجنوں ڈھنگ جانتا تھا۔ یہ تو تھانہ انچارج سے ''دل لگی'' میں بات آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کے لئے ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی بڑا کارنامہ ہو' لیکن یہ تمام گفتگو میری نظر میں پیشہ ورانہ تفریح کا درجہ رکھتی تھی۔ انچارج صاحب نے آواز دے کر ایک کانسٹیبل کو اپنے پاس بلایا اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''اوئے خادم حسین! ذرا ان صاحب کو اس قاتل سے ملوا دو جو حوالات میں بند ہے......قتل اور ڈکیتی کے الزام میں......''

''جو حکم سر جی!'' کانسٹیبل نے بڑی فرماں برداری سے کہا۔

''اور ہاں......'' انچارج سے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''یہ ملاقات دس' پندرہ منٹ سے زیادہ کی نہیں ہونی چاہئے۔''

''جی سر! آپ فکر نہ کریں۔'' کانسٹیبل خادم حسین نے یقین دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ''میں ادھر ہی ایک کونے میں کھڑا اپنی گھڑی کو دیکھتا رہوں گا۔''

تھانہ انچارج نے گھور کر خادم حسین کو دیکھا اور بہ آواز بلند کہا۔ ''اب جاؤ یہاں سے۔''

خادم حسین نے فوراً اپنے صاحب کے حکم کی تعمیل کی اور میں اس کی معیت میں تھانہ انچارج کے کمرے سے نکل کر حوالات کی جانب بڑھ گیا۔

انچارج نے میرا ذکر کرتے ہوئے خادم حسین سے یہی کہا تھا کہ......ذرا ان صاحب کو اس قاتل سے ملوا دو......گویا اس نے کانسٹیبل پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ میں ملزم جاوید کا وکیل ہوں۔ میں نے بھی خود کو کانسٹیبل کی نظر میں ''منظر عام'' پر لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی' لیکن جان کاری کے سلسلے میں اس کی کرید اور جستجو کو میں روک نہ سکا۔ حوالات کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔

''کیا آپ ملزم کے والد صاحب ہیں؟''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔ ''کیوں...... یہ خیال تمہارے ذہن میں کیوں آیا......؟''

''وہ جی...... آج صبح اس سے بات ہوئی تھی۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''اس نے کہا تھا کہ اس کے گھر والوں کو اس واقعے کی اطلاع ہوگئی ہے اور آپ' اس کے والد صاحب لاہور سے کراچی پہنچ جائیں گے۔''

''اچھا...... تو یہ بات ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا' پھر پوچھا۔ ''آپ لوگوں نے جاوید کے ساتھ کوئی مار پیٹ تو نہیں کی؟''

میں نے کانسٹیبل کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا' تاہم وہ میرے رویے سے یہی سمجھ بیٹھا تھا کہ میں جاوید کا باپ ہی ہوں۔ اس نے معنی خیز لہجے میں بتایا۔

''جناب! کوئی بھی مجرم آسانی سے زبان تو نہیں کھولتا نا' تھوڑی بہت سختی تو کرنا ہی پڑتی ہے۔''

''تھوڑی بہت سختی تو چلے گی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''خیر' اب میں آ گیا ہوں تو اس معاملے کو بھی دیکھ لوں گا۔ جاوید جب تک پولیس کسٹڈی میں ہے' کوئی اس کا بال بھی بانکا نہیں کر سکے گا۔ میں نے تمہارے انچارج صاحب سے بھی بات کر لی ہے۔''

میں نے یہ سب کچھ محض کانسٹیبل پر رعب جمانے کے لئے کہا تھا۔ وہ یقیناً اس سے یہی مطلب اخذ کرتا کہ میں نے انچارج صاحب کی مٹھی گرم کر کے تفتیشی معاملات میں ملزم کے لئے نرمی کا لائسنس حاصل کر لیا ہے۔ وہ اپنے طور پر جو بھی سمجھ رہا تھا یا جو کچھ بھی سوچ رہا تھا' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی' تاہم جب وہ بولا تو اس کی لالچی طبیعت مجھ پر عیاں ہوگئی۔

''سنا ہے' ادھر لاہور میں آپ کا بہت بڑا کاروبار ہے......؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''اگر مجھے آپ کے انچارج صاحب کا خیال ہے تو میں آپ کو بھی نظر انداز نہیں کروں گا۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو حوالات کے کونے میں کھڑے ہو کر اپنی گھڑی پر نظر جمائے رہنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں دس پندرہ منٹ کا حساب خود ہی رکھ لوں گا۔ آپ اس دوران میں باہر

کا ایک راؤنڈ لگا کر آ سکتے ہیں۔ انچارج صاحب کو اس امر کی خبر نہیں ہوگی اور آپ کی جیب میں بھی تھوڑی گرمائش آ جائے گی۔ کیا خیال ہے آپ کا......؟''

اس نے بھوکی نظر سے مجھے دیکھا اور باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''بڑا نیک خیال ہے جناب......''

میں نے ہپ پاکٹ میں سے اپنا پرس نکالا اور سو روپے کا ایک کرارا سا نوٹ کانسٹیبل کی طرف بڑھا دیا۔ اس وقت تک ہم حوالات میں پہنچ چکے تھے' لہٰذا میری یہ پیشکش کسی کی نگاہ میں نہیں آ سکتی تھی۔

کانسٹیبل نے میرے تحفے کو بڑی خوشی سے قبول کیا اور اس تنبیہ کے ساتھ وہ وہاں سے ٹل گیا۔ ''صاحب! بس پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں۔ ہم آپ لوگوں کی خیر خواہی میں بعض اوقات بہت بڑا نقصان اٹھا لیتے ہیں۔ انچارج صاحب بہت سخت طبیعت کے مالک ہیں اور......''

''اور کچھ نہیں خادم حسین......'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ ''میں تم کو اور تمہارے انچارج صاحب کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ ویسے تمہیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میری وجہ سے تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا اور...... اگر تھوڑا بہت نقصان ہو بھی گیا تو میں اس نقصان کی تلافی پیشگی کر چکا ہوں......''

وہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔ ''تلافی'' کے حوالے سے وہ میری بات کا مطلب بہ خوبی سمجھ گیا تھا۔ آج کل سو روپے والے نوٹ کی قدر بہت گر چکی ہے' لیکن جس دور کا یہ واقعہ ہے اس زمانے میں اتنی مالیت کے نوٹوں کی ایک اپنی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ ایک متوسط فیملی کے روزمرہ کے لئے سبزی' گوشت' فروٹ کی خریداری کے بعد مٹھائی وغیرہ کے لئے بھی اس نوٹ میں سے پیسے بچ جایا کرتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ نوٹوں میں سے برکت اٹھ گئی ہے یا ہم ہی کچھ زیادہ فضول خرچ ہو گئے ہیں۔

میرا خیال ہے...... دونوں ہی باتیں ہیں۔

کانسٹیبل خادم حسین کے جانے کے بعد میں ملزم جاوید کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے

اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ تمہارے والد صاحب نے ایک دوست جمیل صدیقی کی معرفت مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے۔ میں تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا دوں گا' جس میں بدقسمتی سے اس وقت تم گھرے ہوئے ہو۔''

جاوید ایک جوان اور صحت مند شخص تھا' تاہم موجودہ حالات نے اسے خاص پژمردہ کردیا تھا۔ میری جانب سے حوصلہ افزا جملے سن کر اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی اتر آئی۔ یوں محسوس ہوا' میری صورت میں اس کی نگاہ کے سامنے امید کا جگنو جگمگا اٹھا ہو۔ اس نے بڑے ادب سے میری جانب ہاتھ بڑھایا اور پرُجوش انداز میں بولا۔

''السلام علیکم وکیل صاحب! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔''

''وعلیکم السلام!'' میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اصل خوشی تو تمہیں اس وقت ہوگی جب میں تمہیں اس کیس سے باعزت بری کرواؤں گا۔''

اس کی آنکھوں میں ابھرنے والے امید کے سائے کچھ پھیل سے گئے۔ اس نے پرُاشتیاق لہجے میں پوچھا۔ ''ابو سے آپ کی بات ہوگئی ہے؟''

''تمہارے ابو سے میری ملاقات انشاء اللہ کل ہوگی۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''وہ آج رات میں کسی وقت کراچی پہنچ رہے ہیں۔''

''وکیل صاحب! پتا نہیں' وہ کون سا برا وقت تھا جب میں اس کیس میں پھنس گیا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''آپ یقین کریں' میں نے نہ تو کسی کو قتل کیا ہے اور نہ ہی ڈکیتی کی کسی واردات میں میرا ہاتھ ہے۔''

''میں جانتا ہوں جاوید' تم بے گناہ ہو۔'' میں نے اس کے اعتماد میں توانائی بھرنے کی غرض سے کہہ دیا۔ ''اگر مجھے تمہارے مجرم ہونے کا ایک فیصد بھی یقین ہوتا تو میں اس کیس میں ہاتھ ہی نہیں ڈالتا۔'' میں سانس درست کرنے کے لئے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں صرف انہی مصیبت زدہ لوگوں کے کیس لیتا ہوں' جو کسی ناکردہ جرم میں ملوث ہو کر پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔''

''آپ بہت ہی عظیم انسان ہیں وکیل صاحب!'' وہ تعریفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے

بولا۔

میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ''جاوید! میری عظمت تو اس وقت ثابت ہوگی' جو تم عدالت سے بے گناہ ثابت ہونے کے بعد باعزت بری ہو کر اپنے گھر جاؤ گے اور اس کٹھن کام کے لئے مجھے تمہاری مدد اور تعاون کی اشد ضرورت ہے۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں جناب!'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''آپ حکم تو کریں۔''

میں نے کہا۔ ''فی الحال تو تم مجھے ان حالات کی تفصیلات سے آگاہ کرو گے' جن میں گھر کر تم یہاں پہنچے ہو' لیکن اس سے بھی پہلے ہمیں ایک ضروری کام کرنا ہے۔''

''کون سا ضروری کام؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے وکالت نامہ اور دیگر ضروری کاغذات برآمد کئے' پھر مختلف مقامات پر اس کے دستخط لینے کے بعد بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا۔

''سب سے زیادہ ضروری کام تو یہی تھا۔ اب قانون کی نظر میں تم میرے موکل اور میں تمہارا وکیل ہوں۔ یہ کام اس کانسٹیبل خادم حسین کے سامنے نہیں ہوسکتا تھا۔''

''کیوں نہیں ہوسکتا تھا جناب؟'' اس نے معصومیت بھرے انداز میں پوچھا۔

''اس لئے کہ وہ مجھے وکیل نہیں' بلکہ تمہارا باپ سمجھتا ہے۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے' الجھن زدہ لہجے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ نے اس سے یہ غلط بیانی کیوں کی وکیل صاحب؟''

''میں نے اس سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔'' میں نے جاوید کی الجھن دور کرنے کے لئے فوراً وضاحت کردی۔ ''یہ اس کا ذاتی خیال ہے اور میں نے اس کے خیال کو درست کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ جیسا بھی سوچ کر خوش ہے' میری بلا سے۔''

''آپ ایک ذہین اور ہوشیار وکیل ہیں بیگ صاحب!'' وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم میری تعریف وتوصیف میں جس نوعیت کے الفاظ استعمال کر رہے ہو' میں ان کی معنویت پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ پھر اپنے مطلب کی

طرف آتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اب تم فوراً مجھے وہ معلومات فراہم کر دو جن کا ذکر میں نے تھوڑی دیر پہلے کیا تھا' تاکہ میں اس کیس کی تیاری کے لئے کوئی بنیادی ڈھانچہ بنا سکوں۔''

''ٹھیک ہے بیگ صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیتا ہوں۔''

آئندہ پندرہ منٹ میں مجھے جاوید نے اس واقعے کی جو تفصیلات سنائیں' ان کی روشنی میں وہ مجھے بے قصور اور بے گناہ نظر آیا۔ میرے اندازے کے مطابق اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کر دیا گیا تھا۔ کراچی میں کسی کو اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ بس وہ حالات اور اتفاق کا مارا اس خطرناک سچویشن میں آن پھنسا تھا۔ اسے نظریہ ضرورت کے تحت قربانی کا بکرا بنا لیا گیا تھا' لیکن عید قربانی سے پہلے ہی میں اس معاملے میں کود پڑا تھا' لہٰذا اب ملزم جاوید کی قربانی کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

اس روز تھانے کی حوالات میں میرے مؤکل جاوید نے مجھے کس نوعیت کی معلومات فراہم کیں' وہ میں سردست آپ سے شیئر نہیں کروں گا۔ ان باتوں کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر گاہے بہ گاہے آپ کو دیکھنے اور سننے کو ملتا رہے گا۔

***

آئندہ روز شاہ میں جمیل صدیقی' جاوید کے والد ملک بشیر کو لے کر میرے آفس آ گئے۔ میں نے پُرتپاک انداز میں انہیں ویلکم کہا' پھر ان کے لئے چائے کا آرڈر دینے کے بعد جاوید کے موضوع پر گفتگو کرنے لگا۔

ملک بشیر ایک گورا چٹا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیص پر ایک قیمتی ویسٹ کوٹ (واسکٹ) پہن رکھا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں عیب تھا۔ مذکورہ ہاتھ تو اپنی جگہ صحیح و سالم نظر آتا تھا' لیکن اس میں جان وغیرہ نہیں تھی۔ کچھ عرصہ پہلے ملک بشیر پر فالج کا ایک اٹیک ہوا تھا اور اس ہاتھ کو متاثر کر گیا تھا۔ وہ ہاتھ اب کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا' تاہم باقی وجود کے ساتھ پیوستہ رہتے ہوئے وہ بھی کسی بے جان شے کے مانند جھولتا رہتا تھا۔

صدیقی صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''بیگ صاحب! آپ رات کو جاوید کی طرف گئے تھے نا؟''

''جی ہاں' میں نہ صرف یہ کہ تھانے گیا تھا' بلکہ میں نے اپنے مؤکل سے ایک بھرپور

ملاقات بھی کر لی ہے۔''

''بس تو پھر مطمئن ہوں۔'' صدیقی صاحب نے ایک تسلی بخش سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''جاوید نے آپ کو حقیقت حال سے آگاہ تو کر دیا ہوگا؟''

''جی' میں نے اس سے تمام معلومات لے لی ہیں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس کا کام یہیں تک تھا' یہاں سے میرا کام شروع ہوتا ہے۔''

ملک بشیر نے مجھ سے استفسار کیا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ایک بات تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا بیٹا اس قسم کی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا۔''

''میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے ملک صاحب!'' میں نے محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے ایک گہری چال کے تحت اس کیس میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

''جناب! یہ چال ہے یا جال...... اسے آپ ہی نے کاٹنا ہے۔'' ملک بشیر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کام کے لئے آپ کی فیس کے علاوہ جتنا بھی خرچہ ہوگا وہ میں دینے کو تیار ہوں۔ آپ روپے پیسے کی فکر نہ کیجئے گا۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس۔ میں بس' جلد از جلد اپنے بیٹے کی رہائی چاہتا ہوں۔''

''ہر ماں باپ کو اپنی اولاد کی رہائی اور آزادی ہی اچھی لگتی ہے ملک صاحب!'' میں نے تعریفی انداز میں کہا۔

''اس سلسلے میں' میں کو ایک مشورہ بھی دینا چاہوں گا۔''

''جی...... ارشاد۔'' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میری فیس اور دیگر عدالتی اخراجات تو اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت رکھتے ہیں' لیکن باقی معاملات میں آپ ''اللہ کے دیئے سب کچھ'' میں سے سوچ سمجھ کر لٹایئے گا' کیونکہ قدرت ہمیں جن نعمتوں سے نوازتی ہے' اس کا ہم سے ایک غیر محسوس انداز میں حساب بھی لیا جاتا ہے۔''

''میں آپ کی نصیحت کو ذہن میں رکھوں گا۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا' پھر پوچھا۔ ''اس حوالے سے اگر آپ کا اشارہ کسی خاص سمت میں ہے تو پلیز وضاحت کر دیں۔''

''اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ کا اشارہ پولیس کی جانب ہے نا بیگ صاحب؟'' جمیل صدیقی نے سوچتی ہوئی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"رائٹ یور آر......" میں نے فوراً تصدیق کر دی۔ "آپ بالکل صحیح جگہ پر پہنچے ہیں صدیقی صاحب۔" پھر میں نے ملک بشیر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"پولیس والے مختلف حیلوں بہانوں کی مدد سے آپ کی جیب ہلکی کرنے کی کوشش کریں گے' لیکن آپ نے ان کے کسی چکر میں نہیں آنا۔ مثلاً...... میں نے مختصر توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"مثلاً وہ آپ کو یہ آسرا دے سکتے ہیں کہ اگر آپ ان کی مٹھی گرم کر دیں تو وہ چالان کی تیاری کچھ اس انداز کی کریں گے کہ جاوید پر اس کیس کی زیادہ گرفت نہ رہے اور وہ آسانی سے عدالت سے بری ہو جائے گا۔ وہ ہلکی دفعات لگا کر ڈیفنس کا کام آسان کر دیں گے اور کوئی کمزور وکیل بھی بہ آسانی جاوید کو باعزت بری کروانے میں کامیاب ہو جائے گا' وغیرہ...... یہ سب پولیس والوں کا ایک خوبصورت جھانسا ہوتا ہے۔"

"بیگ صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" صدیقی صاحب نے ملک بشیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ درحقیقت پولیس اس نوعیت کی کوئی فیور دے ہی نہیں سکتی۔"

"پولیس استغاثہ کی وارث ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ ملزم پر تمام تر الزامات کا بوجھ لاد کر اسے عدالت سے سخت ترین سزا دلوانے کے لئے ہمہ وقت کوشاں نظر آتی ہے۔ کسی بھی ملزم کے لئے کیس میں کوئی رعایت پیدا کرنا تو اپنے ہاتھوں سے استغاثہ کے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ پولیس اس قسم کی حماقت کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ ہاں البتہ......" میں نے تھوڑا سا توقف کر کے اپنے سامنے بیٹھے ان دونوں شرفاء کو باری باری دیکھا' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"جب تک کوئی کیس پکے کاغذات پر رجسٹرڈ نہیں ہوا ہوتا' سارے معاملات پولیس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ وہ دونوں پارٹیوں سے الگ الگ ڈیل کر کے اپنی جیبیں بھر لیتی ہے اور کیس کا حلیہ بگاڑ کر اپنی مرضی کی صورت حال کو نافذ کر دیتی ہے' مگر جاوید کا کیس خاصا میچور ہو چکا ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ واقعہ رجسٹرڈ ہے' بلکہ اب تو اس معاملے میں عدالت بھی براہ راست ملوث ہو چکی ہے اور یہ سب کیا دھرا چونکہ پولیس ہی کا ہے لہٰذا وہ ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔"

"بیگ صاحب! اتنی اہم معلومات فراہم کرنے کا بہت بہت شکریہ۔" ملک بشیر ممنونیت

بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا' پھر پوچھا۔ "اس کیس کی تازہ ترین پوزیشن کیا ہے؟ میں یہ بات اپنے طور پر سمجھنے کے لئے پوچھ رہا ہوں؟"

"ضرور' یہ تو آپ کا حق ہے ملک صاحب!" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "یہ کیس ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ آپ کا بیٹا عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔ وہ لوگ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں اپنی تفتیش مکمل کر کے چالان عدالت میں پیش کر دیں گے۔ اس کے بعد عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوگا۔"

"ٹھیک ہے بیگ صاحب!" ملک بشیر گہری سنجیدگی سے بولا۔ "عدالتی معاملات کو آپ مجھ سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں اس لئے عدالت کے اندر کی صورت حال آپ ہی کو سنبھالنا ہوگی۔ میں اس سلسلے میں ہر نوعیت کے تعاون کے لئے تیار ہوں اور ایک بات کا مجھے سو فیصد یقین ہے۔"

اس نے بڑے ذومعنی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "کس بات کا ملک صاحب!؟"

"اس بات کا کہ......" وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "میرا بیٹا قاتل نہیں ہو سکتا۔"

"ملک صاحب! ایک بات کو ذہن میں رکھیں۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اگر مجھے اس امر کا ذرہ برابر بھی شک ہوتا کہ آپ کا بیٹا قتل اور ڈکیتی کی مبینہ واردات میں ملوث ہے تو میں کبھی بھی اس کا کیس اپنے ہاتھ میں نہ لیتا' لیکن صرف آپ کے اور میرے یقین کر لینے سے بات نہیں بنے گی جناب!"

"جی' میں سمجھا نہیں؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"سیدھی سی بات ہے ملک صاحب!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ 'عدالت انسان کے یقین' جذبات اور احساسات کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔" وہ ہر بات کے لئے ثبوت مانگتی ہے۔ پولیس نے آپ کے بیٹے پر جو سنگین نوعیت کے الزامات عائد کیے ہیں انہیں رد کرنے کے لئے مجھے ٹھوس ثبوت مہیا کرنے ہوں گے' جس کے لئے سخت بھاگ دوڑ کی ضرورت ہے۔ آپ اس کام کو سیدھا سادا اور آسان سا ہرگز نہ سمجھیں۔"

"میں آپ کی بات کی اہمیت کو سمجھ رہا ہوں بیگ صاحب!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''میں نے آپ کو اپنے بیٹے کا وکیل مقرر کر دیا ہے۔ اب جاوید کا کیس آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا دفاع کرنے کے لئے آپ کو جس نوعیت کی بھی تحقیقات کرانا ہوں یا مختلف قسم کی معلومات جمع کرنا ہوں' وہ آپ ضرور کریں۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لئے تھما' پھر بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔

''آپ خرچے کی پروا نہ کریں بیگ صاحب! آپ صرف جاوید کو عدالت سے انصاف دلانے پر توجہ مرکوز رکھیں۔ باقی میں سب برداشت کرلوں گا۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''میں ایسا ہی کروں گا' کیونکہ میں بھی وہی چاہتا ہوں' جو آپ کا مطمح نظر ہے۔ آپ کا بیٹا مجرم نہیں ملزم ہے۔ میں اسے عدالت سے انصاف دلا کر رہوں گا۔

***

اگلی پیشی پر پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔

میں نے اپنے وکالت نامے کے علاوہ ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی۔ فوجداری مقدمات میں ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی' بلکہ یہ ناممکن حد تک دشوار تصور کی جاتی ہے' تاہم کوشش کے پہلو کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور میں یہ کوشش ہر کیس میں ضرور کرتا ہوں۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا تو جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ اس کا مخاطب ظاہر ہے' میرا موکل جاوید ہی تھا' جو اس کیس میں ملزم نامزد تھا اور افسردہ سا اکیوزڈ باکس میں کھڑا تھا۔

''ملزم جاوید!'' جج کی مخصوص آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔ ''چھبیس اگست کی رات تم ایک بزنس مین فضل کریم کے گھر میں ڈکیتی کی نیت سے داخل ہوئے۔ اس واردات میں مقتول فضل کریم کی جانب سے مزاحمت پر تم نے غیر قانونی اسلحے سے فائرنگ کر کے فضل کریم کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب تم ڈکیتی کی رقم لے کر بنگلے سے فرار ہونے لگے تو فضل کریم کے ایک گھریلو ملازم نے تمہیں دیکھ لیا' نہ صرف دیکھ لیا بلکہ وہ تم سے بھڑ بھی گیا۔ اس مڈھ بھیڑ کے نتیجے میں مذکورہ ملازم نے تم پر قابو پا لیا۔ بعد ازاں تمہیں جائے وقوعہ پر ہی گرفتار کر لیا گیا۔ کیا تم اس فرد جرم کا اقرار کرتے ہو؟''

جج نے فرد جرم کے سلسلے میں جو سٹینڈ لیا تھا' وہ استغاثہ کی رپورٹ یعنی چالان کا خلاصہ تھا۔ ملزم نے بڑی توجہ سے جج کی بات سنی' پھر بڑے اعتماد کے ساتھ صحت جرم سے انکار کر دیا۔

''سر! میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا...... مجھے کسی سازش کے تحت اس کیس میں پھانسا گیا ہے......''

صحت جرم سے انکار پر جج نے میری طرف دیکھا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ڈیفنس......''

میں اپنی مخصوص نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میرے موکل کا تعلق ضلع لاہور سے ہے اور ان کا ایک چلتا ہوا باعزت کاروبار بھی ہے۔ یہ لوگ کاروباری ہیں اور پاکستان کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے شہر میں ان کا مال جاتا ہے اور اسی بزنس کے سلسلے میں میرا موکل اتفاق کے تحت یہ مقتول کے بنگلے کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اسے قتل اور ڈکیتی کے معاملات میں ملوث کر دیا گیا۔ اس دہری واردات سے میرے موکل کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بے گناہ ہے لہٰذا معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ اس کی درخواست ضمانت منظور کی جائے۔''

''آئی آبجیکٹ یور آنر......'' وکیل استغاثہ نے بہ آواز بلند کہا۔

''ایکسپلین یور آبجیکشن!'' جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یور آنر......'' وکیل استغاثہ نے ملزم کی ضمانت رکوانے کے لئے اپنے موقف کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کیا۔

''کسی شخص کا کاروباری ہونا...... اس کا کاروبار پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہونا...... اس کا تعلق کراچی سے نہ ہونا...... اس کا مقتول سے ناشناس ہونا...... یہ تمام تر حقائق اس امر کی دلیل نہیں ہیں کہ ایسا شخص کسی مجرمانہ واردات میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ ہمارے پاس مجرم کے خلاف......''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' میں نے وکیل استغاثہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی احتجاجی لہجے میں کہا۔

وکیل استغاثہ نے میرے دلائل کے الفاظ پکڑ کر آبجیکشن کیا تھا' لہٰذا میں نے بھی اس کے آبجیکشن میں سے اپنی پسند اور مطلب کے لفظ کا چناؤ کر کے فوراً اعتراض جڑ دیا تھا۔ جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''وکیل صاحب! آپ اپنے اعتراض کی وضاحت کریں۔''

''جناب عالی! آج اس کیس کی پہلی باقاعدہ پیشی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولنا شروع کیا۔'' اور میرے فاضل دوست نے مقدمے کی کارروائی کے بغیر ہی میرے موکل کو مجرم قرار دے دیا ہے' جبکہ ابھی تک میرے موکل پر عائد کردہ الزامات ثابت نہیں ہوئے۔ میرے خیال میں یہ عدالت کے وقار اور انصاف کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔'' یور آبجیکشن از اکسیپٹڈ!''

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ مجھے اپنے دلائل کو آگے بڑھانا چاہئے۔ سو میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میرا موکل بے گناہ بے قصور ہے۔ قتل اور ڈکیتی کی واردات سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں الجھایا گیا ہے۔''

''میرے فاضل دوست نے اس کیس کو ایک سوچی سمجھی سازش قرار دیا ہے۔'' وکیل استغاثہ جج کو متاثر کرنے کے لئے دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔'' جبکہ اس موقف میں کوئی حقیقت یا طبعی ملان نظر نہیں آتا۔''

''وضاحت کی جائے......'' وکیل استغاثہ کی جانب دیکھ کر جج نے کہا۔

''جناب عالی! ملزم کا تعلق لاہور سے ہے جبکہ مقتول کراچی کا رہنے والا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے جج کی وضاحت طلبی کے جواب میں کہا۔'' ملزم کا سینٹری کا کاروبار ہے' جبکہ مقتول کپڑے کا بزنس چلاتا تھا۔ علاوہ ازیں ملزم اور مقتول میں کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی' یعنی وہ دونوں ایک دوجے کے لئے قطعی اجنبی تھے۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لئے رکا' پھر اپنی وضاحت کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''یور آنر! جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے خلاف سوچی سمجھی سازش کرتا ہے تو ان دونوں کے بیچ کسی بھی سطح پر' کسی بھی نوعیت کی روشنی کا وجود ناگزیر ہے' جبکہ یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے۔'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا' طنزیہ انداز میں مجھے گھورا اور روئے سخن جج کی طرف

موڑتے ہوئے اضافہ کیا۔

''یہاں کا معاملہ معزز عدالت کے سامنے ہے۔ ملزم اور مقتول زندگی میں کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے' دونوں میں کبھی کوئی لین دین نہیں ہوا' دونوں نے حتیٰ کہ کبھی ایک دوسرے کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی پھر...... پھر جناب عالی! کیسی رقابت' کیسی قرابت' کیسی دوستی' کیسی دشمنی اور...... کیسی سازش؟'' وہ ایک مرتبہ پھر میری جانب متوجہ ہوا۔

''میرے فاضل دوست! کسی بھی حوالے سے ملزم اور مقتول میں کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا اور اس بات کو بھی آپ ذہن میں رکھیں کہ سازش ہمیشہ اپنے ہی کرتے ہیں' اپنوں کے خلاف چاہے' وہ دوستی میں کریں یا دشمنی میں' اچھا برا کوئی نہ کوئی تعلق تو ضرور سامنے آنا چاہئے نا کسی سازش کو بننے کے لئے......''

مجھے چھوڑ کر وہ دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہو گیا۔'' جناب عالی! آلہ قتل اور مال مسروقہ والے بریف کیس پر ملزم کے فنگر پرنٹس کا ملنا اور جائے وقوعہ سے ملزم کی رنگے ہاتھوں گرفتار چیخ چیخ کر اس سچائی کا اعلان کر رہی ہے کہ کٹہرے میں کھڑا یہ شخص......'' اس نے اکیوزڈ باکس میں موجود میرے موکل کی جانب اشارہ کیا اور خاصے جارحانہ انداز میں بولا۔

''یہ شخص اس معاشرے کا ایک ناسور ہے' جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ میں معزز عدالت سے پرزور استدعا کرتا ہوں کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو مسترد کرتے ہوئے عدالت کی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے۔''

جج نے وکیل استغاثہ کے خاموش ہونے پر سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ میں وکیل استغاثہ کے دلائل کے جواب میں کیا کہنا چاہوں گا۔ میں نے جج کا اشارہ پا کر وکیل استغاثہ کی تشفی کے لئے ان خیالات کا اظہار کیا۔

''جناب عالی! میں اپنے فاضل دوست کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ایک ایسی اہم بات سے روشناس کرایا' جو پہلے میرے علم میں نہیں تھی۔ اس علمی معاونت پر میں ان کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہوگا......''

''کون سی اہم بات......؟'' وکیل استغاثہ نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے اس کے سوال پر قطعاً کوئی توجہ نہیں دی اور براہ راست جج سے مخاطب رہتے ہوئے اپنا استدلال جاری رکھا۔

''یور آنر! اکثر سازشوں میں اصل کرداروں کے بجائے غیر متعلق افراد کو ہی قربانی کا بکرا بنایا جاتا ہے' تاکہ کیس کا حلیہ بدل کر رہ جائے۔ استغاثہ نے اس کیس میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ گھڑی ہوئی ایک بوگس کہانی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔''

''پھر حقیقت کیا ہے......؟'' وکیل استغاثہ چیخ سے مشابہ آواز میں بولا۔

''حقیقت......'' میں نے اس لفظ پر اچھا خاصا زور دیا' پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔'' اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس حقیقت کو ملزم کی زبان سے منظر عام پر لانا چاہتا ہوں۔''

''پرمیشن گرانٹیڈ!'' جج نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

میں اکیوزڈ باکس کے قریب پہنچ کر اپنے موکل اور اس کیس کے ملزم کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''چھبیس اگست کی رات تم حیدری کے علاقے میں کیا کرنے گئے تھے؟''

''مجھے ایک شخص کی تلاش تھی۔'' اس نے جواب دیا۔'' جو حیدری کے ایک بنگلے میں رہتا ہے۔''

''وہ کون شخص تھا اور تمہیں کیوں اس کی تلاش تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس شخص کا نام انور شیخ ہے۔'' ملزم نے جواب دیا۔'' وہ میرے ایک دوست اسلام شیخ کا بہنوئی ہے۔ اسلم شیخ کی بہن فرزانہ لاہور سے بیاہ کر کراچی آئی ہوئی ہے۔ اسلم نے مجھے انور اور فرزانہ کے لئے ایک پیغام دیا تھا' اسی غرض سے میں حیدری کے علاقے میں پہنچا تھا۔''

میں یہ ساری باتیں پہلے سے جانتا تھا۔ حوالات میں ملاقات پر جاوید نے مجھے تمام حالات و واقعات سے آگاہ کر دیا تھا اور اب میں بڑے ڈھنگ سے ان حقائق کو عدالت کے سامنے لا رہا تھا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مذکورہ شخص سے تمہاری ملاقات ہو گئی تھی؟''

''ملاقات تو تب ہوتی نا جب میں اس کا بنگلا تلاش کرنے میں کامیاب ہو پاتا۔'' وہ بیزاری سے بولا۔'' میں رکشہ میں بیٹھا مختلف گلیوں میں چکراتا رہا' لیکن منزل تک نہ پہنچ سکا۔ کراچی کے راستے اور گلیاں بھی عجیب ہیں' کوئی ایڈریس ڈھونڈنا مشکل کام ہے' پھر کسی سے

پوچھو تو وہ بھی ایسے پیچیدہ انداز میں گائیڈ کرتا ہے کہ انسان کا دماغ گھوم کر رہ جائے۔''

''پھر تم نے کیا کیا......؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

''کرنا کیا تھا جناب......'' وہ جھنجھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔'' اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا' رکشہ والے نے کر دیا۔''

''کیا کر دیا؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''اس نے مجھے رکشہ سے نیچے اتار دیا' یہ کہتے ہوئے کہ......'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔'' بھائی صاحب! اگر آپ کو حیدری کی گلیاں ناپنے کا اتنا ہی شوق ہے تو مجھے اور میرے رکشے کو معاف کر دو۔ یہ کام تم اپنے قدموں پر چل کر کرو تو صحت بھی بنے گی اور انجوائے بھی کرو گے۔''

''رکشہ چھوڑنے کے بعد تم انور شیخ کے بنگلے کی تلاش سے باز آ گئے تھے یا اس مشن کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بدقسمتی سے اس مشن کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا'' وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔'' جس کا نتیجہ بھگت رہا ہوں۔ کاش! میں رکشہ کو نہ چھوڑتا اور اسی میں بیٹھا بیٹھا صدر کی طرف چلا جاتا' جہاں کے ایک ہوٹل میں میرا قیام تھا۔''

''تم نے کس نتیجے کو بھگتنے کا ذکر کیا ہے۔'' میں نے اہم نکتے کو اجاگر کرتے ہوئے کہا۔'' اس رات تمہارے ساتھ ایسا کون سا واقعہ پیش آ گیا تھا؟''

''میں رکشہ میں سے اتر کر پیدل ہی انور شیخ کا بنگلا تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ......'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔'' کہ...... میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔''

''تم نے ایسا کیا دیکھ لیا جسے عجیب کہہ رہے ہو؟''

''میں نے ایک بنگلے کے سامنے کھڑی گاڑی کے ساتھ ایک شخص کو گڑبڑ کرتے دیکھا تھا۔''

''گڑبڑ......کیسی گڑبڑ......؟''

''وہ شخص زور زبردستی سے اس گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا'' ملزم نے بتایا۔'' میں اس کی حرکت پر چونک اٹھا اور تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ اس دوران میں وہ گاڑی کا عقبی دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا' اس نے گاڑی میں سے

ایک بریف کیس نکالا تھا۔ اس کی مشکوک حرکت نے مجھے چونکا دیا۔ میرے ذہن میں فوری طور پر یہی آیا کہ وہ کوئی چور ہے۔ میں نے بہ آواز بلند اسے پکارا۔ میری پکار بلکہ للکار سن کر وہ بریف کیس سمیت ایک جانب دوڑا۔ میں نے جست لگا کر اسے پکڑ لیا۔ ہمارے درمیان چند سیکنڈ کی چھینا جھپٹی ہوئی' جس کے اختتام پر میں اس چور سے بریف کیس چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔ اس صورت حال نے اسے بوکھلا دیا اور پکڑے جانے کے خوف سے اس نے ایک سمت دوڑ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔''

''کیا اس وقت تمہیں معلوم تھا کہ مذکورہ بریف کیس کے اندر کیا ہے؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''میں بند بریف کیس کے اندر بھلا کیسے جھانک کر دیکھ سکتا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس بریف کیس میں پانچ لاکھ روپے کی رقم موجود تھی۔''

''اس چور سے بریف کیس چھیننے کے بعد تم نے کیا' کیا تھا؟'' میں نے دلچسپی جرح کے انکشاف انگیز سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

''میں اس بنگلے کے گیٹ پر پہنچا' جس کے سامنے کھڑی گاڑی میں اس نامعلوم چور نے نقب لگائی تھی۔'' ملزم نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''میرے اندازے کے مطابق مذکورہ گاڑی کا تعلق اسی بنگلے کے مکینوں سے ہو سکتا تھا۔ میں نے گیٹ کے پہلو میں نصب گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بنگلے کا گیٹ کھلا اور وہاں پر گھنی مونچھوں والا ایک دراز قامت شخص نمودار ہوا۔ وہ گورا چٹا شخص بڑی تاثر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے میرے ہاتھ میں بریف کیس کو دیکھا تو چونک اٹھا' پھر میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا۔

''یہ بریف کیس تمہارے پاس کیسے پہنچا' لاؤ مجھے دو......''

اس کے سوال سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اس بریف کا مالک ہو سکتا ہے' لیکن پھر بھی میں نے تصدیق کی خاطر' گاڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ گاڑی آپ کی ہے......؟''

''ہاں......'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اور یہ بریف کیس بھی میرا ہے۔ یہ تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟''

میں نے بریف کیس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ میں نے ایک شخص کو آپ کی گاڑی میں سے یہ بریف کیس چوروں کے انداز میں نکالتے ہوئے دیکھا۔ میں اس پر جھپٹ پڑا اور اس سے یہ بریف کیس چھین لیا۔ وہ اندھیرے کی آڑ لے کر ایک جانب غائب ہو گیا۔''

''تم تو بہت ہی بہادر نوجوان ہو۔'' وہ شخص میرے ہاتھ سے بریف کیس لے کر تعریفی انداز میں بولا۔ ''تمہیں نہیں معلوم کہ تم نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ تم تو انعام کے حق دار ہو گئے ہو۔ آؤ میرے ساتھ......''

مجھے انعام و نعام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو یہی سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ وہ شخص نقصان اٹھانے سے بچ گیا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنا مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

''آپ تو یہیں رہتے ہیں۔ میں کافی دیر سے ایک صاحب کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں۔ آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی کر دیں تو میں یہی سمجھوں گا کہ مجھے انعام مل گیا۔''

اس دراز قامت شخص نے مجھے گھور کر دیکھا اور پوچھا۔ ''جوان! تم کن صاحب کا گھر تلاش کر رہے تھے؟''

''انور شیخ صاحب کا۔'' میں نے بتایا۔ ''جن کی شادی لاہور میں ہوئی ہے۔''

''اچھا اچھا...... وہ شیخ صاحب......'' وہ سرسری انداز میں بولا۔

''کیا آپ انور شیخ کو جانتے ہیں؟'' میں نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بھئی' شیخ صاحب سے تو میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ یہیں پچھلی گلی میں ان کا بنگلا ہے۔'' وہ بتانے لگا۔ ''میں خود تمہیں ان کے گھر چھوڑ کر آؤں گا' لیکن پہلے تمہیں میرے ساتھ اندر چلنا ہو گا۔ کچھ کھائے پیئے بغیر میں تمہیں یہاں سے ہلنے بھی نہیں دوں گا۔ آج تم نے مجھے بہت بڑے نقصان سے بچا لیا ہے۔ تم میرے لئے عظیم محسن بن کر آئے ہو۔''

میں اس شخص کی اخلاق بھری باتوں سے بے حد متاثر ہوا اور اس کا دل رکھنے کے لئے بنگلے کے اندر چلا گیا۔ ویسے بھی اب مجھے کسی بات کی جلدی نہیں تھی۔ میں انور شیخ سے ملنے نیدری کے علاقے میں پہنچا تھا اور وہ شخص مجھے انور شیخ کے بنگلے تک پہنچانے والا تھا۔''

''جب وہ شخص تمہیں اپنے بنگلے کے اندر لے گیا تو پھر کیا واقعہ پیش آیا تھا؟'' ملزم نے

لمحاتی توقف کیا تو میں نے فوراً سوال جڑ دیا۔ ''اور اس نے تمہیں اپنا نام کیا بتایا تھا؟''

''اس گھنی مونچھوں والے گورے چٹے شخص نے مجھے اپنا نام منیر واحدی بتایا تھا'' ملزم ایک گہری سانس لینے کے بعد بولا۔ ''اس نے بنگلے کے اندر لے جا کر مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ''ابھی آتا ہوں'' کہہ کر بنگلے کے اندرونی حصے میں غائب ہو گیا۔ ایک منٹ کے بعد ایک اور شخص ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ صورت ہی سے کوئی گھریلو ملازم نظر آتا تھا۔ دبلا پتلا' گہرا سانولا رنگ' لمبا قد اور گھنگریالے بال جیسا کہ عموماً افریقی لوگوں کے یا مکرانیوں وغیرہ کے ہوتے ہیں۔'' اس نے رک کر ایک گہری سانس لی' پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

اس لمبے تڑنگے شخص نے ڈرائنگ روم میں آ کر مجھ سے کہا۔ ''آپ کو صاحب نے اندر بلایا ہے۔''

میں یہی سمجھا کہ وہ منیر واحدی کا گھریلو ملازم ہے' چنانچہ میں صوفے سے اٹھا اور چپ چاپ اس شخص کے پیچھے چل پڑا۔ ہمارے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہا ہو گا اور...... اسی وقت ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔''

''کیسا واقعہ......؟'' میں نے پراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

''وہ شخص چلتے چلتے ایک جھٹکے سے پلٹا اور اس سے پہلے کہ میں اس کی اس حرکت پر غور کر پاتا' اس نے بڑی سرعت سے اپنا ہاتھ میری ناک پر رکھ کر زور سے دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میرے ذہن میں جو خیال ابھرا وہ یہ تھا کہ اس کالے کلوٹے شخص نے ایک تہ شدہ رومال کی مدد سے میری ناک کو دبایا تھا اور وہ رومال یقیناً کلوروفارم یا اسی نوعیت کی کوئی اور بے ہوشی طاری کر دینے والی دوا میں بسا ہوا تھا' جس کے اثرات میری سانس کے ساتھ شامل ہو کر دماغ کے نازک خلیوں تک پہنچے تھے' جس کی وجہ سے میں دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔''

''جب تمہیں ہوش آیا تو تم نے خود کو کہاں پایا؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''مجھے منیر واحدی کے بنگلے کے اندر ہی ہوش آیا تھا'' ملزم نے اپنے سر کے عقبی حصے کو چھوتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں جیسے ہی اردگرد کے ماحول کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے قابل ہوا تو مجھے اپنے سر کے عقبی حصے میں شدید تکلیف کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی چند پولیس

والوں کی شکلیں نظر آئیں' جن میں سے ایک میرے بہت قریب کھڑا تھا۔ اس نے مجھے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا تو مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس کا ایک وزنی ٹھڈا میری پسلیوں میں لگا۔ میں تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی پولیس والے کی چنگھاڑ میری سماعت تک پہنچی۔

''اٹھ اوئے لاٹ صاحب کی اولاد...... بندہ مار کر کیسے آرام سے پڑا ہے۔''

یہ آواز اور میرے ساتھ ہونے والے سلوک سمجھ میں نہ آنے والی باتیں تھیں۔ مجھے تو صرف اتنا یاد تھا کہ منیر واحدی کے لمبو ملازم نے میری ناک پر ایک رومال رکھ کر مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کے بعد کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔ اسی بے خبری کے دوران ہی میرے سر کے عقبی حصے میں کوئی چوٹ بھی لگی تھی یا لگا دی گئی تھی۔ اس تازہ ترین صورت حال نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا اور میں اپنی تکلیف بھول کر فوراً اٹھ بیٹھا اور پولیس والوں کی طرف دیکھتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''کیا ہوا ہے......؟ تم لوگ مجھے کیوں مار رہے ہو؟ میں نے کیا جرم کیا ہے؟ میرے ساتھ تم لوگ جانوروں جیسا سلوک کیوں کر رہے ہو......؟''

میرے ان استفسارات کے جواب میں مجھے جو سلگتی ہوئی معلومات فراہم کی گئیں وہ میرے ہوش اڑانے کے لئے کافی تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ میں ڈکیتی کی نیت سے فضل کریم کے بنگلے میں داخل ہوا تھا۔ میرے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر جب فضل کریم نے مزاحمت شروع کی تو میں نے اپنے پستول سے دو گولیاں چلا کر اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ پھر جب میں بریف کیس لے کر وہاں سے فرار ہو رہا تھا تو مقتول کے گھریلو ملازم نے مجھے روکنے کی کوشش کی اور اسی کوشش کے دوران میں اس نے ایک دھکا دے کر مجھے پیچھے پھینک دیا تھا۔ میں الٹے قدموں نیچے گرا اور میرا سر عقبی جانب سے بیڈ کے کونے سے ٹکرایا۔ یہ چوٹ کافی گہری ثابت ہوئی اور میں وہیں فرش پر بے ہوش ہو گیا۔ بعد ازاں پولیس نے موقع پر پہنچ کر مجھے گرفتار کر لیا تھا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لئے تھما' پھر کندھے اچکاتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔ ''یہ ہے کل کہانی جناب......!''

ملزم کے خاموش ہونے پر میں نے جج کی جانب دیکھا اور خاصے کرارے لہجے میں کہا۔

''یور آنر! ان تمام تر واقعات کی روشنی ہی میں' میں نے کسی گہری سازش کا ذکر کیا تھا۔ میرا

موکل معصوم اور بے گناہ ہے۔ فضل کریم کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اسے خوامخواہ اس کیس میں الجھانے کی کوشش کی گئی ہے' لہٰذا میں ایک مرتبہ پھر معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے موکل کو ضمانت پر رہا کرنے کے احکام صادر کئے جائیں...... دیٹس آل یور آنرز!''

''عدالت قصے کہانیوں پر نہیں' بلکہ ٹھوس حقائق پر یقین رکھتی ہے میرے فاضل دوست!'' وکیل استغاثہ نے میری جانب دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''آپ نے اپنے موکل کو ایک سنسنی خیز کہانی رٹوا کر عدالت کے سامنے جو ڈرامہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے' اس سے ملزم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ عدالت کو ہر واقعے کی تصدیق کے معتبر گواہ اور ٹھوس ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے روئے سخن جج کی جانب موڑا' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''لہٰذا معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو خارج کر کے اس کیس کو جلد از جلد اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کے لئے عدالتی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے۔''

جج نے میرے موکل کی درخواست ضمانت کو مسترد کرتے ہوئے مجھے ہدایت کر دی۔

''وکیل صاحب! آپ آئندہ پیشی پر اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کے لئے ٹھوس ثبوت اور مضبوط دلائل پیش کریں گے۔''

''آل رائٹ سر......!'' میں نے گردن کو تعظیمی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!''

اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ میں اس پیشی پر اپنے موکل کی ضمانت کرانے میں ناکام رہا تھا' لیکن اس طویل پیشی پر وہ تمام تر حقائق اور واقعات ریکارڈ پر آ گئے تھے' جن کا شکار ہو کر میرا موکل اس حال کو پہنچا تھا۔ میں اپنی آج کی کارکردگی سے بے حد مطمئن تھا۔

ہم عدالت سے باہر آئے۔ جمیل صدیقی اور ملک بشیر بھی میرے ہمراہ تھے۔ ملزم کا باپ ملک بشیر مجھے کچھ مایوس سا نظر آیا۔ میرے استفسار پر اس نے بد دلی سے کہا۔

''بیگ صاحب! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔''

''کیا بات نہ ہوئی ملک صاحب؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ آج جاوید کی کم از کم ضمانت تو ہو ہی جائے گی۔'' اس نے اپنی تکلیف بیان کرتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! قتل کے ملزمان کی ضمانت بہت مشکل سے ہوتی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے آج کی عدالتی کارروائی میں جج کے سامنے ایک ممکنہ سازش کو عیاں کر کے مستقبل میں دلائل کا راستہ کھول دیا ہے۔ آپ اسے کوئی معمولی کامیابی نہ سمجھیں۔''

''اور ملک صاحب! آپ دل چھوٹا نہ کریں۔'' جمیل صدیقی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''انشاء اللہ آپ کا بیٹا اس کیس سے باعزت بری ہو جائے گا۔''

''آپ میری محنت اور اللہ کی رحمت پر پورا بھروسہ رکھیں ملک صاحب!'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ محنت اور رحمت آپ کو مایوس نہیں کرے گی۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کیا۔ ''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ اس کیس پر میری گرفت بہت مضبوط ہے۔''

اس کے چہرے کی رنگت اور تاثرات میں مثبت تبدیلی نمودار ہوئی اور میں مطمئن ہو گیا کہ اس نے حوصلے کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

میں نے باری باری جمیل صدیقی اور ملک بشیر سے رخصتی مصافحہ کیا' پھر پارکنگ لاٹ میں کھڑی اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

***

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے مقتول کے گھریلو ملازم اصغر بلوچ کو گواہی کے لئے پیش کیا گیا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے بارے میں ملزم پچھلی پیشی پر عدالت کو بتا چکا تھا کہ اس نے ملزم کی ناک پر رومال رکھ کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ اصغر بلوچ ایک دبلا پتلا' کالا کلوٹا اور مباتڑنگا شخص تھا' جس کے سر کے بال گھونگریالے تھے۔

اصغر بلوچ نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا تو وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے قریب چلا گیا اور اکیوزڈ باکس میں کھڑے میرے موکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"کیاتم اس شخص کو جانتے ہو؟"

"جی ہاں...... یہ میرے صاحب کا قاتل ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ شخص تمہارے صاحب کا قاتل ہے؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

"جناب! میں اس وقت بنگلے کے عقبی حصے میں کام کر رہا تھا کہ میں نے دو گولیاں چلنے کی آواز سنی۔" گواہ نے جواب میں بتانا شروع کیا۔ "میں کام چھوڑ کر اندر کی جانب بھاگا۔ صاحب کے کمرے کی جانب گڑبڑ محسوس کر کے میں فوراً ادھر پہنچا تو اس وقت یہ شخص ایک بریف کیس اٹھائے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں ایک خطرناک گن تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا مشکل نہیں ہوئی کہ اسی شخص نے اپنی گن سے دو فائر کر کے میرے صاحب کی جان لی تھی۔ بس جناب، پھر تو میرا دماغ ہی خراب ہو گیا۔ میں اپنی جان کی پروا کئے بغیر اس سے لپٹ گیا اور اسے وہاں سے فرار ہونے کا موقع نہ دیا۔ ہماری دھینگا مشتی میں یہ شخص میرا دھکا لگنے سے پیچھے کو گرا اور اس کا سر بیڈ کے کونے سے ٹکرا گیا اور...... اور یہ وہیں گر کر بے ہوش گیا تھا۔"

گواہ حقیقت کے برعکس ایک نئی اور من گھڑت کہانی سناتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے متوقف ہوا تو وکیل استغاثہ نے فوراً سوال داغ دیا۔

"جب یہ شخص فرش پر گر کر بے ہوش گیا تو اس کے بعد تم نے کیا، کیا تھا؟"

"میں نے اس کم بخت کو اسی کمرے میں بند کر دیا جہاں صاحب کی لاش پڑی تھی۔" گواہ نے بڑی ڈھٹائی سے، ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "پھر میں بیگم صاحبہ کو اس واقعے کی اطلاع دینے چلا گیا تھا۔"

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد میری باری تھی۔ میں گواہوں والے کٹہرے کے پاس پہنچ گیا اور استغاثہ کے گواہ کو آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں جرح کا آغاز کیا۔

"اصغر بلوچ آپ کی جرأت اور بہادری قابل تعریف ہے۔ اگر آپ نے بروقت ملزم پر ٹوٹ پڑنے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو یہ آسانی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔ کیا میں صحیح کہہ

رہا ہوں؟"

میں نے ایسی بات کی تھی جو اس کے بیان کی تصدیق کرتی تھی لہٰذا اس کے پاس انکار کی گنجائش کہاں، وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"جی ہاں...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

وہ بے چارہ قطعاً یہ نہیں جانتا تھا کہ جب وکیل مخالف دوسرے کی مرضی کی بات کرے تو اس میں اس کی کوئی چال چھپی ہو سکتی ہے۔ میں نے جرح کے سلسلے کو بڑے دھیمے انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جس شائستہ انداز میں اپنے وکیل صاحب کے سوالات کے جوابات دیئے ہیں، اس سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ گھریلو ملازم ہونا آپ کی مجبوری ہے۔" میں نے رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا، پھر اپنی بات ان الفاظ کے ساتھ مکمل کر دیا۔ "ورنہ آپ تو ایک پڑھے لکھے یعنی تعلیم یافتہ انسان ہیں۔"

"جی ہاں۔" اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ "ماشاءاللہ آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے؟"

"جی......" وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ "میں نے دس جماعتیں پاس کر رکھی ہیں"

"دس جماعتیں...... یا...... میٹرک؟" میں نے اسے گڑبڑانے کی غرض سے کہا۔

"جناب! میری تو بڑی شدت سے یہی خواہش تھی کہ میٹرک کروں، لیکن گھریلو حالات نے اس کی اجازت نہیں دی۔" وہ مسکین صورت بنا کر بولا۔ "بس، دس جماعتوں سے آگے پڑھائی جاری نہ رکھ سکا۔"

ادھر اس کی بات ختم ہوئی، ادھر عدالت کے کمرے میں لوگوں کی ہنسی کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ گواہ کے احمقانہ جواب نے یقیناً حاضرین عدالت کو بہت "محظوظ" کیا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وہ میری اس معصومانہ چوٹ پر بڑے خونخوار انداز میں مجھے ہی گھور رہا تھا۔ لامحالہ میرے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

وکیل استغاثہ نے صدائے احتجاج بلند کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کی اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے چیخ سے مشابہ لہجے میں پکارا۔ "آبجیکشن یور آنر!"

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "وکیل صاحب! اپنے

اعتراض کی وضاحت فرمائیں۔''

''جناب عالی! میرے فاضل دوست' گواہ سے بچوں والے سوالات پوچھ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔'' وکیل استغاثہ نے برہمی بھرے انداز میں وضاحت کی۔''زیر سماعت کیس کا تعلق قتل اور ڈکیتی کی واردات سے ہے۔ اس میں گواہ کی تعلیم و تربیت کی بحث کہاں سے آ گئی......؟''

''تعلیم نہ سہی مگر تربیت پر بحث تو کرنا پڑے گی میرے فاضل دوست!'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''ملک یہی ہے کہ......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''استغاثہ کے گواہ اصغر بلوچ کو جھوٹ بولنے کی ٹریننگ......یعنی تربیت دی گئی ہے۔''

''یور آنر! میرے فاضل دوست......''

''جناب عالی!'' میں نے وکیل استغاثہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی زوردار آواز میں کہا۔''اس وقت ایک نہایت ہی اہم مقدمہ زیر سماعت ہے......قتل کا مقدمہ...... جو کہ میرے موکل کے لئے زندگی اور موت کا معاملہ ہے' لہٰذا گواہ کا سچا' ایماندار اور معتبر ہونا لازمی ہے۔ کسی بھی دس جماعتیں پاس شخص کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ وہ میٹرک پاس بھی ہے' جبکہ استغاثہ کے گواہ نے تھوڑی دیر پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں اپنے گھریلو حالات کی مجبوری کا رونا روتے ہوئے جن ''زریں'' خیالات کا اظہار فرمایا ہے' وہ اس کے دروغ گو ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ قتل کے ایک انتہائی اہم گواہ کو یہ بھی پتا نہیں کہ میٹرک اور دس جماعتیں پاس ہونا ایک ہی بات ہے۔ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ شاید استغاثہ کے گواہ کو بیان رٹوانے میں کوئی کمی چھوڑ دی تھی جو اس قسم کی صورت حال سامنے آ رہی ہے۔''

''آبجیکشن اوور رولڈ......'' جج نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔''بیگ صاحب! پلیز کنٹی نیو......''

میں دوبارہ استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس مرتبہ میرے لہجے میں ''آپ جناب'' کا لحاظ باقی نہیں رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں سوال

کیا۔

''تمہیں مقتول کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا تھا؟''

''جی......'' اب اس کی آواز میں گھبراہٹ شامل ہو چکی تھی۔''

''چند ماہ سے......''

''چند ماہ......مطلب کتنے ماہ سے؟'' میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''یہی کوئی چار پانچ ماہ سے......''

''مقتول کے بنگلے پر تمہاری تقرری کیسے ہوئی تھی؟''

''جی' میں کچھ سمجھا نہیں۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ مقتول نے تمہیں کسی کی سفارش پر اپنے ہاں ملازم رکھا تھا یا تم یونہی گھومتے پھرتے اس کے بنگلے پر پہنچ گئے تھے؟''

''آفتاب میرانی صاحب نے میری سفارش کی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''آفتاب میرانی!'' میں نے ایک لمحہ سوچنے کی اداکاری کی' پھر اپنی تحقیق سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کہا۔''کہیں یہ وہی صاحب تو نہیں ہیں' مقتول نے جنہیں اپنا منیجر بنا رکھا تھا؟''

''جی سر......میں انہی کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے ترت جواب دیا۔

میں نے زاویہ سوالات کو اچانک تبدیل کر دیا اور گواہ سے سوال کیا۔''وقوعہ کی رات تم بنگلے کے عقبی حصے میں کسی کام میں مصروف تھے تو تم نے فائرنگ کی آواز سنی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''نہیں جناب' آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''کیا تم معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کرو گے کہ وقوعہ کی رات بنگلے کے عقبی حصے میں کیا کر رہے تھے......؟''

''میں پانی والی موٹر کو دیکھ رہا تھا۔''

''دیکھ رہا تھا' مطلب......گھور رہا تھا؟''

''نہیں جناب!'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔''میں موٹر کو ٹھیک کر رہا تھا۔''

''ویری گڈ!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔''گویا تم موٹر میکینک بھی ہو؟''

"موٹر میکینک تو نہیں ہوں' لیکن دیکھ بھال کے چھوٹے موٹے کام ضرور کر لیتا ہوں۔" وہ قدرے سنبھل کر بولا۔

"ہمارے بنگلے کی موٹر میں ایئر لاک کا مسئلہ تھا۔ پچھلے دنوں پلمبر اسے ٹھیک کر کے گیا تھا اور مجھے ایئر لاک نکالنے کی ایک ترکیب بھی بتا گیا تھا۔ یہ کام نہایت ہی سادا اور آسان تھا' لہٰذا بہ وقت ضرورت میں خود ہی یہ کام کر لیا کرتا تھا۔"

"یہ وہی ٹیکنیک ہے نا......" میں نے اسے چکر میں لاتے ہوئے کہا۔ "جس میں موٹر کے اوپر لگا ہوا ایک نٹ بولٹ کھول کر ایئر لاک کو ختم کیا جاتا ہے......؟"

"جی ہاں۔" وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "بالکل وہی۔"

"جب تم نے بنگلے کے اندرونی حصے میں گولیاں چلنے کی آواز سنی تو اس وقت تم موٹر کے نٹ بولٹ کے ساتھ مصروف تھے؟"

"جی ہاں......"

"اور نٹ بولٹ کھولنے والا پانا تمہارے ہاتھ میں تھا؟"

"جی بالکل۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"فائرنگ کی آواز سن کر تم نے بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب دوڑ لگا دی اور پانے سمیت اپنے صاحب کے کمرے میں پہنچ گئے؟" میں نے جرح کے سلسلے میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر سر کو اثباتی جنبش دی۔

میں نے پوچھا۔ "جب تم اپنے صاحب کے کمرے میں پہنچے تو اس وقت ملزم وہاں کیا کر رہا تھا؟"

"وہ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش میں تھا۔"

"اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔" میں نے اپنے پھیلائے ہوئے جال کو رفتہ رفتہ سمیٹنا شروع کیا۔ "اور تمہارے صاحب کمرے کے فرش پر پڑے تھے' ہیں نا......؟"

"جی ہاں' یہی صورت حال تھی۔" وہ وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"پھر تم نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملزم پر حملہ کر دیا۔" میں نے بڑی

سرعت سے کہا۔ "تم نے گھما کر پانا اس کے سر کے عقبی حصے پر رسید کیا تو وہ وہیں تیورا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا؟"

"جی ہاں......" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا' لیکن فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور جلدی سے بولا۔ "نہیں جناب! یہ تو بیڈ کا کونا لگنے سے بے ہوش ہوا تھا۔"

"یعنی' اس کی بے ہوشی میں تمہارے پانے کا کوئی کمال نہیں تھا۔"

"جی' بالکل نہیں۔" وہ قطعیت سے بولا۔

"تو گویا پانے کی ضرب سے نہیں' بلکہ تم نے کلوروفارم والا رومال سونگھا کر ملزم کو بے ہوش کیا تھا؟" میں نے استغاثہ کے گواہ کو تیز نظر سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

گواہ بے بسی کی تصویر بن کر اپنے وکیل کی طرف دیکھنے لگا۔ وکیل استغاثہ اس کی امداد طلب نگاہ پر تڑپ اٹھا' اگلے ہی لمحے اس نے بہ آواز بلند اعتراض جڑ دیا۔

"آبجیکشن یور آنر!" اس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"گواہ اپنے بیان میں تفصیل سے اس امر کی وضاحت کر چکا ہے کہ جب وہ فائرنگ کی آواز سن کر مقتول کے کمرے میں پہنچا تو ملزم وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے چھینا جھپٹی کے دوران میں ملزم کو زور کا دھکا لگا اور وہ بیڈ کے کونے سے ٹکرانے کے بعد فرش پر جا گرا۔ بیڈ کے کونے سے اس کے سر میں چوٹ لگی اور وہ فرش پر گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔" وہ لمحے بھر کو تھما پھر اپنا احتجاج مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"وکیل صفائی استغاثہ کے معزز گواہ کو' الٹے سیدھے سوالات کے ذریعے خوانخواہ ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ تو سراسر زیادتی والی بات ہے۔"

اب تک کی عدالتی کارروائی سے جو صورت حال ابھر کر سامنے آئی تھی' وہ دلچسپ ہونے کے علاوہ قابل غور بھی تھی۔ لہٰذا عدالت کی توجہ من جملہ امور پر ایک جیسی تھی' چنانچہ جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا حکم دیا۔

"بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ......!"

میں ایک مرتبہ پھر استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس کے چہرے پر نظر گاڑ کر تیز لہجے میں سوال کیا۔ "تمہارے بیان کے مطابق ملزم کے بے ہوش ہونے پر تم نے اس کمرے کو لاک کر دیا اور بیگم صاحبہ کو اس واقعے کی اطلاع دینے چلے گئے۔ میں ٹھیک کہہ رہا

ہوں نا......؟''

''جی' آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔'' میں بیگم صاحبہ کو اس سانحے کی اطلاع دینے چلا گیا تھا۔''

''کون سا سانحہ؟'' میں نے پوچھا۔

''جی' کیا مطلب؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

''مطلب یہ کہ تم نے بیگم صاحبہ کو کیا بتایا تھا؟''

''میں نے انہیں بتایا کہ ایک ڈکیت نے صاحب جی کو قتل کر دیا ہے۔''

''تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ تمہارے صاحب جی قتل ہو چکے تھے؟''

''میں نے بیڈروم کے فرش پر ان کی لاش پڑی دیکھی تھی۔'' گواہ نے جواب دیا۔''ان کا جسم خون میں لت پت تھا۔''

''خون میں لت پت تو کوئی شدید زخمی شخص بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔'' کیا تم نے مقتول کے بدن کو ہلا جلا کر دیکھا تھا کہ وہ مر چکا ہے یا گہری بے ہوشی میں ہے؟''

''نہیں جناب' میں نے صاحب کے بدن کو چھوا تک نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔'' ان کی سانس نہیں چل رہی تھی اور جسم میں سے بہت زیادہ خون نکل کر کمرے کے فرش پر جمع ہو چکا تھا لہٰذا میں نے سمجھ لیا کہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے۔''

''تم بیگم صاحبہ کو اس واقعے کی اطلاع دینے کہاں گئے تھے؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہاری بیگم صاحبہ اس وقت بنگلے پر نہیں تھیں......؟''

''جی' وہ اپنے بیوٹی پارلر پر تھیں۔'' گواہ نے بتایا۔''ان کے بنگلے سے تھوڑے فاصلے پر ہی ان کا بیوٹی پارلر واقع ہے۔''

''کیا تمہاری بیگم صاحبہ بیوٹیشن ہیں؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ سے تمہاری مراد مقتول کی بیوی ہی ہے نا؟''

''ظاہر ہے......'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔'' جب مقتول میرے صاحب جی تھے تو ان کی بیوی ہی میری بیگم صاحبہ ہوں گی نا۔''

''تمہاری بیگم صاحبہ کا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''عائشہ کریم......'' اس نے جواب دیا۔

''تو تمہاری بات سنتے ہی عائشہ کریم بیوٹی پارلر سے بنگلے پر آ گئی تھی؟''

''جی ہاں' ایسا ہی ہوا تھا'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔''انہوں نے اپنے عملے کو بیوٹی ارلر بند کرنے کی ہدایات دیں اور میرے ساتھ بنگلے پر آ گئیں۔''

''ہم تھوڑا پیچھے کی طرف چلتے ہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

اس نے یک بیک پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا۔

''ارے نہیں یار! میں قدموں سے چلنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' میں نے تمسخرانہ داز میں کہا۔'' میں واقعات کو تھوڑا ری وائنڈ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کام میں تم میرا ساتھ دو ے نا......؟''

گواہ کے پلٹ کر پیچھے دیکھنے پر عدالت کے کمرے میں ایک ساتھ کئی افراد کی ہنسی د ہوئی تھی اور لوگ آپس میں چہ مگوئیاں بھی کرنے لگے تھے۔ اس صورتحال نے اصغر بلوچ کو ھلا کر رکھ دیا تھا۔ ایسا ایک مرتبہ پہلے بھی ہوا تھا جب گواہ نے ان خیالات کا اظہار کیا تھا کہ دس جماعتیں تو پاس کر چکا ہے' لیکن میٹرک کرنے کی حسرت اب بھی اس کے دل میں جزن ہے۔

گواہ نے خجالت آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔''جی پوچھیں' آپ کیا پوچھنا چاہتے ؟''

میں نے پوچھا۔''اصغر بلوچ! تم نے پہلے پولیس کو اور بعد ازاں معزز عدالت کے منے یہ بیان دیا ہے کہ وقوعہ کی رات جب تم فائرنگ کی آواز سن کر بنگلے کے اندرونی حصے کی ب لپکے اور تم نے مقتول کے بیڈروم میں قدم رکھا تو ملزم ایک بریف کیس کے ساتھ وہاں فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ تم نے مذکورہ بریف کیس کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ رے صاحب جی یعنی مقتول کا ہے۔ ایٹ دا سیم ٹائم......تم نے مقتول کو خون میں لت پت ے کے فرش پر پڑے بھی دیکھا۔ تمہیں یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس ی ہوئی کہ ملزم تمہارے صاحب جی کو قتل کرنے کے بعد' ان کے بریف کیس کے ساتھ ئے وقوعہ سے فرار ہو رہا ہے۔ ایم آئی رائٹ؟''

اس نے میرے بیان کی تصدیق میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تو میں نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس موقع پر تم نے نمک حلال کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی جان کی پروا کئے بغیر ملزم پر جھپٹ پڑے، جس کے نتیجے میں ملزم کا سر بیڈ کے پائے سے یا بیڈ کے کونے سے ٹکرایا اور یہ وہیں گر کر بے ہوش گیا۔ تم نے یہی بیان دیا ہے نا؟''

''جی ہاں' میں نے یہی بیان دیا ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''کیونکہ حالات اسی انداز میں پیش آئے تھے۔''

''جب تمہارا دھکا کھا کر اور بیڈ کے کونے کی چوٹ سہہ کر ملزم بے ہوش ہو گیا تو پستول اور بریف کیس کا کیا بنا تھا.....؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''جی کیا مطلب.....'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا.....؟''

''میں ابھی سمجھاتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جب تم نے پہلی مرتبہ ملزم کو دیکھا تو اس کے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ تمہارا خطرناک اور زوردار دھکا لگنے سے وہ زمین بوس ہو گیا۔ میرا سوال تم سے یہ ہے کہ کیا بے ہوش ہونے کے بعد بھی پستول اور بریف کیس اس کے ہاتھوں ہی میں رہے تھے.....؟''

''نہیں جناب!'' وہ اپنی گردن کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ دونوں چیزیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھیں۔''

''چھوٹ کر کہاں گری تھیں؟''

''بریف کیس تو صاحب کی لاش کے قریب ہی فرش پر گرا تھا۔'' گواہ نے بتایا۔ ''جبکہ پستول پھسل کر دور ایک کونے میں چلا گیا تھا۔''

''لیکن پولیس جب موقع پر پہنچی تو یہ دونوں چیزیں تو بیڈ پر رکھی ہوئی تھیں؟'' میں نے تیز نظر سے استغاثہ کے گواہ کو گھورا۔

''میں نے..... انہیں اٹھا کر بیڈ پر..... رکھ دیا تھا.....'' وہ ہچکچاہٹ بھرے انداز میں جواب دے کر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھنے لگا۔

میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔ ''اصغر بلوچ! وقوعہ چھبیس اگست کی رات کو پیش آیا

تھا۔ اس رات اچھی خاصی گرمی ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود بھی تم.....''

''جی..... میں..... کیا.....؟'' وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اس رات گرمی تھی یا نہیں؟'' میں نے اس کی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی بہت گرمی تھی۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''موٹر کا کام کرتے ہوئے میں پسینے میں نہا گیا تھا۔''

''اس کے باوجود بھی تم نے دستانے پہن رکھے تھے.....؟'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''بالکل نہیں جناب.....!'' وہ قطعیت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ سے کس نے کہا کہ میں نے اس وقت دستانے پہن رکھے تھے؟''

''بتانے والے نے اپنا نام صیغہ راز میں رکھنے کی درخواست کی ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اگر تم اس حقیقت سے انکار کرتے ہو تو میں اگلی پیشی پر اس شخص کو گواہی کے لئے عدالت میں پیش کر دوں گا۔''

''آپ لائیں اسے عدالت میں۔'' وہ خاصے جوش بھرے انداز میں بولا۔ ''میں بھی تو دیکھوں کہ اتنا بڑا جھوٹ بولنے والا آخر ہے کون.....؟''

''یہ تو..... الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے..... والی بات ہو جائے گی۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ پھر پوچھا۔ ''موٹر کا کام کرتے وقت تم نے دستانے نہیں پہن رکھے تھے؟''

''بالکل نہیں..... میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے ذومعنی لہجے میں کہا۔ ''اگر اسی سے تم نے پیٹ بھر لیا تو جیل کی ہوا کیسے کھاؤ گے؟''

''جی..... جیل.....؟'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

میں نے پوچھا۔ ''اگر تم نے موٹر کا کام کرتے وقت دستانے نہیں پہن رکھے تھے تو اس وقت بھی تمہارے ہاتھوں پر دستانے نہیں ہوں گے جب فائرنگ کی آواز سن کر تم دوڑتے ہوئے مقتول کے کمرے میں پہنچے تھے.....؟''

''جی..... نہیں تھے دستانے.....'' وہ بیزاری سے بولا۔

''اور جب تم نے دھکا دے کر ملزم کو نیچے گرایا تو اس وقت بھی تمہارے ہاتھ دستانوں

سے خالی ہی ہوں گے؟''

''آپ دستانوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہیں۔'' وہ زچ ہو کر بولا۔ ''بابا! بار میں نے کہہ دیا نا کہ میں نے دستانے نہیں پہن رکھے تھے' پھر بار بار آپ ایک ہی سو کیوں کر رہے ہیں؟''

''دستانوں کے استعمال' والی میری تکرار نے وکیل استغاثہ کو بھی بوکھلا کر رکھ دیا۔ اس موقعے پر وہ اپنے گواہ کی مدد کو لپکا۔

''آبجیکشن یور آنر!'' اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔

''وکیل صفائی دستانوں کا فضول ذکر کر کے استغاثہ کے معزز گواہ کو ذہنی اذیت رہے ہیں۔ یہ انصاف کے اصولوں کے منافی ہے۔ آخر گواہ کے بھی کچھ حقوق ہیں۔''

''عدالت میں آنے والے ہر شخص کے مخصوص حقوق ہوتے ہیں۔'' میں نے وکیل کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''اگر آپ کا گواہ دستانوں کے ذکر سے ذہنی اذیت میں مبتلا ہو رہا ہے تو اس اذیت بھی ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کریں جو اس جھوٹے اور بوگس مقدمے کی وجہ سے ملزم اور اس کے لواحقین کو اٹھانا پڑ رہی ہے......؟''

''آپ اس کیس کو جھوٹا اور بوگس نہ کہیں......'' وہ تلملا کر بولا۔ ''آلہ قتل ا مسروقہ بریف کیس پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔''

''آپ بھی دستانوں کے ذکر کو فضول نہ کہیں میرے فاضل دوست!'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''کیونکہ آلہ قتل اور مسروقہ بریف کیس پر استغاثہ کے معزز گواہ اصغر بلوچ کے فنگر پرنٹس کا کوئی ریکارڈ نہیں آ رہا۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا......؟'' وہ برہمی سے بولا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ......'' میں نے متحمل لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ''اگر اس رات گواہ اصغر بلوچ نے دستانے نہیں پہن رکھے تھے تو پھر آلہ قتل اور مسروقہ بریف کیس پر اس کی انگلیوں کے نشانات ثبت کیوں نہیں ہوئے۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے روبرو یہ اقرار کیا ہے کہ ملزم کو کمرے میں بند کرنے سے پہلے اس نے آلہ قتل اور مسروقہ بریف کیس کو خود اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر مقتول کے بیڈ پر رکھا تھا۔ اس کے بعد یہ بیگم صاحبہ کو اس

کی اطلاع دینے گیا تھا......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر طنزیہ لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے وکیل استغاثہ سے کہا۔

''کچھ آیا سمجھ شریف میں جناب کی......؟''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

***

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں مقتول کی بیوہ عائشہ کریم کھڑی تھی۔ وہ ایک خوبصورت اور طرح دار عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچیس اور تیس کے درمیان قائم کیا' جبکہ میرے ریکارڈ کے مطابق مقتول فضل کریم اپنی موت کے وقت ساٹھ اور پینسٹھ کے بیچ کہیں جھول رہا تھا۔ بلاشبہ اس عمری تفاوت کی روشنی میں یہ ایک بے جوڑ جوڑا تھا۔

عائشہ کریم نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرانے کے بعد وکیل استغاثہ کے چند سوالات کے جوابات دیئے پھر میں اپنی باری پر جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ اب عائشہ کریم کو میری جرح کا سامنا کرنا تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور استغاثہ کی گواہ یعنی مقتول کی بیوہ عائشہ کریم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''جس وقت آپ کے شوہر کو حادثہ پیش آیا' ان لمحات میں آپ کیا کر رہی تھیں؟''

''میں اپنے بیوٹی پارلر میں تھی۔''

اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''آپ کو اس سانحے کی اطلاع گھریلو ملازم اصغر بلوچ نے دی تھی؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے پوچھا۔

''حادثے کے وقت مقتول اور گھریلو ملازم کے علاوہ کوئی اور ذی نفس بنگلے میں موجود تھا؟''

''جی...... کیا موجود تھا......؟''

میں نے سادہ زبان میں ''ذی نفس'' کی تشریح کر دی۔ وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''نہیں جناب! بس وہی دونوں بنگلے میں تھے اور کوئی نہیں تھا۔''

''کیا آپ لوگ اتنے ہی بہادر اور نڈر ہیں کہ آپ نے اپنے بنگلے پر کوئی چوکیدار وغیرہ رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''چوکیدار تو ہم نے رکھا ہوا ہے۔'' وہ سنبھل کر بولی۔ ''لیکن اتفاق سے ان دنوں وہ چھٹی پر اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔''

''وہ چھٹی پر گاؤں گیا ہوا ہے......'' میں نے اس دوران میں اس کیس کے مختلف کرداروں پر اچھی خاصی ریسرچ بھی کر ڈالی تھی' جس سے حاصل ہونے والی مفید معلومات اس وقت میرے کام آ رہی تھیں۔

''عائشہ کریم صاحبہ!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح کے سلسلے کو دراز کیا۔ ''استغاثہ کے ایک اہم گواہ اور آپ کے گھریلو ملازم اصغر بلوچ نے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ اسے آفتاب میرانی کی سفارش پر نوکری دی گئی تھی۔ کیا یہ بات درست ہے؟''

''جی ہاں...... یہ بات درست ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا آفتاب میرانی آپ کے بھروسے کا آدمی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آفتاب میرانی بھروسے کا بندہ ہے جبھی تو فضل کریم نے اسے اپنا منیجر بنا رکھا تھا۔'' وہ سرسری سے لہجے میں بولی۔

''میں مقتول کے بھروسے کی بات نہیں کر رہا۔'' میں نے ذو معنی انداز میں کہا۔

''پھر......؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''میرا اشارہ آپ کے بھروسے کی طرف ہے......''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

وہ بگڑ کر بولی۔

''مطلب تو آپ بہ خوبی سمجھ رہی ہیں' مگر جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کر رہی ہیں۔'' میں نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں یہ بات عدالت میں ثابت کر سکتا ہوں کہ آفتاب میرانی کا آپ کے ساتھ کوئی کنکشن ہے جو مقتول کے علم میں نہیں تھا۔''

''پتا نہیں' آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

اس کے بعد آفتاب میرانی کے حوالے سے میرے سوالات میں تیزی اور تندی آتی چلی

گئی۔ عائشہ کریم بری طرح بوکھلا کر رہ گئی تھی اور اسی بوکھلاہٹ میں اس کی زبان سے چند ایسے جملے ادا ہوئے جو میرے موقف کی تائید اور استغاثہ کی مخالفت میں اس امر کو ثابت کرتے تھے کہ آفتاب میرانی اور مقتول کی بیوہ عائشہ کریم کے بیچ ایسے معاملات چل رہے تھے' جن کے نتیجے میں ان دونوں نے ایک گہری سازش کے تحت' فضل کریم کو نہایت ہی صفائی کے ساتھ اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے ایک سازش تیار کی تھی اور اس سازش میں اصغر بلوچ نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

عدالت نے آئندہ پیشی پر آفتاب میرانی کو حاضر عدالت کرنے کا حکم دینے کے ساتھ ہی اصغر بلوچ کو بھی پولیس کے حوالے کرنے کے احکامات صادر کر دیئے اور دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

اگلی پیشی پر آفتاب میرانی عدالت میں حاضر نہیں ہوا۔ اس کی تلاش میں عدالت کے سخت احکامات پر جب پولیس نے جگہ جگہ چھاپے مارے تو بالآخر وہ گرفت میں آ ہی گیا اور جب پولیس نے آفتاب میرانی کو عدالت میں پیش کیا تو کیس کا پانسا مکمل طور پر میرے موکل کے حق میں پلٹ گیا۔

اب تک کی عدالتی کارروائی کے نتیجے میں جج کو اپنے موکل کے حق میں ہموار کر چکا تھا۔ اس سلسلے میں اصغر بلوچ کے ''دستانوں'' والا قصہ ہی کافی تھا۔ پھر جب عائشہ کریم اور آفتاب میرانی کا ''ایشو'' سامنے آیا تو میرے موکل کی بے گناہی مزید واضح ہو گئی......اور جب آفتاب میرانی کو عدالت میں پیش کیا گیا تو ملزم چلا اٹھا۔ اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو میر واحدی ہے جو وقوعہ کی رات' میرے گھنٹی بجانے پر بنگلے سے باہر آیا تھا اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد مجھے بنگلے کے اندر لے گیا تھا۔''

''گھنی مونچھوں والے' دراز قامت' گورے چٹے اور تاثر انگیز شخصیت کے مالک آفتاب میرانی کے پاس فرار کی کوئی راہ نہیں بچی تھی۔ لہٰذا اس نے اقبال جرم ہی میں عافیت جانی۔

***

آئندہ پیشی پر عدالت نے' دونوں وکلاء کی فائنل جرح کی روشنی میں میرے موکل اور اس کیس کے ملزم جاوید کو باعزت بری کر دیا۔ وہ بے چارہ پردیسی بے گناہ تھا۔ عائشہ کریم نے اصغر بلوچ اور آفتاب میرانی کے تعاون سے جو مجرمانہ سازش تیار کی تھی' اس کا سارا بوجھ بدقسمتی

سے میرے موکل کی گردن پر آ گیا تھا۔

مجرمانہ ذہن رکھنے والے تمام کردار عدالت سے سزا پا کر جیل چلے گئے اور انہوں نے جس معصوم کو قربانی کا بکرا بنانے کی سازش بنی تھی' وہ خوشی خوشی اور باعزت اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ انسان اگر ایک لمحے کے لئے یہ سوچ لے کہ جو گڑھا وہ دوسروں کے لئے کھود رہا ہے' اس میں وہ خود بھی گر سکتا ہے......تو میں پوری ذمے داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس دنیا میں ستر فیصد جرائم خودبخود صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے۔

کاش......اے کاش!......ہم ایسا سوچنے کے بارے ہی میں سوچ لیں۔

***

نرم چارا

اس روز میرا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ ریسٹورنٹ میں لنچ کرتے ہوئے ایک بے ہودہ شخص سے اچھی خاصی گرما گرمی ہو گئی تھی۔ میں عدالتی بکھیڑوں کو نمٹانے کے بعد سٹی کورٹ کے نزدیک ہی واقع ایک ریسٹورنٹ میں لنچ کیا کرتا تھا۔ برسوں سے میرا یہ معمول تھا کہ لنچ کے بعد میں اپنے دفتر میں بیٹھ جاتا تھا جو کہ ریسٹورنٹ کے قریب ہی ایک کثیر المنزلہ عمارت میں تھا' لیکن اس روز بہت کچھ معمول سے ہٹ کر پیش آیا تھا۔

میں ریسٹورنٹ میں بیٹھا لنچ کر رہا تھا کہ مجھے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا مخصوص دباؤ محسوس ہوا۔ پہلے میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ وہ میرا کوئی شناسا یا بے تکلف دوست ہوگا' لیکن اگلے ہی لمحے مجھے اپنے خیال کی تردید کرنا پڑی۔

میں نے ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر اپنے عقب میں دیکھا اور مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک ایسا شخص میری نگاہ کے سامنے تھا' جسے دیکھ کر جی متلانے لگا۔ میرے اچانک پلٹ کر دیکھنے پر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ گندا شخص' صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں کیسے گھس آیا تھا۔

اس قسم کے لوگ آپ نے بھی دیکھ رکھے ہوں گے۔ بے ڈھنگے' میلے کچیلے اور بدبو سے فضا کو آلود کرتے ہوئے۔ میرے متوجہ ہونے پر اس نامعقول شخص نے اپنا غلیظ ہاتھ آگے بڑھایا اور بڑے دھڑلے سے بولا۔

''پچاس روپے کا سوال ہے بابو......''

اس کا انداز بھیک مانگنے والا نہیں بلکہ غنڈہ ٹیکس وصول کرنے کا سا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے آواز لگائی۔ ''ویٹر!''

"ویٹر کو کیوں بلایا ہے بابو......؟" وہ اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"پچاس روپے ویٹر تو نہیں دے گا...... میں نے تجھ سے مانگے ہیں۔"

اس غلیظ بھکاری کا یہ تمیزی بھرا انداز میرے لئے ذہنی کوفت کا سامان پیدا کر رہا تھا۔ تاہم میری پکار پر دو ویٹرز دوڑتے ہوئے آئے اور ڈانٹ ڈپٹ کر اس شخص کو ریسٹورنٹ سے نکل جانے کے لئے کہنے لگے۔ ویٹرز کی یہ کوشش زبانی کلامی اظہار خفگی تک محدود تھی' کوئی بھی اسے بازو سے تھام کر باہر کی راہ دکھانے کی ہمت نہیں کر رہا تھا اور وہ تو جیسے ریسٹورنٹ کے فلور کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔

اس کا تقاضا بردار ہاتھ ابھی تک میرے سامنے دراز تھا۔ گویا وہ اس عزم کے ساتھ میرے پاس آیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے' خالی ہاتھ واپس نہیں جائے گا۔ اس کی کھلم کھلا ڈھٹائی کو دیکھ کر مجھے غصہ آنے لگا اور میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

"تم جاتے ہو یہاں سے کہ میں پولیس کو بلاؤں......"

"جس کی جیب سے پچاس روپے نہیں نکل رہے' اس کے کہنے پر پولیس کیا آئے گی؟"

وہ میری دھمکی کے جواب میں عجیب استہزائیہ انداز میں بولا۔ "بڑا وکیل بنتا ہے...... بس دوسروں کی :ب سے ہی نکلوانا سیکھا ہے۔ اپنا مال نکالتے ہوئے دیکھو...... کیسے موت آ رہی ہے۔"

ریسٹورنٹ میں موجود تمام افراد ہماری طرف متوجہ ہو چکے تھے' جن میں نصف کے قریب تعداد وکلاء برادری کی تھی۔ اس واقعے پر ان کا رجحان ملا جلا تھا۔ جو میرے خیر خواہ تھے اور میرے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھتے تھے' وہ حیران اور پریشان تھے کہ بیگ صاحب کے ہتھے یہ کیسی بلا لگی ہے' لیکن وہیں پر چند بدخواہ بھی موجود تھے' جو بڑے محظوظ کن انداز میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس بدمزہ اور کریہہ واقعے سے ان کے دلوں میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ انسان کے جہاں دس دوست ہوتے ہیں' وہاں ایک آدھ دشمن کی موجودگی بھی لازمی بات ہے اور یہی دشمن ہم پیشہ اس وقت کھی کھی کی آوازیں نکال کر میرا تمسخر اڑا رہے تھے' تاہم مجھے ان کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

بالآخر ویٹرز نے ہمت دکھانے کا فیصلہ کر ہی لیا اور اس غنڈہ صفت بھکاری کو بزور بازو

دھکیل اور کھینچ کر ریسٹورنٹ سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اشارے سے ویٹر کو اپنے پاس بلا کر خفگی آمیز لہجے میں کہا۔

"جلدی سے بل لے آؤ......"

ایک طرف سے آواز ائی۔ "ان مسٹنڈوں کی دیدہ دلیری دیکھو کیسے منہ اٹھا کر اندر گھس آتے ہیں۔"

"ریسٹورنٹس کے باہر تو ایسے میلے کچیلے بدبودار لوگوں کو قطار بنائے کھانے کے انتظار میں بیٹھے دیکھا ہے' لیکن اس بدمعاش نے جس جرأت مندی کا مظاہرہ کیا ہے' وہ حیران کن ہے۔"

"اللہ پتا نہیں' کس کس رنگ اور بھیس میں انسان کے سامنے آ جاتا ہے۔" یہ آواز میرے عقب میں ابھری تھی۔ "کسی مجذوب کو یوں دھتکارنا بہت بڑا گناہ ہے۔"

"دھتکارنا تو بہت دور کی بات ہے۔" کسی نے بڑے سنجیدہ انداز میں تبصرہ کیا۔ "یہاں تو اس بے چارے فقیر کو اٹھا کر باہر پھنکوا دیا گیا ہے۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا' ان فکر انگیز تبصرہ نگاروں میں ایک میری برادری کا بندہ تھا اور ان دنوں اس سے میری کشیدگی چل رہی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ بڑے بے ہودہ انداز میں مسکرایا' پھر اپنے ہم خیال ساتھی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"اللہ رحم کرے...... اس بے چارے مجذوب کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی بھائی۔"

میرے جی میں تو آئی کہ اپنے اس بدخواہ ہم پیشہ سے کہوں کہ میں نے تو مجذوب کے ساتھ سنگین زیادتی کر ڈالی ہے۔ اب آپ اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر لے جاؤ اور ایک بیڈ روم میں مقیم کر لو۔ اللہ والوں کی صحبت میں تمہاری دنیا اور آخرت خوب سنور جائے گی' لیکن میں غصے کو پی گیا۔ ایسے سخت جواب کا مطلب یہ ہوتا کہ میں اعصابی طور پر بہت کمزور ہوں۔ میں نے اس ہم پیشہ بدخواہ سے کسی اور انداز میں نمٹنے کا فیصلہ کیا اور جانے کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحے پہلے میں نے ویٹر کو بل لانے کے لئے کہا تھا۔ ادھر سے ریسٹورنٹ کا مالک میرے پاس آ گیا۔ وہ اس واقعے پر افسوس کرتے ہوئے بولا۔

"یہ جو کچھ بھی ہوا ہے، مجھے اس کا بہت دکھ ہے۔ آپ بیٹھیں سر! میں آپ کے لئے دوبارہ کھانا چنواتا ہوں۔"

"رہنے دیں جناب!" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "اس زحمت کی کوئی ضرورت نہیں۔ کھانے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا۔ آپ اپنا بل لے لیں اور مجھے جانے دیں۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے ہپ پاکٹ میں سے اپنا والٹ نکال لیا' لیکن اس سے پہلے کہ میں بٹوے کو کھول کر کھانے کی ادائیگی کرتا' ریسٹورنٹ کا مالک کم منیجر بڑی قطعیت سے بولا۔ اس کا ایک ہاتھ منع کرنے والے انداز میں میری جانب اٹھا ہوا تھا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب......"

"کس چیز کا سوال پیدا نہیں ہوتا؟" میں نے حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بل کا!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "اگر آپ یہاں بیٹھ کر دوبارہ کھانا کھائیں گے تو میں آپ سے بل وصول کروں گا' ورنہ آپ کو ادائیگی کے بغیر ہی جانا ہوگا۔ میں ایک بار پھر آپ سے معذرت خواہ ہوں۔"

دوبارہ بیٹھ کر کھانے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا تھا' لہٰذا میں ہوٹل کے منیجر سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوگیا۔

"ٹھیک ہے جناب! ابھی تو میں جا رہا ہوں۔ اس موضوع پر ہم کل بات کریں گے۔"

ریسٹورنٹ سے نکل کر اپنے آفس کی طرف آتے ہوئے میں اسی بدمزہ واقعے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسی سوچ بچار کے دوران میں میرے ذہن میں ایک چمک سی پیدا ہوئی' کہیں کسی نے اس بدبودار اور بدہیئت بھکاری کو دانستہ تو میرے پاس نہیں بھیجا تھا' تاکہ بھرے ہوئے ریسٹورنٹ میں مجھے تماشا بنایا جا سکے؟

اس خطرناک سوال کے ساتھ ہی متعلقہ چند امور یکے بعد دیگرے میرے ذہن میں ابھرنے لگے۔ اس غلیظ شخص نے مجھ سے بھیک نہیں مانگی تھی' بلکہ اس کا انداز غنڈہ ٹیکس وصول کرنے والوں جیسا تھا اور وہ خاص طور پر میرے پاس ہی آیا تھا' جس سے ظاہر ہوتا تھا' اس کی یہ حرکت کسی خاص منصوبے کے تحت تھی۔ نمبر دو' وہ پولیس کو بلانے کی' میری دھمکی سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا تھا اور نہ ہی وہ ویٹرز کو خاطر میں لایا تھا۔ یہ اعتماد اس امر کا غماز تھا کہ وہ کسی

خاص مشن پر ہے۔ اپنا کام کرے گا اور واپس چلا جائے گا۔ نمبر تین' وہ کم بخت یہ بات جانتا تھا کہ میں ایک وکیل ہوں۔ اس نے بڑی حقارت سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ میری جیب سے پچاس روپے نہیں نکل رہے۔ میں صرف دوسروں کی جیبوں سے پیسے نکلوانا جانتا ہوں۔ گویا وہ ہوش و حواس میں تھا۔ مجذوب انسان کو ایسی حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا اور...... سب سے بڑھ کر میرے ہم پیشہ بدخواہ اور اس کے ساتھیوں کی تمسخر آمیز "کھی کھی......"

مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہوگیا کہ یہ سارا واہیات ہنگامہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت برپا کیا گیا تھا اور اس گھٹیا حرکت کے پیچھے میرے ہم پیشہ بدخواہ ہی کی گندی ذہنیت کارفرما تھی' جس کا نام تھا...... کلیم باجوہ!

کلیم باجوہ ایک فتنہ پرور اور منفی ذہن کا حامل وکیل تھا۔ ہماری چپقلش کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی۔

میں آفس پہنچا اور وزیٹرز لابی کو خالی پایا تو میری کوفت میں اضافہ ہوگیا۔ پچھلے چند روز سے کاروبار وکالت ذرا مندا چل رہا تھا۔ پتا نہیں' کس بدخواہ کی نظر لگ گئی تھی۔ میری سیکرٹری صدف کا خیال تھا کہ کلیم باجوہ نے میرے خلاف کوئی بندش کروا دی ہے۔ صدف میرے اور کلیم باجوہ کے تنازع سے نہ صرف اچھی طرح آگاہ تھی' بلکہ اس جھگڑے کا مرکزی کردار بھی وہی تھی۔ بہرحال' میں اپنے چیمبر میں آکر بیٹھا تو صدف کا انٹرکام آگیا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور کہا۔

"ہیلو......!"

"سر! آپ کے دوست کا تین چار مرتبہ فون آچکا ہے۔"

صدف اسی انداز میں بات شروع کرتی تھی کہ سرپیر کا کچھ اندازہ نہیں ہو پاتا تھا۔ میں چونکہ اس کی اس عادت کا عادی ہو چکا تھا' لہٰذا اس اسٹائل سے کوفت نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی میں کوئی الجھن محسوس کرتا تھا۔ میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔

"کون سا دوست؟"

"ڈاکٹر واحد کا سر......!"

ڈاکٹر واحد سے میرے بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ میں نے صدف سے پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے تھے؟“

”کہا تو کچھ نہیں، لیکن وہ آواز سے خاصے پریشان لگ رہے تھے۔“ صدف نے بتایا۔ ”بلکہ آخری فون پر تو انہوں نے کہا تھا کہ وہ پندرہ بیس منٹ میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، ڈاکٹر واحد جیسے ہی آئیں، انہیں میرے چیمبر میں بھیج دینا۔“ میں نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔

”اوکے سر......“ صدف نے کہا، پھر چونکتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”یس سر...... ڈاکٹر صاحب آ گئے......“

چند لمحات کے بعد ڈاکٹر واحد میرے سامنے بیٹھا تھا۔

واحد کوئی ”اسپیشلسٹ“ ڈاکٹر نہیں تھا، بلکہ وہ اپنے کلینک میں ایک مخصوص انداز میں مریضوں کا علاج کیا کرتا تھا۔ یہ طریقہ آکوپریشر (Acu-Pressure) کہلاتا تھا۔

ڈاکٹر واحد واقعی بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھ لیا۔ ”ڈاکٹر صاحب! خیریت تو ہے نا؟“

”عاقل کی وجہ سے ایک مسئلہ ہو گیا ہے بیگ صاحب......“ اس نے اضطراری لہجے میں بتایا۔

عاقل، ڈاکٹر واحد کے چھوٹے بھائی کا نام تھا، جو کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرتا تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

”کیسا مسئلہ ڈاکٹر صاحب......؟“

”پولیس نے عاقل کو گرفتار کر لیا ہے۔“

”کس جرم میں؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”قتل کے الزام میں۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔

”عاقل نے کس کو قتل کر دیا ہے...... میرا مطلب ہے، پولیس نے اسے کس شخص کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے؟“

”مقتول کا نام ہے...... مورس!“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

”مورس......!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”اس کا مطلب ہے، مقتول کا تعلق مسیحی برادری سے ہے؟“

”جی ہاں...... بالکل۔“

”عاقل کی مورس کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟“

”کوئی بھی نہیں۔“

”اور مورس کی عاقل کے ساتھ......؟“

جواباً ڈاکٹر واحد نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”پھر مورس کے قتل کے الزام میں پولیس نے آپ کے بھائی عاقل ہی کو کیوں گرفتار کیا ہے؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آخر کوئی نہ کوئی تو ایسی وجہ ہو گی جس کی بنا پر پولیس کا ذہن قاتل کے حوالے سے آپ کے بھائی کی طرف گیا......؟“

”ہاں...... اس کا ایک خاص سبب ہے۔“

”میں وہی سبب جاننا چاہتا ہوں۔“ میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”چند روز پہلے عاقل اور مورس میں اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا تھا۔“ ڈاکٹر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جس میں مورس نے عاقل کو دو چار ہاتھ بھی مار دیئے تھے۔ اس دست و گریبانی میں عاقل کی شرٹ پھٹ گئی تھی اور وہ پٹا بھی تھا، لہٰذا اس نے مورس کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی تھیں، جن میں سے ایک دھمکی کچھ اس نوعیت کی تھی...... مورس! دیکھ لینا، تم میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکو گے...... میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں......“ وہ لمحے بھر کے لئے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”اس موقعے پر بہت سے لوگ جمع تھے اور انہی کے بیچ بچاؤ سے یہ جھگڑا ختم بھی ہوا تھا۔ ان لوگوں میں مورس کے حمایتی بھی شامل تھے، چنانچہ چند روز بعد جب کل رات مورس کو قتل کر دیا گیا تو پولیس کی تفتیش کا رخ فوراً عاقل کی جانب مڑ گیا۔ آج صبح عاقل کو گھر سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں اسی سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں بیگ صاحب۔ بتائیں کہ اس پریشانی میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

”آپ کو جو کچھ بھی کرنا چاہئے اس میں سرفہرست تو یہ ہے کہ پریشان بالکل نہ ہوں۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”نمبر دو، اس فکر کو بھی ذہن سے جھٹک دیں کہ یہ معاملہ حل کیسے

ہوگا۔ آپ میرے پاس آ گئے ہیں، یہی کافی ہے۔ باقی کے مسائل میں خود دیکھ لوں گا۔ نمبر تین......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی، پھر اضافہ کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"نمبر تین یہ کہ آپ مجھے ملزم اور مقتول کے درمیان ہونے والے جھگڑے کے بارے میں تفصیلاً بتائیں۔ خاص طور پر اس جھگڑے کا پس منظر...... تا کہ میں اس بات کا تعین کر سکوں کہ آگے بڑھنے کے لئے کیا لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"جی، بیگ صاحب......" اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ "اس جھگڑے کی جڑیں اس اخبار کے نیچے ہیں، جو میں نے نیا نیا نکالا ہے۔"

یہ بات میرے علم میں تھی کہ ڈاکٹر واحد نے لگ بھگ ایک ماہ پہلے اپنے علاقے میں ایک اخبار کا اجراء کیا تھا۔ ویسے تو یہ اخبار پہلے سے مارکیٹ میں موجود تھا، لیکن ڈاکٹر واحد نے اپنے علاقے کی خبروں پر مبنی ایک سپلیمنٹ الگ سے اضافی اس کے ساتھ شامل کرایا تھا۔ وہ خود دو صفحات پر مشتمل اس خصوصی حصے کا انچارج تھا۔ آپ اسے اس اخبار کے ذیل میں اپنے علاقے کا بیورو چیف سمجھ لیں۔ اخبار کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ میں زیر نظر کہانی میں اسے محض "اخبار" کے نام سے یاد کروں گا۔

مذکورہ اخبار کا اصل مالک سلمان فاروقی تھا۔ سلمان فاروقی اخبار کی دنیا کا آدمی نہیں تھا، ان ' فیملی بزنس کوئی اور تھا۔ ایک خاص سبب نے سلمان کو صحافت کا شوق چرایا اور اس نے چند ہمدردوں کے مشورے سے ایک ہفت روزہ نکال لیا۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد جب سلمان کو احساس ہوا کہ ہفت روزہ تو چل نہیں رہا، صرف کھا رہا ہے، جو شخص "کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا" ہو، اسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ سلمان کے کندھوں اور جیب پر بھی یہ ہفت روزہ بوجھ بن کر رہ گیا۔ اس کی عقل میں یہی بات آئی کہ مزید نقصان اٹھانے کے بجائے اس پرچے کو بند کر دینا چاہئے۔ اس کے ہمدردوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ پرچے کو بند کر دینے کا فیصلہ ان کے لئے سراسر نقصان دہ تھا۔ سلمان فاروقی کی صحافت اور پبلی کیشنز سے ناواقفیت ان لوگوں کے لئے بڑی سودمند ثابت ہو رہی تھی، چنانچہ...... انہوں نے اپنے زبانی اور کلامی ٹیلنٹ کو استعمال کر کے سلمان فاروقی کو اب ایک نیا خواب دکھایا کہ کیوں نہ اسے روزنامہ کر دیا جائے۔

سلمان فاروقی نے پوچھا۔ "اس سے کچھ فائدہ بھی ہوگا؟"

"یقیناً ہوگا سر......!" اسے یقین دلایا گیا۔

"مثلاً کس قسم کا فائدہ ہوگا؟" سلمان نے استفسار کیا۔

"روزنامہ ہو جانے سے ہمارا پرچہ دھڑا دھڑ بکنے لگے گا۔" اسے بتایا گیا۔ "اس سے ایک تو پچھلا نقصان پورا ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں آئندہ کے لئے آمدنی کی ایک محفوظ راہ بن جائے گی۔ شہرت الگ ہے۔"

یہ شہرت والی بات سلمان فاروقی کو زیادہ پسند آئی۔ اس کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ فیملی بزنس خوب زور و شور سے چل رہا تھا۔ اس کے والد صاحب اور دیگر برادران اسی کام میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی فیکٹری بچوں کے کھانے کی چیزیں تیار کرتی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا، لیکن یہ کوئی ایسا کاروبار نہیں تھا کہ وہ اونچی سوسائٹی میں بیٹھ کر فخریہ انداز میں اپنے بزنس کا ذکر کر سکتا اور...... یہی اس کا مسئلہ تھا۔

وہ چونکہ تعلیم یافتہ تھا اور اونچی سوسائٹی میں اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی تھا، اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ اس کی الگ سے کوئی شناخت ہو اور اسی شناخت ہو، جس پر وہ سینہ پھیلا سکے اور اترا سکے۔ اس نے دیکھا تھا کہ اخبار اور میگزین وغیرہ کے مالکان کے بڑے مزے ہوتے ہیں، یہی سب دیکھ کر وہ اس فیلڈ میں کودا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی کہ ہمدردوں کے چناؤ میں اس نے عقل سلیم سے کام نہیں لیا تھا۔

کہتے ہیں کہ جو درخت جتنا پھل دار ہوتا ہے، اس کی شاخیں اتنی ہی جھکی ہوئی اور لچک دار ہوتی ہیں۔ اسی طرح جس انسان پر اللہ کی خاص عنایت ہو وہ بہت ہی سادہ، نرم خو اور لچکیلا ہو جاتا ہے۔ اسے الو بنانا یا دھوکا دینا نہایت ہی آسان ثابت ہوتا ہے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا نقصان عارضی اور وقتی ہوتا ہے۔ قدرت اس کے نقصان کو فوراً پورا کر دیتی ہے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہی نواز دیتی ہے۔ سلیمان فاروقی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض موقع پرست اور عیار لوگ اس کے سامنے مختلف قسم کے آئیڈیاز پیش کر کے اسے چونا لگانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ یہ اخبار والا منصوبہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

بہرحال ہفت روزہ...... روزنامہ میں بدل گیا۔

کچھ عرصے کے بعد وہ ''اے بی سی'' بھی ہو گیا۔

اخبار روز چھپتا اور پورے شہر میں پھیل جاتا' لیکن خاطر خواہ فروخت نہیں ہوتا تھا۔ اشتہارات بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ چند ماہ مسلسل نقصان اٹھانے کے بعد اس نے اپنے ہمدردوں کو جمع کیا اور اس عظیم ناکامی کی وجوہات دریافت کیں۔ اس کی سماعت تک اس قسم کے جملے پہنچے۔

''سر! ہم تو ابھی اس میدان میں بالکل بچے ہیں۔ آپ خود دیکھ لیں' کتنے بڑے بڑے مگرمچھ پہلے سے یہاں موجود ہیں۔''

مگرمچھ سے اس شخص کی مراد وہ اخبارات تھے جو سال ہا سال سے میدان صحافت میں اپنے قدم جمائے کھڑے تھے۔ ایک جانب سے کچھ اس انداز میں تسلی دی گئی۔

''سر! ہم سخت محنت کر رہے ہیں۔ ہماری محنت ایک دن ضرور رنگ لائے گی۔''

''سر! روزنامہ...... کو اس مقام تک پہنچنے میں تیس پینتیس سال لگے ہیں۔'' ایک جگادری قسم کے ہمدرد نے ایک سرکردہ معروف اخبار کا نام لیتے ہوئے دعویٰ کیا۔ ''ہمیں تو ابھی چند ہی ماہ ہوئے ہیں' لیکن آپ دیکھیں گے سر...... ہم دو سے تین سال میں اس اخبار کو بہت پیچھے چھوڑ دیں گے۔ ہمارا اخبار شہر کا نمبر ون اخبار ہوگا۔''

اسی دوران میں اس کا اٹھنا بیٹھنا معقول اور قابل صحافیوں میں ہوا' جن کے ساتھ وہ پریس کلب بھی جانے لگا۔ اس کی آنکھیں کھلنے لگیں اور اسے واضح طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ اس کے نقصان کے ذمے دار سراسر وہی لوگ تھے' جو اپنے بلند بانگ دعوؤں سے اسے جھوٹی تسلیاں دیتے رہتے تھے۔ اخبار کی ناکامی انہی ہمدردوں کی نالائقیوں کے سبب تھی۔ اخبار میں ایسا کچھ پیش ہی نہیں کیا جاتا تھا کہ لوگ نیوز اسٹینڈ سے اخبار اٹھانے پر مجبور ہو جائیں۔ اس صورت حال میں اخبار کیا چلتا' جبکہ اس کے مقابلے میں پہلے سے جمے جمائے اخبارات موجود تھے۔

سلمان فاروقی کو اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا احساس ہوا تو ایک دوست کے مشورے سے اس نے ڈاکٹر واحد کے ساتھ مشروط پارٹنر شپ کر لی۔ ڈاکٹر واحد مارکیٹنگ کی دنیا کا چیتا تھا۔ وہ اپنے علاقے میں دوستوں کے ساتھ مل کر پہلے بھی اخبار نکالنے کا ایک کامیاب تجربہ کر چکا تھا۔ اشتہار لانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ڈاکٹر واحد کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا' جو

صحرا میں کشتی اور سائبیریا میں بہ آسانی فریج فروخت کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر تو وہ بعد میں بنا تھا' اس سے پہلے وہ ایک اچھا سیلز مین اور سماجی کارکن تھا۔ اپنے علاقے میں ہونے والے فلاح و بہبود کے کاموں میں وہ پیش پیش رہتا تھا۔ لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ اس پر اعتماد کرتے تھے اور اس کی بات مانتے تھے اور یہی اس کی کامیابی کا راز تھا اور...... اس راز کے پیچھے اس کی ذات کے دو وصف کارفرما نظر آتے تھے۔ نمبر ایک' وہ انتھک محنت سے نہیں گھبراتا تھا۔ ڈاکٹر کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا' جو نیند کے دوران میں بھی کسی نہ کسی مشن میں مصروف رہتے ہیں۔ نمبر دو' وہ اپنا کام نہایت ہی ایمانداری سے کرتا تھا۔

اسی ایمانداری اور انتھک محنت کے نتیجے میں وہ اپنے علاقے کے اخبار کو کامیاب بنا چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ ہی عرصے کے بعد دوستوں کی باہمی پھوٹ سے وہ اخبار بند ہو گیا۔ واحد ڈاکٹر بن گیا اور اپنا کلینک کرنے لگا۔ کئی سال گزر جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر وہ صحافت کے میدان میں کود پڑا تھا۔ سلمان فاروقی کے ساتھ اس کا دل مل گیا تھا۔

ڈاکٹر واحد' سلمان فاروقی اور اس کے اخبار کے ساتھ ماہ رمضان سے چند روز پہلے ہی وابستہ ہوا تھا۔ ان کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ رمضان کا مہینہ سلمان فاروقی' ڈاکٹر واحد والے دو صفحات مفت میں تیار کر کے اسے دے گا۔ اس دوران میں ڈاکٹر واحد اپنے علاقے میں اس اخبار کی مارکیٹنگ کرے گا اور اسی مقصد کے لئے اخبار مفت میں تقسیم ہوگا۔ عید کے بعد پارٹنر شپ بزنس کے اصول بالکل مختلف ہوں گے۔ یعنی پھر ڈاکٹر واحد کو ان دو صفحات کے نصف اخراجات اٹھانا ہوں گے' باقی نصف سلمان فاروقی برداشت کرے گا۔ منافع میں وہ برابر کے شریک ہوں گے۔ علاوہ ازیں اخبار میں شائع ہونے والے اشتہارات سے ہونے والی آمدنی میں بھی سلمان فاروقی کا آدھا حصہ ہوگا' حالانکہ یہ سراسر ڈاکٹر کی محنت کا ثمر ہوتا۔ بہر حال' جب وہ دونوں ان شرائط اور قواعد پر مطمئن اور متفق تھے تو بھلا کسی اور کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

اس پارٹنر شپ بزنس کو شروع ہوئے ابھی دس بارہ دن ہی ہوئے تھے کہ یہ واقعہ پیش آ گیا' جس کے نتیجے میں ڈاکٹر واحد اس وقت میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر واحد نے اپنے بھائی کی گرفتاری کو اخبار سے منسوب کر دیا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے الجھن زدہ نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''مورس کے

قتل اور عاقل کی گرفتاری کا اس اخبار سے کیا تعلق ہے' یہ میری سمجھ میں نہیں آیا؟''

''آپ نے ہمارا علاقہ تو دیکھا ہوا ہے بیگ صاحب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اخبار کے دفتر کے قریب ہی ایک شراب خانہ کھلا ہوا ہے' جس کا ماڈرن نام وائن شاپ ہے۔ چند روز پہلے ہم نے اس شراب خانے کی مذمت کرتے ہوئے ایک خبر لگائی تھی۔ اگلے روز شراب خانے والوں نے ہمارے رپورٹر کو ایک ہینڈسم آفر کر دی......''

''مطلب...... رشوت کی آفر؟'' میں نے لقمہ دیا۔

''جی ہاں۔'' ڈاکٹر واحد نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بتانے لگا۔ ''انہوں نے کہا کہ ہم آپ کا مہینہ باندھ دیتے ہیں۔ بس آپ اس قسم کی خبریں نہ لگایا کریں۔ رپورٹر نے آ کر مجھے اس آفر کے بارے میں بتایا تو میرا دماغ گھوم گیا۔ میں رشوت لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تو اس مشن کے ساتھ میدان میں اترا ہوں کہ جس کے خلاف خبر لگاؤں گا اس کا اشتہار نہیں چھاپوں گا۔ میں نے شراب خانے والے معاملے کے سلسلے میں اپنے ایک بزرگ دوست جمیل صاحب سے مشورہ کیا۔ جمیل صاحب پیشے کے اعتبار سے ایک انجینئر ہیں' آدھی سے زیادہ دنیا دیکھ رکھی ہے انہوں نے۔ نہایت ہی تجربہ کار اور جہاں دیدہ انسان ہیں۔ میری تربیت میں جمیل صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ میں انہیں اپنا بزرگ' استاد اور مرشد مانتا ہوں۔''

وہ سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔ ''پھر جمیل صاحب نے آپ کو کیا مشورہ دیا؟''

''انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اس نوعیت کی وائن شاپس گورنمنٹ سے باقاعدہ لائسنس لے کر کھولی جاتی ہیں۔'' ڈاکٹر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''مسیحی برادری کے یہاں چونکہ پینے پلانے کی ممانعت نہیں لہٰذا ایسے پرمٹ اور لائسنس انہیں جاری کر دیئے جاتے ہیں۔ اب اگر وہاں سے مسلمان بھی کسی طرح شراب خرید رہے ہیں تو اس میں وائن شاپ والوں کا زیادہ قصور نہیں ہے۔ آپ کوئی بھی اخباری مہم چلا کر نہ تو وائن شپ بند کروا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں شراب فروخت کرنے سے منع کر سکتے ہیں۔ اس بات کا خیال تو خود مسلمانوں کو ہونا چاہئے کہ جب ان کا مذہب شراب نوشی کی اجازت نہیں دیتا تو وہ وائن شاپ کا رخ نہ کریں۔''

''بالکل بجا اور مناسب مشورہ دیا تھا جمیل صاحب نے۔'' میں نے تائید کرتے ہوئے

کہا۔

''ان کا مشورہ تو میری سمجھ میں آ گیا تھا......'' ڈاکٹر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میرا دل مطمئن نہیں ہوا تھا۔''

''اس عدم اطمینان کا سبب؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں وائن شاپ کے حوالے سے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے ںلا۔ ''اگر میں اس شراب خانے کو بند نہیں کروا سکتا تھا تو کم از کم انہیں اس بات کے لئے تو بند کر سکتا تھا کہ وہ نوجوان نسل کو شراب نہ بیچیں...... جو تباہ ہو چکے' سو ہو چکے' ہماری ینگ زیشن تو اس بیماری سے محفوظ رہے۔''

ڈاکٹر واحد کی ڈاکٹرانہ قابلیت اپنی جگہ مسلم تھی۔ اس کی مارکیٹنگ کی صلاحیت میں بھی ئی کلام نہیں' لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اپنی فطرت میں بہت ہی سادہ معصوم تھا۔ یہ وصف اس کی سچائی اور دیانت داری پر دلالت کرتا تھا۔ شراب اور شراب نے کے حوالے سے اس نے اپنے عزائم اور خواہش کا جس انداز میں اظہار کیا تھا وہ اس ، باطن کو سمجھنے کے لئے کافی تھا۔

میں نے ڈاکٹر سے یہ نہیں کہا کہ شراب' کباب اور شباب کے تمام تر معاملات کی کشش ضرورت زیادہ تر نوجوان اور جوان طبقے کو محسوس ہوتی ہے۔ اگر وائن شاپ والے ان ں پر اپنی دکان کے دروازے بند کر دیں گے تو پھر وہاں بیٹھ کر کیا کریں گے۔ انہوں نے ندا فارغ بیٹھ کر مکھیاں مارنے کے لئے تو شروع نہیں کر رکھا۔ میں نے اپنے دلی جذبات درکھتے ہوئے زیرلب مسکرا کر اس سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کی اس خواہش پر جمیل صاحب نے کیا کہا تھا؟''

''وہ بھی بالکل آپ ہی کے انداز میں مسکرائے تھے......'' اس نے شاکی نظروں سے جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور فرمایا تھا کہ اگرچہ اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑنے والا' ں میں کوشش کر کے دیکھ لوں۔''

''ہوں۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''تو پھر اس سلسلے میں آپ نے کوشش ؟''

''جی ہاں...... کی تھی۔'' وہ بڑی قطعیت سے بولا۔ ''میں نے اپنے رپورٹر ہی کے

ذریعے وائن شاپ کے مالک کو کہلوا دیا تھا کہ ہمیں رشوت وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ لوگ ینگ جنریشن کو کھلے عام یوں شراب فروخت کرنے سے باز رہیں یا کم از کم کسی مسلمان کو تو ایک بوند بھی نہ بیچیں تو میرا اخبار ان کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گا۔‘‘

’’آپ کے گراں قدر خیالات بڑے متاثر کن ہیں ڈاکٹر صاحب!‘‘ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا‘ پھر پوچھا۔

’’وائن شاپ والوں کی طرف سے کیا جواب آیا تھا؟‘‘

’’انہوں نے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ میری بات پر عمل کریں گے۔‘‘ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

’’کیا آپ نے خود وائن شاپ کے مالک سے بات کی تھی؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ ڈاکٹر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’یہ سارا معاملہ رپورٹر کے توسط ہی سے طے ہوا تھا۔‘‘

’’آپ کے اس رپورٹر کا نام کیا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’عارف انصاری۔‘‘

’’اور وائن شاپ کے مالک کا نام؟‘‘

اس سوال و جواب کے دوران ہی میں‘ میں اہم پوائنٹس بھی نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر کی بیان کردہ کہانی دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی سنسنی خیز بھی تھی۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

’’پیٹر......!‘‘

’’اور مورس......‘‘

’’مورس کو وائن شاپ کا انچارج سمجھ لیں۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’مقتول کاؤنٹر پر بیٹھتا تھا۔ کیش کے تمام تر معاملات اسی کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ دکان بند ہونے سے پہلے پیٹر وہاں کا ایک چکر لگاتا تھا۔ وہ لوگ حساب کتاب کرتے تھے۔ پیٹر کیش کو اپنے قبضے میں کر کے پہلے روانہ ہو جاتا۔ اس کے بعد مورس اور دیگر دونوں ملازم دکان بند کر کے اپنے اپنے گھروں کی جانب چلے جاتے تھے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا‘ پھر پوچھا۔ ’’کیا

ائن شاپ والوں نے عہد کی پابندی کی تھی؟‘‘

’’اگر وہ انسانوں کی طرح اپنے الفاظ کی پاسداری کرتے تو یہ فتنہ کبھی کھڑا نہ ہوتا۔‘‘ وہ را سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

’’مطلب یہ کہ انہوں نے ینگ جنریشن کو شراب کی فروخت جاری رکھی۔‘‘

’’جی ہاں...... اور وہ بھی بڑے دھڑلے سے۔‘‘ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ’’مجھے تو اس عاملے کی خبر اس وقت ہوئی جب مورس اور عاقل کے بیچ شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا۔ مجھے اخبار کے معاملات کے ساتھ ہی کلینک کو بھی دیکھنا ہوتا ہے‘ لہٰذا توجہ دو جانب بٹ کر رہ گئی البتہ‘ یہ نامله عاقل کے علم میں فوراً ہی آ گیا تھا۔ رمضان کی وجہ سے وہ ایڈورٹائزنگ کمپنی سے جلد آتا ہے اور آ کر اخبار کا دفتر سنبھال لیتا ہے......‘‘ وہ سانس ہموار کرنے کے لئے رکا‘ پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

’’عاقل کو جیسے ہی پتا چلا کہ وائن شاپ والے معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں تو ا نے مجھے بتائے بغیر چار کالم کی ایک سنسنی خیز خبر بنا کر چھاپ دی جو سراسر وائن شاپ کے ف تھی۔ اخبار کا چھپ کر مارکیٹ میں آنا تھا کہ مورس آگ بگولا ہو کر اخبار کے آفس پر ھ دوڑا۔ آفس میں عاقل کے سوا اس وقت اور کوئی بھی نہیں تھا‘ لہٰذا مورس نے عاقل کو کوب کیا۔ اسی تنازع میں عاقل کی شرٹ بھی پھٹ گئی اور اس نے مورس کو خطرناک نتائج ہ کی دھمکیاں بھی دیں۔ اسی شعلہ بیان کی وجہ سے وہ اس وقت پولیس کی گرفت میں ہے۔ ا تو چند روز پہلے سہ پہر میں ہوا تھا‘ کل رات میں مورس کا قتل ہو جاتا ہے اور آج سحری وقت پولیس نے عاقل کو مورس کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔ میری معلومات کے ق کل وہ عاقل کو عدالت میں پیش کریں گے۔‘‘

’’یہ سب تو اپنی جگہ......‘‘ میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ’’لیکن یہ بات ذہن میں نہیں ہی کہ مورس نے کس بات پر پھڈا کیا تھا۔ معاہدے کی خلاف ورزی تو وائن شاپ والوں رف سے ہوئی تھی نا؟‘‘

’’عاقل بھی یہی سمجھ رہا تھا اور میں بھی......‘‘ وہ پُرخیال انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ’’تو کیا حقیقت کچھ اور تھی؟‘‘

’’حقیقت ابھی کھل کر پوری طرح سامنے نہیں آئی۔‘‘

وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''موریس اور عارف انصاری کے بیانات میں بہت بڑا تضاد ہے۔''

''کیسا تضاد.....؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں نے عارف انصاری کو جو کچھ کہہ کر بھیجا تھا' بقول اس کے' اس نے میرا پیغام من وعن شراب خانے والوں تک پہنچا دیا تھا اور انہوں نے میری خواہش کو پورا کرنے کے لئے یقین دہانی کرائی تھی۔'' ڈاکٹر واحد نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''لیکن موریس نے جب عاقل کے ساتھ مار پیٹ کی تو اس کا موقف کچھ اور تھا۔''

''کیا مطلب.....؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''موریس نے اس موقعے پر کیا موقف اختیار کیا تھا؟''

وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانے لگا۔ ''بیگ صاحب! میں تو موقعے پر موجود نہیں تھا' لیکن مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے اس کے مطابق موریس دوبارہ اس کے خلاف خبر چھاپنے پر بے حد برہم تھا۔ جب عاقل نے اسے یاد دلایا کہ معاہدے کی خلاف ورزی ان کی طرف سے ہوئی ہے تو اس کی برہمی میں کئی گناہ اضافہ ہو گیا اور وہ چیخ چیخ کر بتانے لگا کہ ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا' بلکہ ہمارے رپورٹر کا ماہانہ باندھ دیا تھا جس کی پہلی قسط ایڈوانس میں ادا کر دی گئی تھی۔ اسی لئے وہ دوبارہ خبر چھپنے پر غصے میں آ گیا تھا اور اس نے اخبار کے دفتر آ کر ہنگامہ آرائی کی۔ عاقل سے مار پیٹ کے علاوہ موریس بہ آواز بلند یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ہم بلیک میلر ہیں۔ بھتہ بھی وصول کرتے ہیں اور لوگوں کے خلاف خبریں بھی لگاتے ہیں۔''

''آپ نے اپنے رپورٹر سے اس سلسلے میں باز پرس نہیں کی؟'' ڈاکٹر واحد کے خاموش ہو جانے پر میں نے پوچھا۔ ''آپ نے اسے تو کوئی اور ہدایت کی تھی.....''

''میں نے عارف انصاری کو تنہائی میں بلا کر پوچھ گچھ کی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن وہ کسی بھی قسم کی کوئی رقم لینے سے انکاری ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے وائن شاپ والوں سے اسی انداز میں معاملہ طے کیا تھا' جیسی میں نے اسے تاکید کی تھی۔''

''آپ اپنے رپورٹر اور اس کے بیان پر کس حد تک یقین کر سکتے ہیں؟'' میں نے گمبھیر انداز میں استفسار کیا۔ ''یہ بھی تو ممکن ہے' اس نے آپ کے علم میں لائے بغیر معاملات طے کر لئے ہوں۔ کیا آپ اپنے رپورٹر پر اندھا اعتماد کرتے ہیں؟''

''ایسی بات نہیں ہے بیگ صاحب!'' وہ سرسری انداز میں بولا۔ ''ابھی یہ کام شروع کئے مجھے ایک ماہ بھی نہیں ہوا۔ رپورٹرز' فوٹو گرافرز' ڈیسک انچارج وغیرہ سب نئے لوگ ہیں۔ یہ میرے آزمائے ہوئے نہیں ہیں۔ میں اپنے سیٹ اپ میں صرف عاقل پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔ ویسے عارف انصاری نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اس نے وائن شاپ والوں سے ایک پیسہ بھی وصول نہیں کیا۔ حقیقت کیا ہے' یہ تو اللہ ہی جانتا ہے.....''

''حقیقت یہ ہے ڈاکٹر صاحب..... کہ آپ بہت ہی شریف النفس ہیں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے بیان کی روشنی میں مقتول موریس نے جس انداز میں آپ کے آفس میں آ کر ہنگامہ آرائی کی تھی اس سے تو ذہن میں یہی آتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میں آپ کے رپورٹر عارف انصاری کی ذات کو بری الشک نہیں سمجھتا۔''

''بیگ صاحب! دال میں کچھ کالا ہے یا پوری کی پوری دال ہی کالی ہے' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میرا بھائی بے گناہ ہے۔ موریس کے قتل سے عاقل کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ اس کی بریت کے بارے میں سوچیں۔''

''بالکل درست فرمایا آپ نے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''سب سے اہم پوائنٹ یہی ہے کہ اس جھنجٹ سے عاقل کو کیسے نکالا جائے۔''

''ملا کی دوڑ مسجد تک ہوتی ہے اور میری دوڑ آپ تک ہے۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''میں اپنا مسئلہ لے کر آپ کے پاس آ گیا ہوں اور تمام تر حالات سے آپ کو آگاہ بھی کر دیا ہے۔ آگے کیا کرنا ہے' یہ اب آپ کو سوچنا اور کرنا ہے۔''

''بالکل!'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''سوچنا اور کرنا تو مجھے ہی ہے' لیکن بعض معاملات یا حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے اور سچائی کے چہرے سے پردہ ہٹانے میں آپ کو مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔''

''میں ہر قسم کی مدد اور تعاون کے لئے تیار ہوں بیگ صاحب!''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''عاقل اس وقت کون سے تھانے میں بند ہے؟''

اس نے متعلقہ پولیس سٹیشن کا نام بتا دیا۔

میں نے کہا۔ ''میں آج کسی وقت فرصت نکال کر تھانے میں عاقل سے ملاقات کر لوں گا۔ آپ کل کورٹ آ جائیں۔ ہماری ملاقات وہیں پر ہوگی۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

***

آئندہ روز پولیس نے ملزم عاقل کو عدالت میں پیش کر کے اس کا سات دن کا ریمانڈ حاصل کر لیا۔ یہ ایک معمول کی کارروائی تھی۔ اب پولیس نے ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد چالان کے ساتھ ملزم کو عدالت میں پیش کرنا تھا۔

ریمانڈ کے دوران میں پولیس ملزم سے بھی کڑی پوچھ گچھ کرتی ہے اور اس کیس کو تندرست وتوانا بنانے کے لئے دیگر شواہد اور ثبوت بھی جمع کرنے میں لگی رہتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایسا مواد اکٹھا کر لینا چاہتی ہے' جسے استعمال کر کے ملزم کو مجرم ثابت کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے جائے وقوعہ کی کیفیت' موقعے پر موجود گواہوں کے بیانات' واقعاتی شہادتیں' پوسٹ مارٹم رپورٹ اور اس سے بڑھ کر ملزم اور مقتول کے باہمی تعلقات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ پولیس کی حتی الامکان سعی تو یہی ہوتی ہے کہ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں ملزم اقبال جرم کر لے تاکہ ان کا کام آسان ہو جائے۔ بعض شاطر ملزم پولیس کی مہمان داری سے محفوظ رہنے کے لئے جرم کا اقرار کر بھی لیتے ہیں' تاہم پولیس کی کسٹڈی میں کیے گئے اقبال جرم کی عدالت کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ سچ اور جھوٹ کو جانچنے کا عدالت کا اپنا ایک معیار اور طریق کار ہے۔ وہ اسی کی پیروی کرتی ہے۔ ملزم کے حلفیہ بیان سے لے کر استغاثہ کے گواہان کے بیانات اور دونوں وکلاء کی جرح کے نتیجے میں جو حقائق نکل کر سامنے آتے ہیں' عدالت انہی کی روشنی میں کوئی فیصلہ صادر کرتی ہے۔

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ اس موقعے پر میں نے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی تھی۔ میری جانب سے ضمانت کے حق میں اور وکیل استغاثہ کی طرف سے اس کے خلاف بحث ومباحثہ ہوا۔ فوج داری مقدمات میں ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی اور قتل کے کیس میں تو یہ ناممکن ہی سمجھیں' سو عدالت نے میرے موکل کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو ڈاکٹر واحد نے مجھ سے کہا۔ ''کیا خیال ہے بیگ صاحب...... اگر عاقل کی ضمانت کے کاغذات منظور ہو جاتے تو ہماری اس کیس پر گرفت زیادہ مضبوط نہ ہو جاتی۔''

ڈاکٹر کے ان الفاظ کے پیچھے چھپے معانی کو میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ہر ملزم کے ورثاء کی یہی کوشش اور خواہش ہوتی ہے کہ پہلی ہی پیشی پر ان کے بندے کی ضمانت ہو جائے۔ ڈاکٹر واحد کی بھی یقیناً یہی تمنا تھی اور وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے باور کرانا چاہتا تھا کہ اس پیشی پر مجھے اپنے موکل کی ضمانت کروا لینا چاہیے تھی۔

میں نے ڈاکٹر کو قتل کے ملزم کی ضمانت اور اس کی راہ میں حائل مشکلات سے مختصراً آگاہ کیا اور اس کے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''کیس پر میں نے جو گرفت قائم کی ہے وہ عاقل کی ضمانت سے مشروط نہیں۔ میرا موکل جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں کچھ عرصہ گزارے یا ضمانت پر رہا ہو کر گھریلو آرام اور کھانوں کا لطف اٹھائے' اس سے کیس کی صحت اور طبیعت پر کوئی اثر نہیں پڑتا البتہ......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''البتہ...... ضمانت پر رہا ہو جانے سے ملزم اور اس کے گھر والوں کو جو نفسیاتی اور روحانی سکون ملتا ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ بہرحال' میں نے اس ضمانت کے حوالے سے درپیش مشکلات سے آپ کو تفصیلاً آگاہ کر دیا ہے۔''

''مجھے آپ کی بات پر بھروسہ ہے بیگ صاحب!'' وہ جلدی سے بولا' پھر پرسوچ انداز میں پوچھنے لگا۔ ''آپ نے عاقل کی جیل کسٹڈی کے حوالے سے کچھ عرصہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ آپ کو یقین ہے نا کہ عاقل کا جیل میں قیام بہت کم عرصے کے لئے ہیں......؟''

''کیوں نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اس کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہونے دیں' پھر دیکھئے گا' کیا تماشا ہوتا ہے لیکن......''

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا' تو اس نے جلدی سے پوچھا۔ ''لیکن کیا......؟''

''لیکن...... یہ کہ میں نے آپ کے ذمے جو کام لگائے ہیں' وہ آپ کو جلد از جلد نمٹانا ہوں گے۔'' میں نے یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ''آپ اپنے علاقے کی ایک

معروف سماجی شخصیت ہیں۔ میری مطلوبہ معلومات حاصل کرنے میں آپ کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔''

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں بیگ صاحب!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں چند روز میں آپ کا بتایا ہوا کام کر دوں گا۔''

میں نے ڈاکٹر واحد کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ وہ مجھے مقتول مورس کے پس منظر سے تفصیلاً آگاہ کرے۔ یہ بات تو طے تھی کہ عاقل کا اس قتل میں کوئی کردار نہیں تھا۔ اگر مجھے عاقل کے ملوث ہونے کی ذرا سی بھی بھنک مل جاتی تو میں یہ کیس کبھی اپنے ہاتھ میں نہ لیتا۔ ڈاکٹر واحد لاکھ میرا دوست سہی' مگر میں نے اپنے پیشے کے حوالے سے چند ٹھوس اصول وضع کر رکھے ہیں' جن کی میں ہر حال میں پابندی کرتا ہوں۔ انہی اصولوں میں ایک یہ بھی ہے کہ کسی مجرم کا کیس نہیں پکڑنا' حالانکہ اس نوعیت کے کیسوں میں بے حساب آمدنی ہے اور جھنجٹ بھی نہ ہونے کے برابر۔ میرے ایک ہم پیشہ دوست تھے' وہ اسی نوعیت کے کیس لیتے تھے اور وہ بھی سال میں صرف ایک۔ اس ایک کیس ہی سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ پورے سال کے اخراجات بہ آسانی نکل آتے تھے۔ وہ دوست صاحب سال میں دو تین بیرون ملک کے تفریحی دورے بھی کرتے تھے۔ میں یہاں پر ان کا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا' کیونکہ چند سال پہلے موصوف کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی موت بڑی اذیت اور کسمپرسی میں واقع ہوئی تھی۔ برین کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر وہ دو سال تک زیر علاج رہے۔ اس دوران میں پہلے جمع پونجی ختم ہوئی' پھر شاندار بنگلا فروخت ہوا اور ان کی فیملی ایک چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہو گئی۔ اس کے بعد زیورات اور دیگر قیمتی سامان کی باری آئی۔ جب کچھ بھی پلے نہ رہا تو قرض' ادھار کا سلسلہ شروع ہوا' جو جلد ہی ختم ہو گیا کیونکہ کینسر موت ہی کا دوسرا نام ہے۔

میں نے ابھی اپنے جس ہم پیشہ دوست کا ذکر کیا ہے۔ وہ اکثر مجھ سے مذاق میں کہا کرتے تھے۔ ''بیگ صاحب! آپ نے تو پرچون کی دکان کھول رکھی ہے۔ سال میں چالیس پچاس کیس پکڑتے ہیں تو پھر کہیں جا کر گزارہ ہوتا ہے۔ یہ بھی بھلا کوئی زندگی ہے' مجھے دیکھیں' میں ایک سال میں صرف ایک کیس لیتا ہوں اور بڑے سکون اور عیش سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ سیلکٹڈ کام کریں بیگ صاحب...... سیلکٹڈ!''

''اگر ہر شخص تھوک کا دھندا شروع کر دے گا تو پھر پرچون کے خریداروں کا کیا ہوگا؟''

میں جواب میں کہتا۔ ''قانون کی صرف امرا ہی کو نہیں بلکہ غربا کو بھی ضرورت ہوتی ہے اور میرے خیال میں اس طبقے کو قانون اور انصاف کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہوتی ہے۔''

''آپ کی مرضی بیگ صاحب!'' وہ کندھے اچکا کر بے پروائی سے کہتے۔ ''غریبوں کا ساتھ دینے والا ہمیشہ غریب ہی رہتا ہے اور اسے بے تحاشا کام بھی کرنا پڑتا ہے' جبکہ اونچی سوسائٹی کی صحبت میں انسان کا اسٹیٹس بلند ہو جاتا ہے' اسی لئے میں سیاست دانوں' بیورو کریٹس اور اسی سطح کے لوگوں کے کیسوں میں ہاتھ ڈالتا ہوں' جو مجھے مالا مال کر دیتے ہیں۔''

''آپ انسان کی امیری اور غریبی کو دولت کے سکیل سے ناپتے ہیں۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ آپ کی نظر میں' میں اور میرے کلائنٹس معاشرے کے نچلے یا درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔''

''کیا مطلب......؟'' انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''اس میں باعث فخر کون سا پہلو ہے؟''

''ایک بہت ہی مضبوط پہلو ہے جناب......''

''مثلاً......؟''

''مثلاً یہ کہ...... میں جس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ماننے والا ہوں آپ کے سکیل پر وہ خود بھی غریب تھے اور غریب پرور بھی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ وصف میرے لئے باعث افتخار نہیں ہے کہ میں اپنے آقا ﷺ کی کسی سنت پر یک حد تک عمل پیرا تو ہوں۔''

''آپ تو بات کو بہت دور لے گئے ہیں بیگ صاحب!'' وہ جان چھڑانے والے انداز بں بولا۔

میں نے کہا۔ ''جناب! بات نکلی ہے تو دور تک جائے گی ہی...... وہ آپ نے سنا ہیں...... منہ سے نکلی' پرائی بات۔''

ایسے ہی کسی موڑ پر ہماری گفتگو کا دھارا کسی اور جانب مڑ جاتا تھا۔

اس اہم پیشہ کا ذکر کرنا خالی از مقصد نہیں ہے۔ ان کی زندگی درس عبرت ہے۔ ان کا بام انسان کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔ انہوں نے زندگی بھر مال حرام سے خود عیش کی اور اپنے بیوی بچوں کو بھی مزے کرائے' پھر ایک روز کینسر کے مرض نے ان کے

اندر سب عیش و آرام اور شان و شوکت کو تہس نہس کر ڈالا۔

کسی دانشور کا قول ہے...... اچھے وقت میں اپنے برے وقت کو ضرور یاد رکھنا چاہئے۔ ان لوگوں نے اچھے وقت میں نہ صرف برے وقت کو بھلا دیا تھا' بلکہ اپنے غریب رشتے داروں سے بھی قطع تعلق کر لیا تھا' لہٰذا وہ ہوا جو ہونا تھا...... رہے نام اللہ کا!''

میں نے ڈاکٹر واحد کو مطمئن کرنے کے بعد رخصت کر دیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ذکر ہو جائے۔ اس رپورٹ کے مطابق مقتول مورس کی موت دس اکتوبر کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب وہ دو گولیاں تھیں' جو ایک بے آواز گن سے اس کی کھوپڑی پر برسائی گئی تھیں۔ یعنی گن کی آواز کو سلب کرنے کے لئے اس کے دہانے پر سائیلنسر فٹ کیا گیا تھا اور یہ دونوں گولیاں اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کی گن سے فائر کی گئی تھیں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مذکورہ دونوں گولیاں مقتول کے عقب سے چلائی گئی تھیں' جن میں سے ایک اس کی کھوپڑی کے پچھلے حصے سے داخل ہو کر اسے پھاڑتے ہوئے نکل گئی تھی' جبکہ دوسری گولی اس کی گدی میں پیوست ہو گئی تھی۔ اس فائرنگ کے سبب مقتول کی فوری موت واقع ہو گئی تھی۔

حاصل شدہ ابتدائی معلومات کے مطابق مقتول کی ڈیوٹی پورے بارہ گھنٹے کی تھی۔ وہ دن گیارہ بجے وائن شاپ پر پہنچتا تھا اور رات گیارہ بجے تک وہ وہاں موجود رہتا تھا۔ اس دوران میں سہ پہر تین اور چار بجے کے درمیان وہ ریسٹ کرتا تھا۔ اس کے آرام کے درمیانی وقفے میں نیلسن اور رکی شاپ کو سنبھالا کرتے تھے۔ یہ دونوں لڑکے وائن شاپ کے ملازم تھے اور مورس کے انڈر کام کرتے تھے۔

مقتول کی رہائش وائن شاپ سے لگ بھگ پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور وہ آمد و رفت کے لئے موٹر سائیکل استعمال کرتا تھا۔ جب اسے فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تو وہ اس وقت بائیک پر سوار اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے گھر اور وائن شاپ کے درمیان آدھے کلومیٹر کا ایسا علاقہ تھا' جہاں آس پاس آبادی کے آثار نہیں تھے اور زیادہ تر وہاں رات میں اندھیرا ہی رہتا تھا۔ اس سڑک سے بسیں اور منی بسیں (ویگن وغیرہ) بھی گزرا کرتی تھیں' تاہم اتنے سے ٹکڑے میں اسٹریٹ لائٹس کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ مقتول مورس

کو اسی تاریک ٹکڑے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ جائے وقوعہ کے قریب ہی اس کی بائیک بھی الٹی پڑی تھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے فائرنگ کی جو تفصیل بیان کی تھی اس سے ایک بات تو بالکل واضح ہو جاتی تھی کہ قاتل اس کا تعاقب کرتے ہوئے جائے واردات تک پہنچا تھا اور اس شقی القلب شخص نے عقب سے اس کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر دو گولیاں فائر کی تھیں۔ اغلب امکان اس امر کا تھا کہ قاتل بھی موٹر سائیکل پر سوار ہو گا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کار یا کسی اور ایسی ہی چھوٹی گاڑی میں ہو اور مقتول کی کھوپڑی کو عقب سے نشانہ بنانے کے بعد وہ آگے بڑھ گیا ہو۔

آئندہ چند روز میں ڈاکٹر واحد نے مجھے وہ تمام معلومات فراہم کر دیں جو میں نے اس کے ذمے لگائی تھیں۔ ان میں بعض بڑے سنسنی خیز اور انکشاف انگیز نکات تھے۔

***

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔

جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ میرے موکل اور اس کیس کے ملزم نے صحت جرم سے نکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ یہ کم و بیش وہی بیان تھا' جو وہ اس سے پہلے اپنی گرفتاری پر پولیس کو دے چکا تھا۔ بس' چند نکات اضافی شامل تھے' جو اس نے بری ہدایت کی روشنی میں شامل کئے تھے۔

استغاثہ کی جانب سے لگ بھگ آٹھ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی' لیکن میں یہاں صرف انہی کا ذکر کروں گا' جن کے بیانات میں کوئی خاص اور چونکا دینے والی بات ہو گی۔ ا سے پہلے کہ استغاثہ کی طرف سے گواہوں کی پیشی کا سلسلہ شروع ہوتا' میں نے نہایت ہرے ہوئے لہجے میں جج سے درخواست کی۔

''جناب عالی!'' اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے فوراً میری فرمائش پوری کر دی۔ انکوائری آفیسر یعنی تفتیشی افسر ہر پیشی پر عدالت کمرے میں موجود ہوتا ہے اور اس کی حیثیت بھی استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہی ہوتی ہے۔ کے اشارے پر آئی۔ او وٹنس باکس (گواہوں والے کٹہرے) میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس

کے سامنے دوسرے پہلو میں میرا موکل ملزموں والے کٹہرے (اکیوزڈ باکس) میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں آئی۔ او کے قریب پہنچا اور اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''آئی۔ او صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کس نے اور کب دی تھی؟''

''اطلاع فراہم کرنے والے شخص کا نام ہے محمد اسحاق۔'' اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''اسحاق پیشے کے اعتبار سے ایک ڈرائیور ہے۔ وہ ایک مزدا (منی بس) چلاتا ہے' جو اس سڑک سے بھی گزرتی ہے جہاں وقوعہ پیش آیا تھا۔''

''آپ نے میرے سوال کے پہلے حصے کا جواب تو دے دیا۔'' میں نے تفتیشی افسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میرے سوال کا آخری حصہ ابھی تک تشنہ ہے......؟''

''جی......'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں گردن کو اثباتی جنبش دی اور جلدی سے بولا۔ ''اس واقعے کی اطلاع ہمارے روزنامچے کے مطابق کوئی ساڑھے گیارہ بجے رات کو دی گئی تھی۔''

''یعنی دس اکتوبر کی رات ساڑھے گیارہ بجے؟''

''جی ہاں...... بالکل۔''

''اسحاق ڈرائیور نے کیا اطلاع دی تھی؟''

''اس نے فون پر ہمیں بتایا تھا کہ اس سڑک پر ایک موٹر سائیکل سوار کی لاش پڑی ہوئی ہے اور موٹر سائیکل بھی لاش سے تھوڑے فاصلے پر الٹی پڑی ہے۔'' آئی۔ او نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''مزدا ڈرائیور نے خاصے فاصلے سے سڑک سے گڑبڑ ہوتے دیکھ لی تھی' لیکن وہ اتنی دور سے سمجھ نہیں پایا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ یہی سمجھا کہ شاید ایک موٹر سائیکل نے دوسری موٹر سائیکل کو ٹکر مار دی ہے اور متاثرہ موٹر سائیکل کو وہیں چھوڑ کر ٹکر مارنے والی موٹر سائیکل موقعے سے فرار ہوگئی ہے' لیکن جب اس کی مزدا جائے وقوعہ پر پہنچی تو صورتحال اس پر واضح ہوئی۔ اس کی دیکھا دیکھی مزدا کے اکثر مسافر بھی نیچے اتر آئے تھے۔ جلد ہی انہیں پتا چل گیا کہ وہ قتل کی ایک سنگین واردات تھی' لہٰذا اسحاق نے ایک پبلک کال آفس سے فون کر کے تھانے میں اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ ''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''جائے واردات ہمارے تھانے سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں دو کانسٹیبلز کے ہمراہ رات بارہ بجے سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا۔''

''کیا آپ کی آمد تک مزدا ڈرائیور وقوعہ پر موجود تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں...... ہم نے اسے فون پر ہی پابند کر دیا تھا کہ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے وہ کہیں نہ جائے۔'' آئی۔ او نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''لہٰذا جب ہم وقوعہ پر پہنچے تو وہ اللہ کا بندہ اپنی مزدا سمیت وہاں موجود تھا...... اور ویگن کے پسنجرز بھی۔''

''آپ نے ویگن ڈرائیور محمد اسحاق کا بیان بھی لیا ہوگا؟''

''جی ہاں' اس کا بیان استغاثہ کے ریکارڈ میں موجود ہے۔'' انکوائری آفیسر نے اثبات یں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''اور منی بس کا ڈرائیور اسحاق استغاثہ کا گواہ بھی ہے۔''

''ویری گڈ......'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''پھر تو وہ جب اپنی باری پر گواہی دینے آئے گا تو اس سے بات ہو جائے گی۔ آپ یہ بتائیں کہ......'' میں نے لمحاتی قف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''کہ...... مقتول کے ورثاء تک کیسے پہنچے تھے۔ جس جگہ قتل کی یہ واردات پیش آئی تھی ہاں آبادی وغیرہ نہیں ہے اور سڑک کا وہ حصہ تاریکی میں بھی ڈوبا رہتا ہے۔''

''مقتول کی جامہ تلاشی نے اس سلسلے میں ہماری بھرپور مدد کی تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ئے بولا۔ ''اس کی جیب سے آئی ڈی کارڈ نکل آیا تھا' یہ دراصل سروس کارڈ تھا جس سے پتا لا کہ وہ کسی وائن شاپ کا انچارج تھا۔ ہم مذکورہ وائن شاپ پر پہنچے تو وہ بند ہو چکی تھی۔ عید کی مد آمد تھی لہٰذا دکانیں اور بازار کھلے ہوئے تھے۔ وائن شاپ کے گردونواح سے ہم نے پوچھ چھ کی تو پتا چلا کہ شراب خانے کا ایک ملازم ادھر قریب ہی رہتا ہے۔ ہم رکی نامی اس شخص ے گھر پہنچ گئے۔ پھر کڑی سے کڑی ملتی گئی اور ہم مقتول کے لواحقین تک رسائی حاصل کرنے ں کامیاب ہوگئے۔''

''آپ نے یہ کیسے جان لیا کہ مقتول کی موت کا ذمے دار میرا موکل تھا؟'' میں نے چبھتے ئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ نے جائے وقوعہ سے ایسی شہادتیں جمع کر لی تھیں جو ملزم کی وہاں موجودگی اور قتل واردات میں ملوث ہونے کو ثابت کرتی تھیں......؟''

"جائے وقوعہ پر تو ایسا کچھ نہیں مل سکا تھا......" وہ متذبذب انداز میں بولا۔ "لیکن وائن شاپ کے دونوں ملازمین رکی اور نیلسن کے بیانات ملزم کے مجرم ہونے کی جانب بڑے واضح اشارے کرتے ہیں۔ پھر مقتول اور ملزم کے بیچ چند روز پہلے ہونے والا جھگڑا بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ......" وہ سانس ہموار کرنے کے لئے متوقف ہوا' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"وقوعہ کی رات' وائن شاپ بند ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ملزم کو وائن شاپ کے سامنے مشکوک انداز میں منڈلاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا۔ وہ دونوں بائیک پر تھے اور وائن شاپ کے سامنے منڈلاتے ہوئے انہوں نے بڑے خطرناک انداز میں اندر بھی جھانکا تھا' جیسے وہ یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ مقتول کب شاپ بند کر کے گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے اور کب وہ اس کے تعاقب میں روانہ ہوتے ہیں۔ مزدا ڈرائیور محمد اسحاق کا بیان ہے کہ اس نے دور سے دو موٹر سائیکلوں کو آگے پیچھے جاتے دیکھا تھا اور اگلی موٹر سائیکل پر ایک اور پیچھے والی موٹر سائیکل پر دو افراد سوار تھے......"

"سبحان اللہ! ماشاء اللہ......" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "آپ بڑے تجربہ کار تفتیشی افسر ہیں۔ آپ نے بڑی محنت اور جان ماری کے بعد میرے موکل کو ملزم کے فریم میں فٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہر حال......" میں نے تھوڑا وقفہ دیا اور جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیمیکل ایگزامنر اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹس کے نتیجے میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ مقتول مورس کی موت اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کی دو مہلک گولیوں سے واقع ہوئی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"نہیں جناب......! آپ درست فرما رہے ہیں۔" اس نے تائیدی انداز میں کہا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ نے آلہ قتل تو یقیناً بازیاب کر لیا ہوگا؟"

"نہیں جناب!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آلہ قتل برآمد نہیں ہو سکا۔"

"کیوں......؟" میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ نے ریمانڈ کے نام پر ملزم کو اپنی کسٹڈی میں رکھا ہے۔ کیا اس دوران میں اس نے آپ کو آلہ قتل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

اس نے بڑی شرافت سے نفی میں گردن ہلا دی۔

"عجیب بات ہے آئی۔ او صاحب!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ لوگ تفتیش کے نام پر ملزمان کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں' اس کی تاثیر سے تو پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر میرے موکل کی زبان کیوں نہ کھل سکی...... آپ آلہ قتل تک رسائی حاصل کیوں نہیں کر سکے......؟"

"سب سے پہلے تو میں تفتیش کے حوالے سے آپ کی غلط فہمی دور کر دوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ سب آپ لوگوں کا پروپیگنڈا ہے کہ ہم ریمانڈ کے نام پر ملزمان سے مار پیٹ اور زیادتی کرتے ہیں۔ انہیں مختلف انداز میں ذہنی اور جسمانی اذیت دے کر سچ اگلوانے کی کوشش کرتے ہیں اور......"

"تو کیا ایسا نہیں ہے؟" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی تیز لہجے میں پوچھا۔

"ہرگز نہیں!" اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ "اس پروپیگنڈا میں صرف اتنی سی بات درست ہے کہ ہم ملزم کی زبان سے سچ کا اعتراف کرانے کی کوشش کرتے ہیں......"

"اور اس کوشش میں آپ ملزم سے نہایت ہی شائستہ اور مہذب انداز میں درخواست کرتے ہیں کہ بھائی صاحب...... پلیز! آپ ہمیں بتا دیں کہ یہ جرم آپ نے کیا ہے یا نہیں؟ آپ اگر اس سوال کا سچا اور کھرا جواب دے دیں گے تو یہ پولیس ڈیپارٹمنٹ پر آپ کا عظیم حسان ہوگا۔" میں نے بڑے تیکھے انداز میں کہا' پھر پوچھا۔ "کیوں...... ہے نا یہی بات؟"

"وکیل صاحب! آپ نے انتہائی سنجیدہ معاملے کو مذاق کا جامہ پہنا دیا ہے۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

"جبکہ ہماری تفتیش کی حقیقت صرف اتنی سی ہے کہ ہم ریمانڈ کی مدت کے دوران میں عاگ دوڑ کر کے ملزم اور اس کے جرم کے خلاف زیادہ سے زیادہ واقعاتی شواہد اور ٹھوس ثبوت کٹھے کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور یہ سب کوشش ملزم سے حاصل ہونے والی علومات کی روشنی میں کی جاتی ہے۔" وہ لمحے بھر کے لئے تھما' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"اب ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم ملزم سے "آپ جناب" اور "منت سماجت" سے بات

کرتے ہیں۔ ہم اس پر سختی کرتے ہیں' اس کی زبان کھلوانے کے لئے مختلف قسم کی دھمکیاں بھی دیتے ہیں۔ بعض نفسیاتی چالیں بھی چلتے ہیں' لیکن ہماری کسی بھی کوشش کو تشدد کا نام نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی آپ اسے انسانیت سوز سلوک کہہ سکتے ہیں۔''

''اوکے...... میں معزز عدالت کے وقت کو قیمتی اور مقدم جانتے ہوئے مصلحتاً آپ کے فلسفے سے اتفاق کر لیتا ہوں۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''اب جلدی سے یہ بتا دیں کہ آپ کی شریفانہ تفتیش کے نتیجے میں ملزم نے آلۂ قتل کے بارے میں کیا بتایا تھا؟''

''کک...... کچھ بھی نہیں......'' وہ بے بسی سے بولا۔

''پھر آپ نے سائیلنسر لگی اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کی گن کے بارے میں کیا تصور قائم کیا؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے سوال کیا۔ ''مقتول مورس کا قتل تو ایک ٹھوس حقیقت ہے نا اور اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کی سائیلنسر لگی وہ گن بھی ایک سنگین سچائی۔''

''اغلب امکان یہی ہے کہ واردات کے بعد ملزم نے وہ گن ندی میں پھینک دی ہو گی۔'' وہ قیاس آرائی کرتے ہوئے بولا۔

''ندی...... کون سی ندی؟'' میں نے دانستہ حیرت کی اداکاری کی۔

''جناب! شاید آپ کو معلوم نہیں کہ جہاں قتل کی یہ واردات پیش آئی تھی' وہ ایک پل ہے اور پل...... ہمیشہ ندی' نالوں اور نہروں' دریاؤں پر ہی تعمیر کئے جاتے ہیں۔'' وہ بڑے حکیمانہ انداز میں بولا۔

''اس قیمتی معلومات کی فراہمی پر میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں آئی۔ او صاحب!'' میں نے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا' پھر پوچھا۔ ''آپ نے مذکورہ ندی میں آلہ قتل کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی؟''

''آدھی رات کو تو یہ کام ممکن نہیں تھا۔'' وہ متاملانہ انداز میں بولا۔ ''البتہ اگلی صبح یہ کوشش کی گئی تھی......''

''پھر اس کوشش کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟''

''کچھ بھی نہیں......''

''کیا مطلب......؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''مطلب یہ کہ آلہ قتل بازیاب نہیں ہو سکا۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں وضاحت کرتے

ہوئے بولا۔ ''دراصل' اس سال جولائی اور اگست میں معمول سے زیادہ اور خطرناک نوعیت کی بارش ہوئی تھی' جس کے سبب ندی بھی ان دنوں جولانی پر تھی' جب وقوعہ پیش آیا لہٰذا قوی امکان اس بات کا ہے کہ آلہ قتل ندی کے پانی کے اندر سفر کرتے ہوئے کہیں کا کہیں نکل گیا ہو گا۔''

''یہ آپ کا قیاس ہے یا آپ اس بیان کے سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت بھی مہیا کر سکتے ہیں؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''ظاہر ہے کہ یہ ہمارا اندازہ ہی ہے۔ آپ اسے قیاس بھی کہہ سکتے ہیں۔'' وہ جھنجلاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ ''میں نے انڈر واٹر گن کے آبی سفر کی وڈیو نہیں بنائی' جو عدالت میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش کر سکوں۔''

''آپ کا یہ فیصلہ بروقت اور دانشمندانہ تھا۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''کون سا فیصلہ......؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''یہی کہ......'' میں نے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے انڈر واٹر گن کے زیرِ آب سفر کو شوٹ کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر بولا۔

''ورنہ کیا......؟''

اس کے چہرے پر الجھن کی لکیریں پھیل گئیں' متذبذب لہجے میں بولا۔ ''میں سمجھا نہیں' مگر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''میری معلومات کے مطابق......'' میں نے ٹھوس انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''آدھے کراچی شہر کی غلاظت مختلف سیوریج نالوں میں سے گزر کر اس ندی میں پہنچتی ہے۔ اگرچہ اس کے کنارے پر مختلف کچی بستیوں کی عورتیں بیٹھی کپڑے دھوتی نظر آتی ہیں اور ان کے ننگ دھڑنگ بچے غسل فرماتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں' لیکن ساری ایکٹی وٹیز پانی کی بالائی سطح پر ہوتی ہیں۔ انڈر واٹر وڈیو بنانے کے لئے اور وہ بھی کسی دھاتی شے کے بہتے ہوئے مناظر...... ایک طویل غوطہ خوری کی ضرورت پیش آئی ہے' جس کا دورانیہ بیس منٹ سے لے کر دو گھنٹے تک کا ہو سکتا ہے اور اس سے کچھ زیادہ بھی...... لہٰذا آپ اپنی عقل کو استعمال کر کے سوچیں ذرا......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اپنی بات

مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جس پانی کے اندر کاربن' نائٹروجن' امونیا اور کلورین جیسی خطرناک گیسوں کے علاوہ نصف شہر کی گندگی بھی شامل ہو اس کے نیچے ایسا مہلک جاں مہماتی سفر آپ کی صحت بلکہ زندگی کا کیا حشر نشر کرسکتا تھا......؟''

میری اس گہری اور کاری چوٹ پر وہ تلملا کر رہ گیا' لیکن میں نے چونکہ کوئی انہونی نہیں کہی تھی' لہٰذا وہ مجھے منہ توڑ تو کیا منہ جوڑ جواب بھی نہ دے سکا' بس معاندانہ نظر سے مجھے تکتا چلا گیا۔

میں نے جرح کے سلسلے میں کرنٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔ ''آئی۔ او صاحب! آپ کے قیاس کے مطابق تو آلہ قتل ندی کے منہ زور موجوں میں بہہ کر پتا نہیں' کدھر کا کدھر نکل گیا' لیکن آپ نے دوسرے بندے کے بارے میں نہیں بتایا کہ وہ اب تک کہاں غائب ہے؟ کیا وہ بھی ندی کے بدبودار پانی میں گند کے ساتھ ہی......''

''دوسرا بندہ......'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''یہ آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں؟''

''کمال ہے آئی۔ او صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ دوسرے بند کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟''

''نن......نہیں......'' وہ ہکا بکا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ دوسرے بندے کی وضاحت کر دیں۔ یہ کیا ایشو ہے؟''

میرے لئے یہ بات باعث اطمینان تھی کہ جج پوری توجہ سے میری جرح کو سماعت کر رہا تھا۔ میں نے آئی۔ او کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا روئے سخن جج کی جانب پھیرا اور نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! استغاثہ کی جانب سے جو چالان پیش کیا گیا ہے اس میں دیگر امور کے ساتھ ہی یہ بیان بھی شامل ہے کہ وقوعہ کی رات' وقوعہ سے لگ بھگ ایک گھنٹہ پہلے ملزم کو مقتول والی وائن شاپ کے سامنے مشکوک انداز میں منڈلاتے اور شاپ کے اندر جھانکتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا اور یہ دونوں موٹر بائیک پر سوار تھے......'' میں

نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

''آئی۔ او کے مطابق استغاثہ کا وہ گواہ جس نے اس واقعے کی پولیس کو اطلاع دی تھی' یعنی منی بس کے ڈرائیور محمد اسحاق نے بھی دو موٹر سائیکلوں کو دور سے دیکھا تھا' جن میں سے آگے والی موٹر سائیکل پر ایک شخص اور عقبی موٹر سائیکل پر دو بندے سوار تھے۔ اس وقت محمد اسحاق یہی سمجھا تھا کہ پیچھے والی موٹر سائیکل' اگلی موٹر سائیکل کو ٹکر مارتے ہوئے آگے نکل گئی ہے' لیکن جائے وقوعہ پر پہنچنے کے بعد اسحاق کو پتا چلا کہ یہ روڈ ایکسیڈنٹ نہیں' بلکہ قتل کی ایک سنگین واردات تھی' جبھی اس نے ایک قریبی کال آفس پہنچ کر پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ دوسرے بندے سے میری مراد وہ شخص ہے......''

میں نے ڈرامائی انداز میں رک کر حاضرین عدالت کا طائرانہ جائزہ لیا' پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی...... وہ بندہ جو استغاثہ کے مطابق ملزم کا ساتھی تھا اور بائیک پر اس کے ساتھ سوار تھا' اس پُراسرار شخص کا نام نہ تو استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہے اور نہ ہی چالان میں اس کا ذکر موجود ہے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا کہ اس بندے کو آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی......؟''

''ہم نے اس بندے کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی تھی......'' وکیل استغاثہ نے غیر مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن اتفاق سے وہ ٹریس نہیں ہو سکا۔''

''وہ بندہ اتفاق سے ٹریس نہیں ہوا اور آلہ قتل اتفاق سے ندی میں بہہ گیا۔'' میں نے وکیل استغاثہ اور انکوائری آفیسر کی جانب باری باری دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

''ہم تو بچپن سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ اتفاق میں بڑی برکت ہوتی ہے' لیکن استغاثہ کا اتفاق تو اس کیس میں سے برکت کو اٹھا رہا ہے۔ آلہ قتل غائب......ملزم کا ایک اہم ساتھی غائب' اللہ خیر کرے! کہیں میرا موکل ہی غائب نہ ہو جائے۔'' میں نے ایک مصنوعی جھرجھری لینے کے بعد جج کی جانب دیکھا اور بہ آواز بلند کہا۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی......!''

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں سات آٹھ منٹ باقی تھے۔ اتنی قلیل مدت میں کسی اور گواہ کو شہادت کے لئے پیش نہیں کیا جا سکتا تھا' لہٰذا جج نے تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

آئندہ پیشی پندرہ روز بعد کی تھی۔

***

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ استغاثہ کی طرف سے اس ڈرائیور کو گواہی کے لئے پیش کیا گیا' جس نے اس واردات کی اطلاع پولیس کو فون پر دی تھی' جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے' اس مزدا ڈرائیور کا نام محمد اسحاق تھا۔

اسحاق کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ گھونگریالے بالوں والا ایک عام سا انسان تھا۔ ناک نقشہ واجبی سا اور پستہ قامت' جسم مائل بہ فربہی۔ اسحاق کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لئے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ وہ پندرہ بیس منٹ تک اپنے گواہ سے گھما پھرا کر مختلف سوالات کرتا رہا۔ اس جرح کا لب لباب یہ تھا کہ مقتول اپنی موٹر سائیکل پر آگے جا رہا تھا اور اس کے تعاقب میں دوسری موٹر سائیکل پر دو شخص سوار تھے۔ پھر وہ خوفناک واقعہ پیش آیا اور دو افراد والی موٹر سائیکل جائے وقوعہ سے فرار ہو گئی' وغیرہ وغیرہ......

وکیل استغاثہ نے جرح ختم کی تو میں جج کی اجازت حاصل کر کے استغاثہ کے گواہ منی بس کے ڈرائیور محمد اسحاق کے قریب چلا گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذرا مختلف انداز میں جرح کا آغاز کیا۔

''اسحاق صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ کے سوالات کے جواب میں اور اس سے پہلے اپنے حلفیہ بیان میں بھی بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات آپ نے ڈرائیونگ کے دوران میں' بہت آگے سڑک پر دو موٹر سائیکلوں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''نہیں جناب! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

''پھر آپ نے دیکھا کہ آگے والی موٹر سائیکل اپنے سوار سمیت سڑک پر گر گئی تھی۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور پیچھے والی موٹر سائیکل جس پر دو افراد سوار تھے' وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی' جیسے کوئی جائے وقوعہ سے فرار ہوتا ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں...... بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

''آپ اس وقت یہی سمجھے تھے کہ یہ ایک ایکسیڈنٹ ہے۔ اس حادثے میں قصور چونکہ پچھلی موٹر سائیکل والوں کا نظر آ رہا تھا' اس لئے وہ فی الفور جائے واردات سے فرار ہو گئے' لیکن جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے اور آپ نے منی بس میں سے باہر آ کر صورت حال کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ یہ تو قتل کی ایک واردات تھی۔ اس کے بعد ہی آپ نے ایک قریبی پبلک کال آفس پہنچ کر پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اسحاق صاحب! آپ نے کس بات سے یہ اندازہ قائم کیا تھا کہ مقتول مورس کسی حادثے کا شکار نہیں ہوا' بلکہ اسے باقاعدہ قتل کیا گیا تھا؟''

''اس کی لاش کو دیکھ کر......'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''لاش کو دیکھ کر!'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا۔ ''کیا یہ بات لاش نے آپ کو بتائی تھی کہ اسے قتل کیا گیا ہے؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ ''میرے فاضل دوست استغاثہ کے گواہ کو اپنی لچھے دار باتوں سے الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ غیر متعلق اور اوٹ پٹانگ سوالات سے استغاثہ کے گواہوں کو کنفیوژ کرتے ہیں۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ انہیں اس نوعیت کے ہتھکنڈے آزمانے سے روکا جائے۔''

''یہ سراسر مجھ پر الزام ہے یور آنر!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے اس سے پہلے اور نہ ہی اب ایسی کوئی حرکت کی ہے' جیسے ہتھکنڈوں کا میرے فاضل دوست ذکر کر رہے ہیں۔ میں نے استغاثہ کے گواہ سے جرح کے دوران میں جو سوال کیا ہے اس میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں لاش' قتل' دیکھنا' بتانا' بات...... وغیرہ۔ ان میں سے کوئی بھی لفظ غیر متعلق نہیں ہے اور نہ ہی میرے سوال کو اوٹ پٹانگ کہا جا سکتا ہے۔ دیٹس آل یور آنر!''

میری اس وضاحت پر وکیل استغاثہ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ جج نے نیز لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

''وکیل صاحب! آپ کو وکیل صفائی کے الفاظ پر کیا اعتراض ہے؟''

''اعتراض الفاظ پر نہیں جناب عالی!'' وہ مجھے ناپسندیدہ نظروں سے گھورتے ہوئے جج

سے مخاطب ہوا۔ ''بلکہ ان الفاظ کے معنی اور مفہوم پر ہے اور...... اور سب سے بڑھ کر وکیل صفائی کے تمسخرانہ سٹائل پر مجھے اعتراض ہے۔''

''آپ ان من جملہ اعتراضات کی وضاحت کریں؟'' جج نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

وکیل استغاثہ نے بتانا شروع کیا۔ ''جناب عالی! میرے فاضل دوست نے استغاثہ کے معزز گواہ سے سوال کیا ہے کہ...... کیا یہ بات لاش نے گواہ کو بتائی تھی کہ اسے قتل کیا گیا ہے...... لاش تو سیدھا سیدھا مطلب ہے ڈیڈ باڈی...... کیا کوئی مردہ بھی اپنے قتل کے بارے میں کسی کو کچھ بتا سکتا ہے...... یہ تو گواہ کو الجھانے والی بات ہوئی نا۔''

جج کی ہزار ہا سنجیدگی کے باوجود بھی اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ یہ مسکراہٹ وکیل استغاثہ کے اس اعتراض کا نتیجہ تھا' جسے صرف اور صرف حماقت کے زمرے ہی میں فٹ کیا جا سکتا تھا۔

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ اس اعتراض کے جواب میں کیا کہیں گے؟''

''صرف سوری......!'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''سوری...... کیا مطلب؟'' جج نے الجھن زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''جناب عالی!'' میں نے شرارت آمیز انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں استغاثہ کے معزز گواہ اور اس کے معزز ترین وکیل سے سوری کہوں گا کہ میں نے لاش کے حوالے سے اس قسم کا سوال کیا۔ یہ تو میرے ذہن ہی میں نہیں رہا تھا کہ لاش باتیں نہیں کر سکتی' بہرحال......'' میں نے ڈرامائی توقف کر کے جج کی طرف دیکھا اور کہا۔

''اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں استغاثہ کے گواہ سے یہی سوال ذرا مختلف انداز میں کرنا چاہوں گا اور اس سوال میں...... میں یقین دلاتا ہوں کہ لاش کا لفظ بالکل نہیں آئے گا۔''

''اجازت ہے۔'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ''اسحاق صاحب! آپ کو یہ کیسے اندازہ ہوا تھا کہ مقتول کو قتل کیا گیا ہے۔ اس کی موت کا سبب روڈ ایکسیڈنٹ بھی تو ہو سکتا تھا؟''

''وکیل صاحب! پہلے بھی آپ نے اسی نوعیت کا سوال کیا تھا' لیکن اب میں بھی جواب میں لاش کا ذکر نہیں کروں گا۔'' گواہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''بلکہ میں یہ کہوں گا کہ مقتول کی کھوپڑی کی حالت کو دیکھ کر مجھے اور وہاں موجود تمام افراد کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ مقتول کو فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا...... پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی یہی ثابت ہوا ہے۔''

''فائرنگ...... وری گڈ......'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا' پھر گواہ سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے ڈرائیونگ کے دوران میں فائرنگ کی آواز سنی تھی...... یا کسی اور پسنجر نے سنی ہو؟''

''آواز سننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔

''کیوں نہیں پیدا ہوتا؟'' میں نے پوچھا۔

''مقتول موریس کو سائیلنسر لگی گن سے فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔'' وہ ضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے۔ گرچہ اس فائرنگ کی مخصوص آواز تو ابھری ہو گی' لیکن منی بس اس وقت جتنے فاصلے پر تھی' وہاں سے آواز کو سننا ناممکن تھا۔''

''آپ نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی تھی۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ظاہر ہے' اگر پ گولیاں چلنے کی آواز سن لیتے تو پھر اسے حادثہ نہ سمجھتے' بلکہ جائے وقوعہ پر پہنچنے سے پہلے ں آپ کو پتا چل جاتا کہ ندی کے پل پر قتل کی کوئی واردات ہو گئی ہے۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں ؟''

''سولہ آنے صحیح......'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

''اسحاق صاحب! اب میں آپ سے جو سوال کرنے والا ہوں' اس کا بہت سوچ سمجھ کر اب دیجئے گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ڈرائیونگ کے دوران میں ب آپ نے یہ واقعہ ہوتے دیکھا اور جائے وقوعہ سے دو سوار افراد والی موٹر سائیکل کو فرار تے دیکھا تو کیا آپ نے اسے دیکھا' دیکھا کے ساتھ یہ بھی دیکھا کہ ان دو فرار ہونے لے افراد میں سے کسی نے کوئی شے ندی میں پھینکی ہو......؟''

''نہیں جناب! میں نے ایسا کچھ نہیں دیکھا تھا۔'' وہ پُروثوق انداز میں بولا۔ ''یہ واقعہ نما ہوا اور پیچھے والی موٹر سائیکل پلک جھپکتے میں جائے واردات سے فرار ہو گئی' بس......''

"لیکن آلۂ قتل کی عدم دستیابی کے حوالے سے اس کیس کے انکوائری آفیسر کا یہ دعویٰ ہے کہ......" میں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ملزم نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد سائیلنسر لگی گن کو ندی میں پھینک دیا تھا؟"

"میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں دیکھا۔" گواہ نے متذبذب لہجے میں کہا۔ "انکوائری آفیسر اپنے دعوے کا خود ہی جواب دیں گے۔"

اسی لمحے آئی۔ او نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولنا چاہے' لیکن اس کی اس کوشش سے پہلے ہی میں نے کہہ دیا۔

"آئی۔ او صاحب کو میں بار بار کٹہرے میں بلانے کی جسارت نہیں کرسکتا۔ پہلے انہوں نے انڈر واٹر آلہ قتل کی وڈیو بنانے کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اب وہ اسی تلاش وجستجو میں کہیں مریخ کی طرف نہ نکل جائیں۔ آپ نے جو' جواب دیا ہے' میرے لئے وہی کافی ہے اور اب...... چند آخری سوالات......"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر تفتیشی افسر کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے کچا چبا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا اور پوچھا۔

"اسحاق صاحب! میرے موکل کو مورس کے قتل کے الزام میں ایک ملزم کی حیثیت سے عدالت میں پیش کیا گیا ہے۔ استغاثہ کے مطابق' وقوعہ کی رات آپ نے دو سواروں والی جس موٹر سائیکل کو ندی کے پل سے فرار ہوتے دیکھا تھا اس موٹر سائیکل پر ملزم اپنے کسی دوست کے ساتھ سوار تھا۔ اس نے مقتول کی کھوپڑی اور گدی پر دو بے آواز فائر کئے اور اپنے دوست کے ساتھ جائے واردات سے فرار ہوگیا۔ اگر استغاثہ کے دعوے کو بہ غرض محال ایک لمحے کے لئے درست بھی تسلیم کرلیا جائے تو اس سے واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملزم کا دوست ڈرائیونگ کر رہا تھا اور ملزم اس کے پیچھے سائیلنسر لگی گن تھامے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا کام کیا' پھر یہ دونوں موقعے سے فرار ہوگئے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟"

"ظاہر ہے جناب! موٹر سائیکل چلانے والا شخص تو اتنا صحیح نشانہ نہیں لگا سکتا۔" گواہ نے جواب دیا۔ "ملزم پیچھے ہی بیٹھا ہوا ہوگا ......"

"اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ڈرائیونگ ملزم نے سنبھال رکھی ہو۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اور اس کا دوست گن تھامے پیچھے بیٹھا ہو اور...... مقتول پر اسی دوست نے فائرنگ

کی ہو......؟"

ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار پیدا ہوئے' پھر وہ کاٹھ کے الو کے مانند اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جی ہاں...... یہ بھی ہوسکتا ہے۔"

"یعنی آپ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے؟"

"یقین کے ساتھ تو اس وقت کوئی بات کی جاسکتی ہے اگر میں نے پچھلی موٹر سائیکل والوں کو بہت قریب سے یہ واردات کرتے دیکھا ہو۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔

"جائے وقوعہ اور منی بس کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ میں کسی کے چہرے کو بھی واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر دن کا وقت ہوتا یا سڑک کے اس حصے پر سٹریٹ لائٹس نصب ہوتیں تو شاید میں قدرے بہتر اندازہ قائم کرلیتا۔ رات کی تاریکی اور منی بس کی ہیڈ لائٹس کی محدود روشنی میں وقوعہ کی رات میں نے ندی کے پل پر جو منظر دیکھا وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہیں تو معذرت ہی کرسکتا ہوں۔"

"معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اسحاق صاحب" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اس کے بجائے آپ ایک اور کام کریں......"

"کون سا کام؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"آپ ملزم کو غور سے دیکھیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

اس نے بہ غور میرے موکل کو سرتاپا گھور کر دیکھا' پھر اپنی آنکھوں کا زاویہ میری طرف موڑتے ہوئے بولا۔ "جی......؟"

"کیا آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وقوعہ کی رات مقتول مورس پر فائرنگ اسی نوجوان نے کی تھی؟" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں!" اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

"مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" میں نے روئے سخن جج کی جانب وڑتے ہوئے کہا۔ "نمبر ایک' استغاثہ کا گواہ میرے موکل کے اس کیس میں ملوث ہونے کے رے میں پریقین نہیں ہے' نمبر دو آلہ قتل دستیاب نہیں ہوسکا اور گواہ نے کسی کو آلہ قتل ندی ں پھینکتے ہوئے بھی نہیں دیکھا' نمبر تین پچھلی موٹر سائیکل پر جو جو افراد سوار تھے' ان میں سے ب میرا موکل تھا' اس بات کا استغاثہ کے پاس کوئی ثبوت نہیں' نمبر چار' یہ امر بھی واضح نہیں

ہے کہ موٹر سائیکل سواروں میں سے کس نے فائرنگ کی اور کون ڈرائیونگ کر رہا تھا' کیونکہ ان دونوں کا کوئی سراغ کہیں نہیں ملتا لہٰذا......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لہٰذا...... میں نہایت ہی ذمے داری اور دعوے کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے موکل کا قتل کی اس واردات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسے ایک گہری سازش کے تحت اس مقدمے میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وقوعہ سے چند روز قبل' مقتول سے ہونے والے جھگڑے میں میرے موکل نے جو دھمکی آمیز الفاظ استعمال کئے تھے پولیس نے انہی کی بنیاد پر اس کیس کی عمارت کھڑی کی ہے' جبکہ وہ محض جذباتی ڈائیلاگ تھے۔ جب کوئی انسان کسی سے پٹتا ہے تو وہ جواباً اپنا غصہ نکالنے کے لئے اسی قسم کی دھمکیاں دیتا ہے۔''

''استغاثہ کی عمارت کی بنیاد میں ان دھمکی آمیز جملوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔'' وکیل استغاثہ نے مخالفانہ انداز میں کہا۔ ''وقوعہ کی رات لگ بھگ گیارہ بجے ملزم کو مقتول والی وائن شاپ کے سامنے مشکوک انداز میں ٹہلتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ اس نے ایک دو مرتبہ دکان کے اندر بھی جھانک کر دیکھا تھا۔ اس کے تیور بڑے خطرناک نظر آتے تھے۔ مورس تو اس دنیا سے جا چکا ہے' لیکن ملزم کی ان مشکوک حرکات کی گواہی نیلسن اور رکی دے سکتے ہیں۔ وہ دونوں بھی اس وقت وائن شاپ میں موجود تھے۔'' وہ سانس درست کرنے کے لئے تھما' پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تھوڑی دیر تک مشکوک انداز میں وائن شاپ کے سامنے منڈلانے کے بعد ملزم اپنے دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ایک طرف نکل گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے' جب نیلسن اور رکی گواہی دینے عدالت میں آئیں گے تو میں ان سے اس اجنبی شخص کے بارے میں ضرور دریافت کروں گا جو وقوعہ کی رات میرے موکل کے ہمراہ وائن شاپ کے سامنے مشکوک انداز میں منڈلاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''اجنبی شخص...... کے الفاظ میں نے اس لئے استعمال کئے ہیں کہ اگر استغاثہ اس شخص سے واقف ہوتا تو ملزم کے علاوہ مرد مذکور کو بھی عدالت میں گھسیٹ لیا جاتا۔''

''یہ حقیقت تو اپنی جگہ مسلم ہے ہی۔'' وکیل استغاثہ اپنے موقف میں زور بھرتے ہوئے بولا۔ ''اس کے علاوہ بھی' ایک نہایت ہی اہم نکتہ ملزم کے جرم کی گواہی دیتا ہے......''

''مثلاً...... کون سا نکتہ؟'' جج نے آنکھیں سکیڑ کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔

''ملزم وقوعہ کی رات دس بجے اپنے گھر سے نکلا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے جیسے کسی عظیم راز کی نقاب کشائی کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کی واپسی لگ بھگ رات ایک بجے ہوئی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب وہ مقتول کی وائن شاپ کے سامنے موجود پایا گیا تھا۔ اس کے بعد کے دو گھنٹوں کا حساب کہیں نہیں ملتا۔''

وکیل استغاثہ نے بڑے چبھنے والے انداز میں بات مکمل کی تو میں نے اسے آڑے ہاتھوں لے لیا۔ میں نے قدرے جارحانہ لہجے میں کہا۔

''میرے فاضل دوست اگر استغاثہ کو ملزم کی دو گھنٹے کی مصروفیات کا حساب نہیں مل سکا تو اس کا یہ مطلب کس طرح نکال لیا گیا کہ وہ اس دوران میں قتل کی کسی واردات میں ملوث تھا؟''

''تو پھر وہ کہاں تھا؟'' وکیل استغاثہ نے اکھڑے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''یہ رمضان کریم کا مہینہ ہے۔'' میں نے وکیل سرکار کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ کسی مسجد میں عبادت کی غرض سے دو گھنٹے گزار آیا ہو۔''

''آپ تو اتنے وثوق سے یہ بات کہہ رہے ہیں' جیسے اس رات آپ بھی ملزم کے ساتھ مسجد میں عبادت کرنے گئے تھے؟'' وکیل استغاثہ نے مجھ پر گہری چوٹ کی۔

''آپ کا وثوق تو مجھ سے ایک ہزار گنا زیادہ ہے میرے فاضل دوست!'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں اس کے وار کو الفاظ کی ڈھال پر روکا' پھر جوابی حملہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ آپ نے تو اپنے وثوق کو باقاعدہ تحریری شکل بھی دے ڈالی ہے' جس کا نام استغاثہ رکھا گیا ہے' جو اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ وقوعہ کی رات گیارہ اور ایک بجے کے درمیان دو گھنٹے آپ نے ملزم کی معیت اور صحبت میں گزارے تھے' جبھی آپ کو یقین ہے کہ انہی دو گھنٹوں کے دوران میں ملزم نے مقتول مورس کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ کہیں آپ...... کہیں آپ قاتل والی موٹر سائیکل تو ڈرائیو نہیں کر رہے تھے......؟''

یہ میری جانب سے ایسا بھرپور حملہ تھا کہ وکیل استغاثہ کی سوچ کی ایسی کم تیسی ہوگئی۔ حالانکہ میں نے تو بڑے سیدھے سادے انداز میں اس کی بات کا جواب دیا تھا' لیکن الفاظ ایسے زہریلے اور طنزیلے تھے کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔

اس سے پہلے کہ ہمارا یہ کلیش کوئی خطرناک رخ اختیار کر لیتا' جج نے فوراً مداخلت کی اور گمبھیر انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''بیگ صاحب! استغاثہ کی جانب سے ابھی تک ایسا کوئی واضح ثبوت فراہم نہیں کیا گیا جو ملزم کی جائے وقوعہ پر موجودگی کو ثابت کرتا ہو۔ کیا آپ کوئی ایسا ٹھوس ثبوت پیش کر سکتے ہیں جو وقوعہ کی رات ملزم کو گیارہ سے بارہ بجے کے درمیان جائے واردات سے کہیں دور موجود ثابت کر سکے؟''

''ملزم کو اپنے دوست کے ساتھ' موٹر سائیکل پر بیٹھ کر جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہوتے ہوئے دیکھا گیا تھا......''

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ بول اٹھا۔

''استغاثہ کا گواہ نیلسن اپنی گواہی میں اس حقیقت کا انکشاف کرے گا۔''

''وری گڈ!'' جج نے اثبات میں گردن ہلائی' پھر استغاثہ کے گواہ کی فہرست پر نگاہ ڈالنے کے بعد وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ''آپ نیلسن نامی اس گواہ کو عدالت میں کب پیش کریں گے؟''

''آئندہ پیشی پر جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

''اوکے......'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا' پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''ناؤ یور ٹرن مسٹر بیگ......''

میں نے جواب میں ایک شعر پڑھ ڈالا۔ ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے' پڑھے لکھے کو فارسی کیا ہے......''

''اپنی بات کی وضاحت کر دیں بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے کہا۔ ''اگرچہ عدالت تو آپ کے شعر کا مفہوم بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ گئی ہے' لیکن سامعین میں سے ہو سکتا ہے' چند کے پلے کچھ نہ پڑا ہو' لہٰذا وضاحت ضروری ہے۔''

اس موقع پر وکیل استغاثہ ایک لمحے کے لئے نہیں چونکا اور اس نے فوراً مجھ پر وار کر دیا۔ ''میرے فاضل دوست کو اپنی علمیت جھاڑنے کا بہت شوق ہے۔ ابھی تو شکر کا مقام ہے کہ انہوں نے اردو کے شعر میں صرف لفظ فارسی استعمال کیا ہے ورنہ یہ تو فارسی کے پورے پورے شعر اور اگر بس چلے تو مکمل گلستاں' بوستاں بھی کوٹ کرنے سے باز نہیں آتے......''

جج نے وکیل استغاثہ کے اس عامیانہ اور بے محل تبصرے پر توجہ نہیں دی اور مجھ سے خاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''جی بیگ صاحب......؟''

میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''جناب عالی! ملزم اس وقت عدالت کے کمرے میں وجود ہے۔ مجھے اس کی دو گھنٹے یا ایک گھنٹے کی مصروفیات کی وضاحت کرنے کی قطعاً کوئی رورت نہیں۔ یہ تو موکل سست اور وکیل چست والی بات ہو جائے گی۔ کیوں نہ اس سوال کا واب ملزم ہی سے لیا جائے۔''

''بڑی مناسب بات ہے۔'' جج نے میری تائید کرتے ہوئے کہا' پھر ملزم کی طرف یکھتے ہوئے پوچھا۔ ''وقوعہ کی رات گیارہ اور ایک بجے کے درمیان کا وقت تم نے کہاں گزارا ا؟''

ملزم نے کھنکار کر گلا صاف کیا' پھر ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔ ''جناب عالی! عدالت میں جس ص کا کوئی بار ذکر ہو چکا ہے اور اسے میرا ساتھی بتایا گیا ہے' وہ دراصل میرا دوست زاہد ہے۔ ہم بہت گہرے دوست ہیں اور میں معزز عدالت کو جو کچھ بتانے جا رہا ہوں' اگر اس میں ی کسی بات کا یقین نہ آئے تو اس کی تصدیق کے لئے زاہد کو عدالت میں بلا کر اس سے پوچھ ھ کی جا سکتی ہے۔ زاہد طارق روڈ کے کمرشل علاقے میں رہتا ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لئے س لینے کو رکا' پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''زاہد ہر سال رمضان کے آخری دس دنوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر فوڈ سٹال ا ہے' جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں اور طارق روڈ کی طرف شاپنگ کی غرض سے جانے ں نے دیکھا بھی ہوگا کہ وہاں ان دنوں میں پاکستانی اور کانٹی نینٹل کھانوں کی ایک پوری سٹریٹ آباد ہو جاتی ہے' جو سرِ شام آغاز ہو کر رات گئے بلکہ آخری دو تین دنوں میں تو ا فجر تک چلتی ہے۔ شاپنگ کے لئے ادھر کا رخ کرنے والوں کی خاصی گہما گہمی ہوتی ہے عانے پینے کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے۔''

''لیکن طارق روڈ کی فوڈ سٹریٹ کا زیر سماعت کیس سے کیا تعلق ہے؟'' وکیل استغاثہ بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم نے کون سی کہانی سنانا شروع کر دی ہے؟''

''میں تو وہ کہانی سنا رہا ہوں جناب جو اس کیس سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔'' ملزم عاقل بڑے اعتماد سے کہا۔ ''اور یہ کہانی ہی جائے وقوعہ سے میرے عدم موجودگی کو ظاہر کر کے

مجھے بے گناہ ثابت کرتی ہے۔ لہٰذا اگر آپ میرے بیان کے دوران میں رکاوٹیں کھڑی نہ کریں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

ملزم نے بڑے خوب صورت انداز میں وکیل استغاثہ کو کارنر کر دیا تھا۔ وہ تلملا کر رہ گیا' تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا۔ ملزم نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''عید کی آمد سے پہلے' رمضان کے آخری عشرے میں ہمارے علاقے میں بھی بڑی رونق اور گہما گہمی ہوتی ہے' لہٰذا اس سال میں نے بھی فوڈ سٹال لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے زاہد سے درخواست کی تھی کہ وہ ہمارے علاقے میں آ کر فوڈ سٹال کے لئے کسی اچھی سی لوکیشن کا انتخاب کرے۔ وقوعہ کی رات وہ اسی غرض سے میرے پاس آیا ہوا تھا۔ ہم علاقے کے مختلف حصوں کا گھوم پھر کر جائزہ لے رہے تھے۔ اسی دوران میں ہم اخبار کے آفس کی طرف بھی آئے۔ وائن شاپ بھی ادھر قریب ہی واقع ہے۔ زاہد کو یہ بات معلوم تھی کہ چند روز پہلے وائن شاپ کے انچارج مورس سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے مورس کی جھلک دکھاؤں۔ پتا تو چلے' آخر وہ کون سورما ہے؟ میں زاہد کے ساتھ وائن شاپ کے سامنے پہنچا اور شاپ کے اندر جھانک کر اسے مورس کی شکل دکھا دی۔ پھر ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے تھے؟''

''جب تم نے وائن شاپ کے اندر جھانک کر مقتول کو دیکھا تو اس وقت لگ بھگ رات کے گیارہ بجے تھے۔'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''اس کے بعد کا وقت تم لوگوں نے کہاں گزارا؟''

''زاہد کو بھوک لگ رہی تھی۔'' ملزم نے بتایا۔ ''ہمارے علاقے میں عمدہ نہاری کا ایک ہوٹل ہے۔ میں زاہد کو وہاں لے گیا تھا۔ ہم کم و بیش ایک گھنٹہ اس ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس ہوٹل کا ویٹر نذیر احمد اس بات کی گواہی دے سکتا ہے۔ ہم نے خوب سیر کو ہو کر نہاری روٹی کھائی۔ پھر برابر میں پٹھان کے ہوٹل سے دودھ پتی پی۔ اس کے بعد میں زاہد کو اپنی موٹر سائیکل پر طارق روڈ چھوڑنے چلا گیا تھا۔ طارق روڈ سے واپسی پر جب میں گھر پہنچا تو رات کا ایک بج چکا تھا۔''

''جب تم زاہد کو طارق روڈ چھوڑنے گئے' کیا وقت ہوا ہوگا؟''

''بارہ سے تو اوپر ہی کا وقت تھا۔'' ملزم نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے' ساڑھے بارہ یا پھر پونے ایک بجے ہوں گے'' ...

کے سوا بارہ بجے ہوں گے۔''

''اور تمہارے علاقے سے طارق روڈ مشرق میں واقع ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور جائے وقوعہ' ندی والا وہ پل مغرب میں۔''

''جی ہاں...... بالکل ایسا ہی ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''کیا تم لوگ طارق روڈ جانے کے لئے ندی کی طرف سے تو نہیں نکلے تھے؟'' میں نے برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب......!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''یہ تو سراسر حماقت ہوتی۔ اگر ہم ندی والے راستے کی طرف سے بائیک نکالتے تو کبھی طارق روڈ نہیں پہنچ سکتے تھے اور...... اگر گھوم پھر کر بھی پہنچنے کی کوشش کرتے تو رات کے تین چار تو بج ہی جاتے' جبکہ میں رات ایک بجے واپس اپنے گھر پر تھا۔''

میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! ملزم کا تفصیلی بیان اور معروفیات اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ وقوعہ کے وقت' جائے واردات سے میلوں دور اپنے دوست کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھا نہاری روٹی کھا رہا تھا' لہٰذا قتل کی اس واردات میں ملزم کے ملوث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں اس تفصیل سے بہت سے ایسے امور کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے جو استغاثہ کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً وقوعہ کی رات ملزم وائن شاپ کے سامنے بڑے مشکوک انداز میں ٹہل رہا تھا اور اس نے بڑے خطرناک انداز میں ایک دو بار شاپ کے اندر بھی جھانک کر دیکھا تھا اور پھر اپنے دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے چلا گیا تھا' وغیرہ وغیرہ......''

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا آئندہ پیشی پر آپ ملزم کے دوست زاہد اور ہوٹل کے ویٹر نذیر احمد کو ملزم کے بیان کی تصدیق کے لئے عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟''

''بالکل جناب......'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ضرور پیش کر سکتا ہوں۔''

''آپ بھی وکیل صاحب......!'' جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''استغاثہ کے جو گواہ باقی بچے ہیں انہیں اگلی پیشی پر لے آئیں تاکہ اس کیس کا جلد از جلد فیصلہ سنایا جا سکے۔''

وکیل استغاثہ نے جج کی ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا۔

جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!''

***

آئندہ پیشی پر سب سے پہلے صفائی کے گواہان یعنی ملزم کے دوست زاہد اور نہاری ہوٹل کے ویٹر نذیر احمد کو گواہی کے لئے پیش کیا گیا' جن کے حلفیہ بیان اور بعدازاں ان پر ہونے والی جرح سے ثابت ہو گیا کہ وقوعہ کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے دوران میں میرا موکل جائے واردات سے پانچ میل کے فاصلے پر اپنے دوست کے ساتھ موجود تھا۔ جائے وقوعہ سے اس کی عدم موجودگی اس بات پر دلالت کرتی تھی کہ قتل کی اس واردات میں وہ کسی بھی طور پر ملوث نہیں تھا۔

اس کے بعد یکے بعد دیگرے تین گواہ استغاثہ کی طرف سے پیش کئے گئے' جن میں وائن شاپ کا مالک مسٹر پیٹر اور دونوں ملازم رکی اور نیلسن شامل تھے۔ پیٹر کے بیان میں ایسی کوئی بات شامل نہیں تھی' جو اس کیس میں کسی طرح معاون ثابت ہو سکتی۔

پیٹر کے بعد رکی اور نیلسن گواہی دینے کے لئے آئے۔ ان کے بیانات میں بہت کچھ مشترک تھا۔ مثلاً یہ کہ ملزم اور مقتول کا جھگڑا ہوا تھا' جس میں ملزم نے مقتول کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں۔ پھر یہ کہ وقوعہ کی رات وائن شاپ بند ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ملزم اپنے ایک دوست کے ہمراہ شاپ کے سامنے بڑے مشکوک انداز میں ٹہلتے ہوئے دیکھا گیا تھا اور اس نے ایک دو مرتبہ شاپ کے اندر جھانک کر بھی دیکھا تھا' وغیرہ وغیرہ...... البتہ نیلسن کا بیان اس حوالے سے قدرے مختلف اور اہمیت کا حامل تھا کہ اس نے ملزم اور اس کے دوست کو موٹر سائیکل پر سوار ہو کر جائے وقوعہ کی طرف جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا' لہٰذا میں یہاں پر نیلسن کے بیان اور بعدازاں اس پر ہونے والی جرح کا احوال ہی پیش کروں گا۔

وکیل استغاثہ نے اسے فارغ کیا تو جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ نیلسن کی عمر پچیس کے قریب رہی ہو گی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر نیلسن! آپ کو پیٹر کی وائن شاپ پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''پانچ سال......'' اس نے جواب دیا۔

''اور مقتول موریس کب سے وہاں کام کر رہا تھا؟''

''مجھ سے تین سال پہلے سے۔'' اس نے بتایا۔ ''یعنی آٹھ سال سے۔''

''میری معلومات کے مطابق مقتول کی آپ کے ساتھ بڑی گہری دوستی تھی۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''اور آپ دونوں ایک دوسرے کے ذاتی معاملات سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''واقعی ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔''

''مجھے آپ کے دوست کی المناک موت کا بڑا دکھ ہے۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ سوال و جواب عدالتی کارروائی کا لازمی حصہ ہے' لہٰذا آپ کو زحمت تو ہو گی لیکن......''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''آپ کو جو بھی پوچھنا ہے' ضرور پوچھیں۔ ان تکلفات سے موریس واپس تو نہیں آ جائے گا۔''

''بجا فرمایا آپ نے...... جانے والے کو کبھی کوئی واپس نہیں لا سکتا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں البتہ اس کے بھیجنے میں جس کا ہاتھ ہو اسے قرار واقعی سزا تو دلوائی جا سکتی ہے نا...... کیا خیال ہے آپ کا؟''

وہ جواب دینے کے بجائے الجھن زدہ نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم عاقل کو دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اپنے موکل کو سزا دلوانے کی بات کیوں کی ہے۔ یہ بات اس لئے بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی کہ درحقیقت میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔

چند لمحات کے تذبذباتی توقف کے بعد اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں...... بالکل ضرور...... موریس کے قاتل کو قرار واقعی سزا ملنا چاہئے۔'' بات کے اختتام پر اس نے ایک مرتبہ پھر نفرت بھری نظروں سے ملزم عاقل کی طرف دیکھا۔

''قاتل کو عبرت ناک سزا دلوائی جا سکتی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کام میں آپ کو میرا ساتھ دینا ہو گا...... بولیں' ساتھ دیں گے مسٹر

نیلسن؟''

''جی...... میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے پوچھا۔'' کیا یہ صحیح ہے کہ مقتول غیر شادی شدہ تھا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔'' مورس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔''

''مقتول کی شادی نہیں ہوئی تھی۔'' میں نے سرسری لہجے میں دہرایا' پھر سوالیہ نظروں سے گواہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' لیکن ایک جگہ بڑا زبردست معاشقہ چل رہا تھا...... یہ معاملہ آپ سے چھپا ہوا تو نہیں تھا مسٹر نیلسن؟''

''جی...... مجھے اس معاملے کی خبر تھی۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''کیا اس لڑکی کا نام اگنس تھا؟''

''جی ہاں......''

''اگنس اور مورس ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے......''

''جی ہاں...... یہ ایک حقیقت تھی۔''

''اگنس کا ایک کزن جوزف بھی اسے بہت چاہتا تھا۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔'' اور یہ جوزف' مورس کو سخت ناپسند کرتا تھا' میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ بالکل درست بیان کر رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔'' جوزف اس معاملے میں مورس سے نفرت کرتا تھا' لیکن اس کا بس نہیں چلتا تھا کیونکہ اگنس صرف اور صرف مورس ہی کو چاہتی تھی۔''

''جوزف کا بس نہیں چلتا تھا۔'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔'' اور پھر ایک روز اس کا بس چل گیا۔''

''جی' کیا مطلب......؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔'' کیا یہ درست ہے کہ جوزف کا اٹھنا بیٹھنا آوارہ اور اوباش قسم کے لوگوں کے ساتھ تھا؟''

''جی ہاں...... یہ درست ہے۔''

''وہ کلائیوں اور گلے میں موٹی موٹی چینیں پہنے سارا دن آوارہ گردی کرتا رہتا تھا۔'' میں نے پوچھا۔'' وہ کوئی کام کاج بھی نہیں کرتا تھا؟''

''جی ہاں' ایسا ہی ہے۔'' استغاثہ کے گواہ نیلسن نے اثبات میں گردن ہلائی۔'' اور یہی وجہ ہے کہ اگنس اسے سخت ناپسند کرتی تھی۔''

''اگنس' جوزف کو سخت ناپسند کرتی تھی اور جوزف' مورس سے نفرت کرتا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا' پھر یکلخت گواہ سے پوچھا۔'' مسٹر نیلسن! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جوزف ہی نے مورس کو ٹھکانے لگا دیا ہو؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا' جلدی سے بولا۔'' میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب!''

''آپ کچھ نہ کچھ تو کہہ سکتے ہیں۔ آخر آپ کو بھی اظہار خیال کا حق حاصل ہے۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔'' اس بات کے روشن امکانات تو ہیں نا کہ اپنی راہ صاف کرنے کے لئے جوزف نے مورس کو ایک طرف ہٹا دیا ہو......؟''

''دیکھیں جناب! ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ بے حد محتاط انداز میں بولا۔'' لیکن میں نے چونکہ جوزف کو یہ کام کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اس لئے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا۔''

''تو اس کا مطلب ہے' تم نے ملزم عاقل کو مورس کا قتل کرتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟'' اسی لئے تم ملزم کے خلاف گواہی دینے عدالت میں حاضر ہوئے ہو؟''

''جی......'' وہ ہکا بکا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔'' میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں نے ملزم کو قتل کی واردات کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''وقوعہ کی رات تم لوگوں نے وائن شاپ کتنے بجے بند کی تھی؟'' اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''گیارہ بج کر دس منٹ پر......'' گواہ نے جواب دیا۔

''تمہارا ساتھی رکی اسی علاقے کا رہنے والا ہے جہاں وائن شاپ واقع ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح شروع کی۔'' رکی اپنے گھر چلا گیا اور مقتول اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا' لیکن تم ادھر ہی وائن شاپ کے آس پاس گھومتے رہے...... ہیں نا؟''

''نہیں جناب...... بالکل نہیں۔'' وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں ادھر ہی گھومتا رہتا تھا؟''

"استغاثہ کے ایک دعوے سے تو یہی تاثر ابھرتا ہے۔"

میں توقع کر رہا تھا کہ اس موقعے پر وکیل استغاثہ ضرور بیچ میں چھلانگ لگائے گا' لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی اور تشویشناک سنجیدگی سے وہ میری جرح سماعت کرتا رہا۔ اس کیس کے حوالے سے اس کے تازیانے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ زاہد اور نذیر کی گواہی نے میرے موکل کو جس طرح بے گناہ ثابت کرنے کی راہ ہموار کی تھی' اس سے استغاثہ اور وکیل استغاثہ کی گویا کمر ٹوٹ گئی تھی۔

وکیل استغاثہ کی جانب سے تو کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا' لیکن استغاثہ کے گواہ نیلسن نے تعجب خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جناب! آپ کس دعوے کی بات کر رہے ہیں......؟"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ "استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ تم نے وقوعہ کی رات ملزم کو اپنے دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر موریس کے پیچھے جاتے دیکھا تھا۔ اگر تم وائن شاپ کے آس پاس نہیں گھوم رہے تھے تو پھر تم نے یہ منظر کیسے دیکھ لیا؟"

"یہ منظر میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔" وہ متذبذب انداز میں بولا۔

"پھر کیا تمہیں الہام ہوا تھا؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"مجھے یہ بات عارف انصاری نے بتائی تھی۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

"عارف انصاری......کون عارف انصاری......؟" میں نے پوچھا۔

"عارف انصاری ایک کرائم رپورٹر ہے۔" نیلسن نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "وہ اسی علاقے میں رہتا ہے جہاں ہماری وائن شاپ ہے۔"

"عارف انصاری کس اخبار کے لئے رپورٹنگ کرتا ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

اس نے جواب میں مجھے جس اخبار کا نام بتایا وہ وہی اخبار تھا' جس کا بیورو چیف ڈاکٹر واحد تھا۔ میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! اگر اجازت ہو تو میں ملزم کے بھائی ڈاکٹر واحد سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا ڈاکٹر واحد اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہیں؟" جج نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں' ڈاکٹر صاحب موجود ہیں۔" میں نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

"اجازت ہے۔" جج نے گمبھیر آواز میں کہا۔

ڈاکٹر واحد جج کے حکم پر وٹنس باکس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا' جبکہ نیلسن وٹنس باکس کے اندر موجود تھا۔ میں نے ڈاکٹر واحد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا عارف انصاری نامی یہ کرائم رپورٹر آپ کے اخبار سے منسلک ہے؟"

"جی ہاں' وہ اسی اخبار کے سٹاف کا حصہ ہے۔" ڈاکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

ساری معلومات رکھنے کے باوجود بھی میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ کیا بات ہوئی ڈاکٹر صاحب...... وہ اخبار کے سٹاف میں تو شامل ہے' لیکن آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اپنے اس بیان کی تھوڑی وضاحت کریں گے؟"

"میں جس اخبار کا انچارج ہوں وہ صرف دو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ہمارے علاقے ہی کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دو صفحات ایک سپلیمنٹ کی طرح اسی اخبار کے ساتھ بلکہ اسی کے اندر نیوز سٹینڈ تک پہنچتے ہیں اور اس سپلیمنٹ ٹائپ اخبار پر بھی اسی اخبار کی لوح چھپی ہے جس کا یہ حصہ ہے۔" ڈاکٹر واحد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "استغاثہ کے گواہ نیلسن نے جس کرائم رپورٹر کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق مذکورہ اخبار کے ہیڈ آفس سے ہے۔ وہ سلمان فاروقی صاحب کے لئے کام کرتا ہے جو کہ اس صحافتی بزنس میں میرے پارٹنر ہیں۔ اسی بنیاد پر میں نے کہا ہے کہ کرائم رپورٹر عارف انصاری کا مجھ سے یا میرے اخبار سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔"

جیسا کہ میں ابتداء میں بتا چکا ہوں' ڈاکٹر واحد سے میری گہری دوستی تھی' لہٰذا میں اس کے اخباری معاملات سے بھی تفصیلاً آگاہ تھا' لیکن عدالت کے سامنے بعض چیزوں کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کو اپنا پرچہ (اخبار) مارکیٹ میں لائے لگ بھگ ایک ماہ ہو گیا تھا' یعنی وقوعہ کے وقت تک...... لیکن تمام تر محنت اور توجہ کے باوجود بھی خاطر خواہ مثبت نتائج سامنے نہیں آئے تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ......؟"

"سازش......!" اس نے مختصراً کہا۔

"کیسی سازش ڈاکٹر صاحب!"

میں نے پوچھا۔

"ہیڈ آفس میں کچھ لوگوں کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ سلمان فاروقی صاحب میرے ساتھ مل کر بزنس کریں۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "وہ سلمان صاحب کو اپنی مٹھی میں رکھ کر دھیرے دھیرے کاٹنا چاہتے تھے۔ جب میں نے سلمان صاحب کے آفس کا یہ حال دیکھا تو ہمدردی اور دوستی میں انہیں مشورے دینے لگا۔ میرا یہ عمل سازشی لوگوں کو بالکل پسند نہ آیا اور وہ چپکے چپکے سلمان صاحب کے کان بھرنے لگے۔" اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"سلمان صاحب کو تو وہ لوگ میرے خلاف بھڑکا ہی رہے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی عملی کوششیں جاری تھیں۔"

"عملی کوششیں...... کیا مطلب؟" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"سلمان فاروقی صاحب کو صحافتی دنیا کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔" وہ بتانے لگا۔ "اسی لئے وہ ان لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے انہیں ایک موٹی مرغی سمجھ کر پہلے ہفت روزہ نکلوایا اور بعد میں اسے روزنامہ میں تبدیل کرایا۔ مسلسل نقصان کے باوجود بھی وہ لوگ سلمان صاحب کو مستقبل کے سنہرے خواب دکھانے میں مصروف تھے...... مصروف تھے' میں نے اس لئے کہا کہ جب سے میں اور مجھ جیسے چند دوسرے لوگ سلمان صاحب کے حلقے میں آئے ہیں' ان کے لئے کافی مشکلات کھڑی ہوگئی ہیں' لہٰذا وہ لوگ پہلی فرصت میں مجھے سلمان فاروقی سے دور کر دینا چاہتے ہیں۔"

"اس دنیا میں یہ کھیل تماشے تو جاری ہی رہتے ہیں ڈاکٹر صاحب!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "خیر...... آپ سازشی عناصر کی سازشوں کے بارے میں بتا رہے تھے؟"

"انہوں نے اب تک کیا نہیں کیا وکیل صاحب!" وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "کوئی ایک زیادتی ہو تو بتاؤں......"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔ "میرے فاضل دوست نے ایک نئی کہانی شروع کر دی ہے۔"

"جناب عالی!" میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ٹھوس الفاظ میں کہا۔ "یہ کہانی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس بات کا پتا چلانا بہت ضروری ہے کہ کرائم رپورٹر عارف انصاری نے استغاثہ کے گواہ نیلسن کو مس گائیڈ کیوں کیا تھا۔ جب ملزم اپنے دوست کے ہمراہ مقتول کے تعاقب میں نہیں گیا تو کرائم رپورٹر کو اس غلط بیانی کی ضرورت کیوں پیش آئی......؟"

"بیگ صاحب...... پلیز پروسیڈ!"

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

میں دوبارہ ڈاکٹر واحد کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ بتانے لگا۔ "وکیل صاحب! کئی روز تک تو میرے والے دو صفحات کے بغیر ہی اخبار علاقے میں آتا رہا۔ میں نے سلمان صاحب سے شکایت کی۔ انہوں نے کارروائی کر ڈالی۔ اخبار میرے علاقے میں پہنچنے لگا' لیکن ڈپو سے بنڈل جیسے بندھے ہوئے آتے تھے' ویسے ہی نیوز سٹینڈ کی بغل میں رکھے رہتے تھے۔ میری کوشش اور بھاگ دوڑ سے اخبار ڈسپلے ہونے لگا' لیکن اس طرح کہ دوسرے اخبارات کے نیچے دبا کر۔ میرے رپورٹرز' فوٹو گرافرز اور سٹاف کے دیگر افراد کو ورغلانے اور گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے حالات کا مقابلہ کس طرح کیا ہے۔"

"یہ تو وہ سازشیں ہیں جو ہیڈ آفس کے لوگ کر رہے تھے تاکہ وہ سلمان فاروقی کو اپنی گرفت میں رکھ کر فائدے حاصل کرتے رہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ اس امر پر بھی روشنی ڈالیں گے کہ کرائم رپورٹر عارف انصاری نے استغاثہ کے گواہ نیلسن سے دروغ گوئی کیوں کی؟"

"اس لئے کہ میرے سپلیمنٹ سے سب سے زیادہ تکلیف اسی شخص کو پہنچی تھی۔" ڈاکٹر نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"وہ کس طرح ڈاکٹر صاحب؟"

میں نے استفسار کیا۔

"عارف انصاری بھی اسی علاقے کا رہنے والا ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ ایک اخبار کا کرائم رپورٹر ہونے کے ناتے یہاں کے مقتدر حلقوں' نیوز سٹینڈ والوں اور ہاکرز وغیرہ پر اس کے اثرات ہیں۔ میری عارف انصاری سے اور عارف انصاری کی مجھ سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں'

لیکن سلمان صاحب کی زبانی مجھے جو حالات پتا چلے ہیں ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ عارف انصاری کو میرے کام سے بڑا گہرا صدمہ پہنچا تھا۔''

''سلمان فاروقی نے آپ کو ایسی کون سی بات بتا دی تھی؟''

''سلمان صاحب کے مطابق عارف انصاری اپنے علاقے کا بیورو چیف بننا چاہتا تھا۔'' ڈاکٹر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن سلمان صاحب نے اس کی بات نہیں مانی اور مجھ سے پارٹنر شپ کر لی۔ سلمان صاحب کا یہ فیصلہ عارف انصاری کو بہت ناگوار گزرا تھا' اسی لئے اس نے میرے کام کی راہ میں مختلف انداز سے روڑے اٹکانا شروع کر دیئے تھے۔''

''ہوں......'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ عارف انصاری نے استغاثہ کے گواہ نیلسن سے جو غلط بیانی کی ہے اس سے وہ کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا؟''

''یہ تو اسے عدالت میں بلا کر ہی پوچھا جا سکتا ہے۔'' ڈاکٹر واحد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دیٹس آل یور آنر!''

میں نے ڈاکٹر سے سوالات کا سلسلہ موقوف کر دیا۔

جج تھوڑی دیر تک اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کو گھورتا رہا' پھر وکیل استغاثہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ آپ کی ڈیوٹی ہے کہ آئندہ پیشی پر کرائم رپورٹر عارف انصاری عدالت میں حاضر ہو اور بیگ صاحب......''

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

'آپ جوزف نامی اس شخص کو عدالت میں لائیں گے' جو مقتول سے شدید نفرت کرتا تھا۔''

میں نے نہایت ہی احترام سے کہا۔ ''اگرچہ جوزف کو عدالت میں حاضر کرنا بھی استغاثہ ہی کے فرائض کا حصہ ہے' لیکن معزز عدالت کا حکم سر آنکھوں پر......''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور عدالت برخاست کر دی۔

***

اگلی پیشی پر میں نے مقتول کے رقیب روسیاہ کو گواہی کے لئے عدالت میں پیش کر دیا۔ جوزف کے حلفیہ بیان نے اس کی جائے وقوعہ سے عدم موجودگی ثابت کرتے ہوئے اسے بے گناہ قرار دے دیا' لہٰذا عدالت نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ جوزف کو مورس سے جذباتی دشمنی ضرور تھی' لیکن وہ اس کی موت کا خواہاں ہرگز نہیں تھا۔ مورس کو پیش آنے والے واقعے کا اسے دلی افسوس تھا۔ وہ محبت میں حسد اور رقابت کا شکار ہو گیا تھا' تاہم ان کیفیات میں بھی اس نے کبھی مورس کی جان لینے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

اس پیشی پر وکیل استغاثہ کرائم رپورٹر عارف انصاری کو عدالت میں پیش نہ کر سکا۔ پتا چلا کہ وہ اندرون سندھ ڈاکوؤں کی پناہ گاہوں کے حوالے سے کوئی خاص مہم سر کرنے گیا ہوا ہے۔ اس کے بعد والی دو' تین پیشیوں پر بھی جب وہ غیر حاضر رہا اور وکیل استغاثہ اس کی مصروفیات کے حوالے سے مختلف عذر گھڑنے میں مصروف نظر آیا تو میں نے جج سے کہا۔

''جناب عالی! اب تک کی عدالتی کارروائی کے نتیجے میں میرا موکل اور اس کیس کا ملزم عاقل مکمل طور پر بے گناہ ثابت ہو چکا ہے لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ اس بے قصور کو عدالتوں میں مزید گھسیٹنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہو گا۔ چنانچہ اس کی باعزت بریت کے احکامات صادر کرتے ہوئے' اس کے خلاف دائر اس کیس کو فی الفور خارج کیا جائے۔''

جج نے میری درخواست پوری توجہ سے سنی' پھر وکیل استغاثہ کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگلی پیشی پر ہر صورت میں کرائم رپورٹر عارف انصاری کو عدالت میں حاضر ہونا چاہئے ورنہ ملزم کے حق میں فیصلہ سنا دیا جائے گا۔''

آئندہ پیشی کی تاریخ آنے سے پہلے ہی عارف انصاری کی خبر آ گئی اور وہ ایسی خبر تھی کہ اب اسے عدالت میں حاضر ہونے کی حاجت نہیں رہی تھی۔ وہ اس عدالت کی جانب بڑھ گیا تھا' جہاں کے فیصلے حتمی ہوتے ہیں۔

واقعات کے مطابق لینڈ مافیا کے ایک گروہ سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ کرائم رپورٹر ہونے کے ناتے اکثر جرائم پیشہ افراد سے اس کے رابطے استوار تھے اور وہ ہر ایک سے بھتہ بھی لیا کرتا تھا' لیکن لینڈ مافیا کے مذکورہ گروہ کے ساتھ اس کی ایسی بگڑی کہ انہوں نے چلتی ہوئی سڑک پر اسے گولیوں سے بھون ڈالا۔

موقع پر موجود افراد میں سے چند ایک نے ہمت کی اور اسے اٹھا کر قریبی ہسپتال لے گئے' لیکن اس کی جان نہ بچائی جا سکی۔ اپنی زندگی کی آخری سانسوں میں دیگر اعترافات کے ساتھ ہی اس نے مورس کے قتل کا اقرار بھی کر لیا۔

اس کی مورس کے ساتھ براہ راست کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس نے یہ خونیں ڈرامہ محض ڈاکٹر کے بھائی کو پھنسانے کے لئے کیا تھا' لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ...... جسے اللہ رکھے' اسے کون چکھے۔

ڈاکٹر کا بھائی باعزت بری ہو کر گھر چلا گیا اور کرائم رپورٹر عارف انصاری کی موت نے اسے ایک ایسی عدالت میں پہنچا دیا' جہاں صرف اور صرف انصاف ہوتا ہے۔

***

پکا دھاگہ

اگرچہ یہ کوئی فارمولا نہیں' تاہم تجربہ بتاتا ہے کہ سال کے بعض مہینے اور ان مہینوں کے چند دن ایسے ہوتے ہیں کہ مصروفیت انسان کو سر کھجانے کی مہلت نہیں دیتی۔ کم از کم میرے ساتھ تو ایسا ہی تھا...... وہ بھی کچھ اسی قسم کا دن تھا۔

میں حسب معمول اپنے دفتر میں بیٹھا کلائنٹس کو نمٹا رہا تھا۔ میرے چیمبر سے ایک نکلتا تو دوسرا داخل ہوتا۔ میں عدالتی بکھیڑوں سے فارغ ہونے کے بعد لنچ کرتا تھا اور اس کے بعد اپنے دفتر میں آ کر بیٹھ جاتا تھا' جو سٹی کورٹ کے نزدیک ہی' ایک ملٹی سٹوری بلڈنگ میں واقع تھا۔ مذکورہ بلڈنگ میں زیادہ تر وکلاء ہی کے دفاتر ہیں۔

میں عموماً رات نو بجے آفس سے اٹھ جایا کرتا ہوں' لیکن اس روز کلائنٹس نے کچھ ایسی یلغار کی تھی کہ یوں محسوس ہوتا تھا' آج کی رات یہیں پر گزرے گی۔ لگ بھگ ساڑھے آٹھ بجے میں نے اپنی سیکرٹری کو انٹرکام کیا۔

''ہیلو آمنہ! لابی کی کیا صورت حال ہے؟''

میں نے حال ہی میں آمنہ کو اپائنٹ کیا تھا۔ لابی سے مراد میرے آفس کا وہ حصہ تھا' جہاں کلائنٹس بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔

آمنہ نے بتایا۔ ''سر! پانچ میل اور ایک فی میل موجود ہے۔''

''اوکے......'' میں نے سکھ کی سانس خارج کرتے ہوئے ریسیور کریڈل کر دیا۔ پانچ اور ایک' چھ...... کلائنٹس کو نمٹانے میں کم از کم ایک گھنٹہ تو لگنا ہی تھا۔ لہٰذا یہ بات طے تھی کہ آج آدھے پونے گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔ میں اللہ کا نام لے کر شروع ہو گیا۔

میرے چیمبر میں سب سے آخر میں جو کلائنٹ داخل ہوا وہ وہی فی میل تھی' جس کے

بارے میں مجھے آمنہ بتا چکی تھی۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس خاتون کا استقبال کیا اور اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

اس نے رسمی علیک سلیک کے دوران میں مجھے اپنا نام سلطانہ بتایا تھا۔ وہ ایک پُرکشش اور خوش شکل عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس کے آس پاس قائم کیا' جو بعدازاں درست ثابت نہیں ہوا۔ وہ زندگی کی بیالیس بہاریں دیکھ چکی تھی۔ بڑی سدابہار جوانی تھی اس کی۔ میں نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی' جو ساڑھے نو کا وقت بتا رہا تھا۔ میں اپنے ٹارگٹ سے تھوڑا پیچھے تھا۔ اب تک مجھے تمام کلائنٹس کو نمٹا دینا چاہئے تھا۔ بہرحال' میں نے سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت ہی شائستہ انداز میں پوچھا۔

''جی فرمائیں...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''آپ ایک وکیل کی حیثیت سے دفتر کھولے بیٹھے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اور مجھے قانونی مدد کی ضرورت ہے۔ میں آپ کے تعاون سے ایک کیس دائر کرانا چاہتی ہوں' اسی لئے حاضر ہوئی ہوں۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوالیہ انداز میں سلطانہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''جی...... کیس کی نوعیت کیا ہے؟''

بات ختم کرتے ہی میں نے کاغذ قلم سنبھال لیا۔ سلطانہ نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''نوعیت...... ہے چھٹکارا۔''

''آپ عدالت کے ذریعے کس غم سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہیں؟''

''اس غم کا نام ہے رئیس شاہ!'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔

اس کا مطمح نظر بڑی حد تک میری سمجھ میں آ گیا تھا' لیکن پھر بھی تصدیق کی خاطر میں نے پوچھنا ضروری جانا۔

''رئیس شاہ...... غالباً آپ کے شوہر کا نام ہے؟''

''آپ بالکل درست جگہ پر پہنچے ہیں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ایک قابل اور دوراندیش وکیل ہیں۔''

میں نے اپنی تعریف کو سنی ان سنی کرتے ہوئے سلطانہ سے استفسار کیا۔ ''لگے ہاتھوں اس درست جگہ کا حدودِ اربعہ بھی بیان کریں' جہاں میں بہ آسانی پہنچ گیا ہوں۔''

سلطانہ نامی وہ خاتون بڑی پُراعتماد اور نڈر محسوس ہوتی تھی۔ وہ بڑے کھلے ڈلے انداز میں مجھے اپنے مسئلے سے آگاہ کر رہی تھی۔ میرے سوال کے جواب میں وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''نام تو میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔ ہماری شادی کو صرف دو سال ہوئے ہیں۔ رئیس شاہ ایک نجومی ہے۔ زائچہ وغیرہ بنا کر لوگوں کی قسمت کا حال بتاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ قیمتی پتھروں کا کاروبار بھی کرتا ہے۔ کسی وقت اس نے نجوم کی دکان ناظم آباد میں سجا رکھی تھی اور اس کی رہائش یو پی موڑ پر تھی۔ ان دنوں ہم نارتھ ناظم آباد میں رہتے تھے۔ پھر ہماری شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد ہم لوگ گلشن اقبال کے ایک پوش بلاک میں شفٹ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی رئیس شاہ نے اپنا کاروبار بھی گلشن میں یعنی بنگلے کے اندر ہی منتقل کر دیا۔ ناظم آباد کی ایک چھوٹی سی دکان میں جو کام ''آستانہ رئیسیہ'' کے بینر تلے جاری تھا' وہ گلشن پہنچ کر ''شاہ کلینک'' میں بدل گیا۔ علاقہ اور ماحول بدلا تو شاہ صاحب ایک عام نجومی سے کنسلٹنٹ اور پروفیسر شاہ بن گئے اور ظاہر ہے' ان کی فیس میں بھی اضافہ ہو گیا......'' اس نے چند لمحات کا توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''یہ ہیں اب تک کے حالات بیگ صاحب!''

اس نے بڑی بے تکلفی سے مجھے ''بیگ صاحب'' کہا تو میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''سلطانہ جی! آپ نے اپنے شوہر کا جو جغرافیہ اور تاریخ بیان کی ہے' اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ آپ لوگوں نے ہر گزرتے دن کے ساتھ ترقی کی ہے اور......''

''آپ لوگوں نے نہیں بیگ صاحب!'' وہ قطعی کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''صرف رئیس شاہ کہیں۔''

''خیر......'' میں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''کان سیدھی طرح پکڑیں یا ہاتھ گھما کر' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رئیس شاہ کی ترقی' آپ ہی کی ترقی سمجھی جائے گی۔ آپ اس کی بیوی ہیں۔''

"میں آپ کی بات سے اتفاق نہیں کروں گی بیگ صاحب!" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔ "اگر رئیس شاہ کی ترقی میری ترقی ہوتی تو پھر مجھے اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ضرورت پیش نہ آتی۔" لمحاتی توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے جب تک میں آپ کو رئیس شاہ کی عیاری اور مکاری کی کہانی نہیں سناؤں گی' آپ میرے مسئلے کو سمجھ نہیں سکیں گے......"

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں' آپ کہانی شروع کر دیں......" مجھے دیر تو ہو ہی چکی تھی۔ تھوڑا وقت سلطانہ کو مزید دے دیتا تو اس سے کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔ جب تک میں اس کی کہانی نہ سنتا' کیس واضح نہیں ہوسکتا تھا۔

اس روز سلطانہ نامی اس خوب صورت عورت کی زبانی ان میاں بیوی کے جو حالات میرے علم میں آئے' میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں' تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔ میں نے اس کہانی میں سے غیر ضروری باتوں کو دانستہ حذف کر دیا ہے اور بہت سی باتیں اس لئے چھپا لی ہیں کہ ان کا انکشاف مناسب موقع پر ہی موزوں رہے گا۔

***

رئیس شاہ کی عمر اس وقت لگ بھگ پچاس سال رہی ہو گی۔ وہ مناسب صحت اور متناسب بدن کا مالک ایک شاطر انسان تھا۔ سلطانہ سے شادی سے قبل وہ یوپی موڑ' نیو کراچی میں رہائش پذیر تھا۔ اس نے کسی زمانے میں شادی بھی کی تھی' لیکن پہلی بیوی سلمیٰ سے اس کی کبھی نہیں بنی تھی۔ وہ جتنا عرصہ بھی میاں بیوی کی حیثیت سے ایک چھت کے نیچے رہے' صبح شام ان میں لڑائی جھگڑا ہوتا رہا۔ اسی دوران میں ان کی ایک بیٹی بھی پیدا ہوگئی۔ رئیس شاہ ان دنوں باقاعدہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اگر کچھ کرتا بھی تھا' وہ کام تھا "ٹھیلا لگانا" اور آئے دن اس ٹھیلے کی نوعیت بھی بدلتی رہتی تھی۔ کبھی وہ سبزی کا ٹھیلا بن جاتا' کبھی چنا چاٹ کا' کبھی بریانی کا تو کبھی بن کباب کا اور کبھی بھوسی ٹکڑے کا۔ میاں بیوی کے بیچ اختلاف اور جھگڑے کے اور بھی بہت سے عوامل ہوں گے' لیکن سب سے بڑا سبب معاشی تنگی ہی تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ یہ کہ اس زمانے میں وہ محض رئیس ہوا کرتا تھا......

سب کچھ اپنے ڈھب پر آگے بڑھتا رہا اور جب ان کی بیٹی صدف دو سال کی ہوئی تو یک رات سلمیٰ کا انتقال ہو گیا۔ رئیس شاہ کا کوئی بہن بھائی یا قریبی رشتہ دار اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔ دو سال کی بچی کی پرورش کوئی آسان کام نہیں تھا' لہٰذا صورتحال کو دیکھتے ہوئے مدف کا ماموں اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اعجاز حسین اور نزہت کے اپنے بھی بچے تھے' ہذا صدف ماموں زاد بہن بھائیوں کے ساتھ پروان چڑھنے لگی۔ اس دوران میں ایک عجیب یز دیکھنے میں آئی۔

ابتداء میں تو دنیا دکھاوے کے لئے رئیس شاہ اپنی بچی سے ملنے اعجاز حسین کے گھر جاتا ہا' پھر اس نے رخ پھیر لیا۔ صدف کی جانب سے اس کی بے اعتنائی عام لوگوں کی سمجھ میں ہیں آتی تھی' مگر اعجاز حسین اور اس کی بیوی نزہت' رئیس شاہ کے ذہن میں کلبلانے والے ک کے کیڑے سے بہ خوبی آگاہ تھے اور انہوں نے اس کی بے مروتی کا کوئی خاص نوٹس نہیں یا تھا۔ واضح رہے کہ رئیس شاہ کا مذکورہ شک سلمیٰ کے کردار کے حوالے سے تھا۔ اس نے مدف کو اپنی اولاد ہی تسلیم نہیں کیا تھا۔ میاں بیوی کے مابین ہونے والے آئے روز کے فساد ی ایک نمایاں وجہ یہ بھی تھی۔ بہرحال' رئیس شاہ نے صدف کی جانب سے مکمل لاتعلقی اختیار کر لی تھی۔ پھر کچھ عرصے کے لئے وہ یوپی موڑ کے منظر سے بھی غائب ہو گیا۔

تین ماہ کے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ لوگوں نے دیکھا کہ اس کی دنیا بدل گئی تھی۔ وہ ب پہلے والا رئیس نہیں رہا تھا۔ رئیس شاہ بن گیا تھا۔ اس نے ڈاڑھی چھوڑ دی تھی اور رکھ رکھاؤ ں بھی بڑا سنجیدہ پن آ گیا تھا۔ پتا چلا کہ وہ اب ٹھیلا نہیں لگاتا' بلکہ محنت مزدوری والا کوئی بھی ام نہیں کرتا' کیونکہ وہ عامل کامل اور نجومی وغیرہ بن چکا تھا۔ یہ تین ماہ اس نے شیخوپورہ میں لزارے تھے اور وہاں کسی پہنچے ہوئے بابا سے اس نے عملیات اور نجوم کے بارے میں بہت چھ سیکھا تھا۔

اس قسم کے تن تنہا لوگ عموماً اپنی اقامت گاہ ہی میں نشست کا بندوبست کرتے ہیں' لیکن رئیس شاہ نے ذرا مختلف انداز میں اپنی پریکٹس کا آغاز کیا۔ رہائش تو اس نے یوپی موڑ پر ی رہنے دی' البتہ آستانے کے لئے اس نے ناظم آباد کے علاقے کا انتخاب کیا۔ سیف اللہ ے اڈے کے نزدیک ہی رئیس شاہ نے "آستانہ رئیسیہ" قائم کر لیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ لوگوں کے یچے بناتا' انہیں روحانی مشورے دیتا' بندش وغیرہ کا جوڑ توڑ کرتا' ان کے لئے مختلف پتھر اور

نگینے تجویز کرتا اور الواح وطلسمات بھی دیتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا دھندا چل نکلا اور اس کا آستانہ خواتین وحضرات سے آباد نظر آنے لگا۔

ہمارے ملک بلکہ ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ یہاں دو پیشوں کے لئے کسی سند، ڈگری، ڈپلومہ، لائسنس کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جس کا جی چاہے، وہ بڑے دھڑلے سے یہ کام شروع کر سکتا ہے۔ اول پیشہ گداگری، دوم پیشہ پیری۔ بس، آپ دل میں ٹھان کر کسی بھی جگہ جم کر بیٹھ جائیں۔ نہ بھیک دینے والوں کی کمی ہے اور نہ ہی اندھی عقیدت رکھنے والے جاں نثار مریدوں کا کال ہے، مگر صاحب سلسلہ اور صاحب نسبت سچے اور کھرے، اہل علم و اہل ہنر کا میں دل سے احترام کرتا ہوں۔ رئیس شاہ کے پاس آنے والے سائلین کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ سائلین اس کے کلائنٹس تھے۔ انہی لوگوں میں ایک خاتون تھی قمر النساء۔

قمر النساء کو وہم ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی زیب النساء پر کسی نے کچھ کر دیا ہے۔ یعنی وہ کسی بندش کے زیر اثر ہے۔ جہاں بھی اس کے رشتے کی بات چلتی تھی، تھوڑے ہی دنوں میں معاملات بگڑ کر ختم ہو جاتے تھے۔ حالانکہ اللہ نے اس کی بیٹی کو شکل اور عقل سب کچھ دے رکھا تھا۔ عمر تیزی سے نکلی جا رہی تھی اور وہ زیب النساء کی شادی کے لئے بہت پریشان تھی۔ اس لئے بھی کہ زیب النساء کا باپ عبدالقادر اس دنیا سے اٹھ چکا تھا۔ اگرچہ نارتھ ناظم آباد میں ذاتی بنگلا تھا۔ عبدالقادر نے اپنی زندگی میں مختلف مالیاتی اداروں میں اچھی خاصی رقم انوسٹ کر رکھی تھی، جہاں سے بڑا معقول منافع آ جاتا تھا، جو ان تینوں کی گزر بسر کے لئے بہت کافی تھا۔ تینوں سے مراد قمر النساء، زیب النساء اور زیب النساء کا چھوٹا بھائی فیصل۔ فیصل کی عمر پندرہ کے آس پاس تھی۔ وہ ایک نکما اور آوارہ نوجوان تھا۔

قمر النسا نے اپنی کسی جاننے والی سے رئیس شاہ کی شہرت سنی تو ایک روز وہ فیصل کے ساتھ آستانہ رئیسیہ پر پہنچ گئی۔ رئیس شاہ اپنے پاس آنے والوں کا بہ غور جائزہ لیتے ہوئے ابتدائی چند سوالات ہی میں ان کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر لیا کرتا تھا۔ بہر حال، یہ رئیس شاہ کی چالاکی تھی یا اس کا طریقہ واردات...... تاہم وہ اس ہنر میں بہت طاق تھا۔ قمر کے ساتھ بھی اس نے یہی حربہ آزمایا اور آخر میں کہا۔

''جی خاتون...... بتائیں، میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟''

''میں اپنی بیٹی زیب (زیب النساء) کے سلسلے میں حاضر ہوئی ہوں شاہ جی۔'' قمر النساء نے دھیمی آواز میں کہا، پھر اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔

رئیس شاہ نے بڑی توجہ سے اس کی بات سنی اور گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''لڑکی کا زائچہ بنانا پڑے گا۔''

''زائچہ بنائیں جی یا کوئی تعویذ وغیرہ دیں۔'' قمر عقیدت بھرے لہجے میں بولی۔ ''بس میرا کام ہونا چاہئے۔''

''جب آپ میرے آستانے تک آ گئی ہیں تو سمجھیں کہ کام تو سو فیصد ہو گا۔'' رئیس شاہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تعویذ یا علاج معالجے کی باری تو بعد میں آئے گی۔ پہلے زائچہ بنا کر یہ تو دیکھ لوں کہ لڑکی کے ساتھ مسئلہ کیا ہے......؟'' وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''زائچے کی تیاری کے لئے آپ مجھے چند چیزیں فراہم کریں گی۔''

''جی......کون سی چیزیں؟'' قمر نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مثلاً زیب کی تاریخ پیدائش، وقت پیدائش اور مقام پیدائش...... مقام پیدائش سے میری مراد پیدائش کا ضلع وغیرہ ہے، وہ علاقہ جہاں آپ کی صاحب زادی پیدا ہوئی تھی......؟''

قمر نے شاہ جی کو مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔

رئیس شاہ نے مختلف حسابات کے بعد کاغذ پر ایک چوکور ڈبہ سا بنایا پھر اس کے اندر عمودی، افقی اور ترچھی لائنیں کھینچ کر چند تکونیں اور مربع واضح کئے۔ ان خانوں میں اس نے ستاروں اور سیاروں کی الٹی اور سیدھی چالیں درج کیں، پھر چند منٹ کے غور وخوض کے بعد وہ تشویش بھرے انداز میں بولا۔

''آپ کی صاحب زادی تو ساڑھ ستی میں پھنسی ہوئی ہے۔''

''ساڑھ ستی!'' قمر نے تعجب خیز نظر سے رئیس شاہ کو دیکھا۔ ''شاہ جی، یہ کیا بلا ہے؟''

''بالکل درست فرما رہی ہیں آپ۔'' وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔ ''ساڑھ ستی ایک خوفناک بلا ہی کی طرح ہوتی ہے۔ اسے زحل کی نحوست سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔''

''ہاں ہاں......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے زحل کا نام سن رکھا

ہے۔''

''یہ بہت ہی مشکل اور سخت سیارہ ہے۔'' رئیس شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''یہ اپنے مخصوص دور میں انسان پر جو سختی اور پریشانی لاتا ہے' اس میں بندہ بے بس اور مجبور ہو کر رہ جاتا ہے۔ آپ اس دور کو زحل کی بندش سمجھ لیں۔''

''یہ بندش اور نحوست ختم کیسے ہوگی شاہ جی؟'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔

''ہم کس لئے آستانہ کھولے بیٹھے ہیں۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔''ہم آپ کی صاحب زادی کی اور آپ کی مشکل حل کریں گے۔''

''اس کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' قمرالنساء نے پوچھا۔

''آپ کو بس ہماری ہدایت پر عمل کرنا ہوگا۔''

''جو حکم ہو شاہ جی......'' وہ بڑی فرماں برداری سے بولی۔

رئیس شاہ کوئی حکم دینے کے بجائے زیب کے زائچے میں غرق ہو گیا۔ چند لمحات کی سوچ بچار کے بعد اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''آپ کی صاحب زادی جیسا کہ میں نے بتایا' پیدائشی طور پر ساڑھ ستی کا شکار ہے اور آج کل یہ منحوس زحل اس کے ساتویں گھر سے گزر رہا ہے' جو شراکت داری سے منسوب ہے۔ بزنس پارٹنر شپ اور لائف پارٹنر شپ وغیرہ......جبھی اس کی شادی کے سلسلے میں رکاوٹیں اور پریشانیاں آرہی ہیں۔ بہرحال......'' وہ لمحہ بھر کے لئے متوقف ہوا' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''بہرحال' آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں زحل کی نحوست کو کاٹنے والی لوح آپ کو دوں گا' جو آپ کی صاحب زادی کو اپنے پاس رکھنا ہوگی۔ اس کے علاوہ اسے ایک پتھر بھی پہننا ہوگا۔ پھر دیکھیں کمال......سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

قمر نے سکھ کی ایک گہری سانس لی' پھر تشکرانہ لہجے میں بولی۔''آپ نے تو میرا مسئلہ ہی حل کر دیا شاہ جی......''

شاہ جی نے لوح زحل' قمر کے حوالے کی اور پوچھا۔''نگینہ آپ مجھ سے لیں گی یا لکھ دوں۔ آپ کسی جوہری سے خرید کر اور چاندی کی انگوٹھی میں جڑوا کر اپنی بیٹی کو پہنا دینا۔''

''اگر آپ کے پاس ہے تو آپ ہی دے دیں۔'' قمرالنساء نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

''میں کہاں مارکیٹ میں ڈھونڈتی پھروں گی' پھر مجھے پتھروں وغیرہ کی پہچان بھی نہیں ہے۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''جواہرات کی مارکیٹ میں ایک سے بڑھ کر ایک فنکار بیٹھا ہوا ہے۔ میرے عقیدت مندوں میں دو تین ایسے کاروباری افراد ہیں جو تھائی لینڈ' برما' سری لنکا وغیرہ جاتے رہتے ہیں۔ میں ان سے نگینے منگوا لیتا ہوں۔ یہ اوپن مارکیٹ کی نسبت مجھے سستے بھی پڑتے ہیں اور اس بات کا بھی اطمینان ہوتا ہے کہ مال کھرا ہے۔''

قمرالنساء شاہ جی کی اس تقریر دل پذیر سے بہت متاثر ہوئی اور پرس کھولتے ہوئے بڑے احترام بھرے انداز میں پوچھا۔

''شاہ جی! میں کیا پیش کروں......؟''

رئیس شاہ نے قمرالنساء کی پیشکش کے جواب میں حساب جوڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''زائچے کی فیس' لوح زحل اور نگینہ انگوٹھی سمیت کل ملا کر آپ پانچ ہزار ادا کر دیں۔''

قمر سوچ میں پڑ گئی۔ اس زمانے میں پانچ ہزار کی رقم کوئی معنی رکھتی تھی۔ شاہ جی نے اس کے تذبذب کے پیش نظر نفسیاتی حربہ آزمایا اور قمر سے پوچھا۔

''کیا میں نے زیادہ پیسے بتا دیئے ہیں؟''

''نن......نہیں۔'' قمر نے نفی میں گردن ہلائی۔''یہ بات نہیں ہے شاہ جی۔''

''پھر آپ کے چہرے پر پریشانی اور الجھن کیوں نمودار ہوئی؟'' رئیس شاہ نے قدرے شاکی انداز میں کہا۔''تین سو روپے تو میں زائچے کی فیس لیتا ہوں۔ لوح رد نحوست زحل کی قیمت پانچ سو لگائی ہے۔ چار قیراط کا نیلم میں چار ہزار میں آپ کو دے رہا ہوں۔ دو سو چاندی کی انگوٹھی کے لگائے ہیں۔ ایک خاص بات بتاؤں میں آپ کو......''

اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

''جو نیلم میں آپ کو دوں گا نا اس کا رنگ مور کی گردن جیسا نیلا ہے اور دانہ بھی بالکل شفاف ہوگا۔ نیلم کی یہ قسم سب سے زیادہ قیمتی اور نایاب سمجھی جاتی ہے۔ بازار میں اس کی قیمت دو' اڑھائی ہزار روپے قیراط سے شروع ہو کر دس ہزار روپے قیراط تک جاتی ہے اور جہاں تک

لوح کا تعلق تو......'' وہ ایک مرتبہ پھر ٹھہرا اور زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔

''خاتون! آپ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوگی کہ یہ لوح بنانے کے لئے برسوں موقع کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ زحل کو جب شرف ہوتا ہے یا جب یہ اوج پر ہوتا ہے تو مخصوص تاریخوں کے مقررہ اوقات میں یہ لوح بڑی احتیاط سے تیار کی جاتی ہے۔''

''شاہ جی! مجھے آپ پر مکمل بھروسہ ہے۔'' اس کے خاموش ہونے پر قمر النساء نے وضاحتی انداز میں کہا۔ ''آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔''

''جب مجھ پر بھروسہ ہے تو پھر ہچکچاہٹ کیسی؟''

''وہ دراصل...... میں اس لئے گڑبڑا گئی تھی کہ اس وقت میرے پرس میں کوئی تین ہزار روپے رکھے ہوں گے......''

''تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔'' ایسے مواقع پر رئیس شاہ بڑی خوبصورتی سے کھیلتا تھا۔ ادھار کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔ انگوٹھی کی تیاری میں تو ویسے بھی دو تین دن لگ ہی جائیں گے۔ ابھی آپ لوح زحل لے جائیں اور انگوٹھی کا سائز دے جائیں۔ جب آپ دوبارہ آئیں گی تو باقی کی رقم ادا کر کے نیلم کی انگوٹھی لے جایئے گا۔''

''شکریہ شاہ جی!'' وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے تو میرے ذہن کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔''

رئیس شاہ نے زبان سے کچھ نہ کہا' یک ٹک حریصانہ نظر سے قمر کے پرس کو دیکھتا چلا گیا۔ قمر نے تین ہزار کے نوٹ گن کر اس کی جانب بڑھا دیئے۔ شاہ جی نے رقم وصول کرتے ہوئے رسماً پوچھ لیا۔

''واپسی کا کرایہ تو ہے نا آپ کے پاس...... چاہیں تو ان میں سے کچھ رکھ لیں۔ جب دوبارہ آئیں گی تو دے دیجئے گا۔''

''میرے پرس میں تین چار سو روپے رکھے ہیں۔'' قمر نے جواب دیا۔ ''پریشانی والی کوئی بات نہیں۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی! ذرا میرے بیٹے کا حساب بھی تو لگائیں۔'' اس کا اشارہ ساتھ آئے ہوئے فیصل کی طرف تھا۔

''برخوردار کا حساب میں لگا چکا ہوں۔'' رئیس شاہ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''جی......؟'' وہ سوالیہ نظر سے شاہ جی کو تکنے لگی۔

''جب یہ نوجوان میرے آستانے میں داخل ہوا تھا تو اس پر پڑنے والی پہلی نظر ہی سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ سحری اثرات میں گرفتار ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں شاہ جی۔'' وہ پرزور تائید کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ دو تین سال پہلے تک ایسا نہیں تھا۔ زیادہ خرابی ایک سال پہلے سے شروع ہوئی ہے۔ تعلیم کو خیرباد کہہ چکا ہے اور سارا دن آوارہ گردی میں گزارتا ہے۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بول دوں تو چڑ جاتا ہے۔ زیب سے بھی دن رات اس کا جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا' میرے گھر کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔''

''ایک قریبی رشتے دار کی۔'' رئیس شاہ نے بڑے شاطرانہ انداز میں کہا۔ ''اور وہ ایک عورت ہے......''

قمر النساء چونک کر حیرت بھری نظر سے رئیس شاہ کو دیکھنے لگی۔

وہ اپنے طریقہ واردات کو دراز کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ چھوٹے قد کی ایک سانولی عورت ہے' جس کی ایک دبلی پتلی بیٹی بھی ہے......'' رئیس شاہ کی نفسیاتی تک بندیاں جاری رہیں۔ ''اور اس عورت کا تعلق تمہاری سسرال یعنی فیصل کی ددھیال سے ہے۔ آج کل تم دونوں کا مذکورہ عورت سے ملنا جلنا بھی نہیں...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ نے تو...... میری نند...... نیلو کا نقشہ کھینچ ڈالا ہے شاہ جی۔'' قمر نے حیرت میں دبی ہوئی سرسراتی آواز میں کہا۔

''کیا میرا کھینچا ہوا نقشہ درست ہے؟''

''بالکل درست ہے شاہ جی۔'' قمر النساء نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ نیلوفر عرف نیلو میرے مرحوم شوہر کی چھوٹی بہن ہے۔ ادھر میٹروول کے علاقے میں اس کی ہائش ہے۔ اس کی ایک دبلی پتلی بیٹی فرحانہ بھی ہے' جو لگ بھگ فیصل کی ہم عمر ہے۔ نیلو کا ادہ تھا میں فیصل کے لئے فرحانہ کو پسند کر لوں' لیکن میں نے دوٹوک الفاظ میں منع کر دیا۔''

''اور آپ کے اس انکار کے بعد ہی فیصل کی حالت میں منفی تبدیلی رونما ہونا شروع ئی تھی' جو اس وقت عروج کی طرف بڑھ رہی ہے۔'' رئیس شاہ نے ماہر شکاری کے مانند جال

پھینک کر آہستہ آہستہ کھینچنا شروع کیا۔

رئیس شاہ ان لوگوں سے بہت خوش ہوتا تھا' جو اس کے کام کو سہل بنا دیا کرتے تھے' یعنی پریشانی کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اسے ایسے نکات فراہم کر دیا کرتے تھے' جن کی بنا پر وہ بہ آسانی اپنا کھیل' کھیل لیا کرتا تھا۔ قمر بھی ایک ایسا ہی شکار تھی۔

''شاہ جی! میں آپ کی علمیت اور کاملیت کو مان گئی ہوں۔'' وہ عقیدت بھری نظر سے رئیس شاہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

''نیلو نے ایک ہندو عامل سے فیصل پر بڑا گندا عمل کروا رکھا ہے۔'' رئیس شاہ نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اگر فوری طور پر اس کا توڑ نہ کیا گیا تو بچے کا دماغ بھی الٹ سکتا ہے۔''

''ڈرانے والی خطرناک باتیں نہ کریں شاہ جی!'' وہ خوف زدہ نظر سے رئیس شاہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میرے فیصل کا علاج کریں۔''

''بچے کا علاج میں ضرور کروں گا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس کے لئے جھلی پر زعفران سے سات فلیتے تیار کرنا ہوں گے' جو نام مع والدہ کے حساب سے بنائے جاتے ہیں۔ آپ تین دن کے بعد جب انگوٹھی لینے میرے پاس آئیں گی تو مذکورہ فلیتے آپ کو تیار ملیں گے...... آپ اپنے بچے کی طرف سے بے فکر ہو جائیں۔ میرے دیے ہوئے فلیتوں کے اثر سے نہ صرف یہ کہ فیصل پر سے سفلی کے اثرات جاتے رہیں گے بلکہ آئندہ کے لئے بھی بچہ گندے اعمال سے محفوظ ہو جائے گا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ شاہ جی!'' وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی' پھر پوچھا۔ ''ان فلیتوں کا ہدیہ کیا ہو گا؟''

''سات فلیتے' سات سو روپے!'' رئیس شاہ نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''لیکن آپ پیسوں کے لئے پریشان نہ ہوں' جب آپ کا بچہ ٹھیک ہو جائے تو دے دیجئے گا۔''

قمر النساء نے رئیس شاہ کا ڈھیروں شکریہ ادا کیا' پھر سلام کر کے آستانے سے نکل آئی۔

قارئین کی دلچسپی اور بھلائی کے لئے میں یہاں ایک اہم راز سے پردہ اٹھانا ضروری سمجھتا ہوں۔ رئیس شاہ کے پاس ہر رنگ و نسل کے پتھر اور نگینے تو موجود تھے' لیکن ان میں قیمتی جواہرات مثلاً نیلم' زمرد' پکھراج' ہیرا' یاقوت' گارنٹ وغیرہ اصلی نہیں تھے' بلکہ یہ نگینے اس نے خود تیار کئے تھے۔

نگینوں کو رنگ کر مصنوعی جواہر تیار کرنے کا قدیم طریقہ ہے۔ موجودہ زمانے میں یہی کام مختلف کیمیکلز کی مدد سے کیا جا رہا ہے۔ اس وقت ایمی ٹیشن سٹون انڈسٹری اتنے عروج پر ہے کہ بعض اوقات تجربہ کار جوہری بھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

تین روز کے بعد قمر النساء دوبارہ آستانہ رئیسیہ پر پہنچی اور اس بار وہ اپنی بیٹی زیب النساء کو بھی اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ یہیں سے کہانی میں ایک سنسنی خیز موڑ آیا۔

زیب النساء کی عمر چالیس کے اریب قریب تھی' لیکن دیکھنے میں وہ تیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی۔ اس پر زیب کی دلکشی اور رعنائی نے رئیس شاہ کا پندرھواں طبق بھی روشن کر دیا تھا۔ وہ زیب کو دیکھتے ہی اس پر ریجھ گیا تھا۔ زیب کے صاف و شفاف سراپا اور خدوخال کی خوب صورتی نے شاہ جی کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچا دی۔ اس اندرونی طوفان میں سے صرف ایک ہی صدا بلند ہو رہی تھی' جو اس کے دل و دماغ پر مسلسل یہ ہتھوڑا برسا رہی تھی......

مجھے زیب النساء کی ضرورت ہے۔ میں اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے رہوں گا' وغیرہ وغیرہ......

اس روز رئیس شاہ بڑے خاص انداز میں ان کے ساتھ پیش آیا۔ اس کی تمام تر توجہ زیب پر مرکوز رہی۔ نیلم جڑی چاندی کی انگوٹھی زیب کی درمیانی انگلی میں پہنا دی گئی۔ مڈل فنگر سیارہ زحل سے منسوب ہے اور نیلم بھی اسی سیارے کا پتھر مانا جاتا ہے۔ فیصل کے لئے تیار کردہ فلیتے بھی قمر النساء کے حوالے کر دیئے جنہیں نوچندی جمعرات سے شروع کر کے ہر جمعرات کو عصر اور مغرب کے درمیان جلا کر اس کی دھونی فیصل کو دینا تھی۔ انہیں رخصت کرتے وقت رئیس شاہ نے چند ایسے شوشے بھی چھوڑے کہ زیب کو ہفتے میں ایک آدھ بار اس کے آستانے پر ضرور حاضری دینا پڑے۔ قمر' شاہ جی کی کاملیت پر ایمان لا چکی تھی' لہٰذا وہ بلا چون و چرا اس کی ہر ہدایت پر عمل کر رہی تھی۔ ایک طرح سے ان لوگوں کے درمیان فیملی ٹرمز پیدا ہو گئے تھے۔

رئیس شاہ نے قمر النساء کے گھر میں سیندھ لگانے کے لئے ایسا طریقہ اختیار کیا کہ اس کے گھر پر بھی نادیدہ اثرات کا پتا چلا لیا۔ یہ شاہ جی کی خوش قسمتی تھی یا قمر کی بدقسمتی کہ اس دوران میں رئیس شاہ کے مشوروں کے خاطر خواہ اثرات بھی مرتب ہونے لگے تھے۔ فیصل کے جنون اور چڑچڑے پن میں نمایاں کمی واقع ہوئی تھی اور ایک دو جگہوں پر زیب کے رشتے کی

دوبارہ بات بھی چلی تھی، لیکن شاہ جی نے علم نجوم کی روشنی میں ان رشتوں کو زیب کے لئے نامناسب قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔

قمر کے گھر کو نادیدہ اثرات سے پاک کرنے کے لئے شاہ جی نے ان کے گھر میں آمدورفت بھی شروع کر دی تھی۔ اس طرح اسے زیب کے مزید قریب رہنے کا موقع مل رہا تھا۔ قمر اس بات پر بڑا فخر محسوس کر رہی تھی کہ جس شخص سے ملاقات کی خاطر لوگ اس کے آستانے پر قطار لگاتے ہیں، وہ خود چل کر ان کے گھر آتا ہے۔ نیت کا احوال تو صرف خدا ہی کو معلوم ہوتا ہے۔ قمر کے وہم وگمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ شاہ جی تو اس کی خوب صورت بیٹی پر نیت لگائے رال ٹپکا رہا تھا۔ قمر کا تو یہ حال تھا کہ اگر رئیس شاہ رات کو دن اور دن کو رات کہے تو وہ ماننے کو تیار تھی۔

ذہین اور عقل مند خواتین کی میں بات نہیں کر رہا، تاہم یہ بات عمومی طور پر دیکھنے میں آئی ہے کہ مردوں کی بہ نسبت عورتیں زیادہ آسانی اور فراوانی کے ساتھ رئیس شاہ جیسے لوگوں کے چنگل میں پھنس جاتی ہیں۔

قمر اور فیصل و زیب کو اپنے شیشے میں اتارنے کے لئے رئیس شاہ نے چھ ماہ صرف کئے اور پھر ایک روز اس نے اپنی دلی خواہش قمر النساء کی سماعت کے سپرد کر دی۔ اس مشن میں قمر ہی اس کا خصوصی ٹارگٹ تھی۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ چور پر نہیں، چور کی ماں پر طبع آزمائی زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے...... اور اس کا یہ فارمولا صد فیصد درست ثابت ہوا تھا۔

رئیس شاہ اور زیب النساء کی شادی ہو گئی......

شاہ جی کو لوگوں کے نام بدلنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اپنے پاس آنے والے افراد میں سے اکثر کو نام تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ کسی کے نام کا عدد درست نہیں تو کوئی ستارے سے میچ نہیں کرتا...... الغرض وہ لگ بھگ پچیس فیصد کلائنٹس کو نام بدلنے پر زور دیتے تھے اور ان کے نام بھی تجویز کرتے تھے۔ انہی پچیس فیصد افراد میں زیب النساء بھی شامل تھی۔ شادی سے چند روز پہلے ہی رئیس شاہ نے اس کا نام سلطانہ رکھ دیا تھا......

جی ہاں...... وہی سلطانہ جو اس وقت میرے سامنے بیٹھی تھی۔

***

میں بڑی توجہ سے سلطانہ کو سن رہا تھا اور ضروری مواقع پر اہم پوائنٹس بھی نوٹ کرتا جا

رہا تھا۔ وہ چند لمحات تک بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''بیگ صاحب! کسی انسان کی اصلیت اس وقت کھل کر سامنے آتی ہے، جب براہ راست آپ کا اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ جب اسے پرکھنے اور برتنے کا موقع ملتا ہے......''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''بزرگ فرما گئے ہیں کہ اگر کسی کو آزمانا ہو تو اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ، اس کے ساتھ سفر کر کے دیکھو اور اس سے معاملات کا تجربہ کرو یعنی اس کے ساتھ لین دین کر کے دیکھو، چند ہی روز میں اس کی اصلیت کھل جائے گی۔ میں نے پچھلے دو سال میں یہ تینوں کام کر کے دیکھے ہیں۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''اور ہر محاذ پر رئیس شاہ کو لالچی، گھٹیا، سفاک، دھوکے باز اور بے وفا پایا ہے۔ وہ اس قابل نہیں کہ میں اب اس کے ساتھ مزید زندگی گزار سکوں......''

سلطانہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئی تو میں سوالیہ نظر سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ لمحاتی توقف کے بعد وہ دکھی لہجے میں بتانے لگی۔ اس کی آواز میں بڑا سوز اور رنج تھا۔

''اصولی طور پر تو مجھے بیاہ کر رئیس شاہ کے گھر جانا چاہئے تھا، لیکن ہوا اس کے برعکس وہ یوپی موڑ والے گھر کو چھوڑ کر اپنے ٹین ڈبے کے ساتھ ہمارے بنگلے میں آ گیا۔ امی پوری طرح اس کی مٹھی میں تھیں، لہٰذا میں نے نقطۂ اعتراض نہیں اٹھایا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت تک میں رئیس شاہ کے خبث باطن سے واقف نہیں تھی۔ میں نے اسے دل و جان سے اپنا مجازی خدا مانا تھا۔ اس کی اصلیت تک پہنچنے کے لئے تو مجھے ایک عرصہ لگا ہے۔ اگرچہ یہ شادی امی کی وجہ...... بلکہ ان کی مرضی اور منشا سے ہوئی تھی، لیکن میں انہیں بالکل دوش نہیں دوں گی، بلکہ اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھوں گی۔ امی اب بہت اچھی جگہ پر ہیں، پچھلے سال ان کا انتقال ہو چکا ہے۔''

ہمارے درمیان چند لمحات بڑی خاموشی کے ساتھ دبے پاؤں گزر گئے۔ پھر وہ دوبارہ لب کشا ہوئی۔ اس کے ایک ایک لفظ میں احتجاج کی گونج تھی۔

''بیگ صاحب! شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد اس شخص نے مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ نارتھ ناظم آباد والا بنگلا فروخت کر کے ہمیں گلشن اقبال شفٹ ہو جانا چاہئے۔ وہ اپنے کاروبار کو بھی گھر کے اندر ہی لانا چاہتا تھا۔ اس موقع پر میں نے کہا۔ ''شاہ جی! نارتھ ناظم آباد تو گلشن اقبال سے زیادہ قیمتی اور پراثر علاقہ ہے۔ اگر آپ کی خواہش ہے کہ آستانے کو

گھر میں شفٹ کیا جائے تو آپ اسی بنگلے میں لے آئیں۔ آپ کے پاس آنے والوں میں اکثریت ایسے افراد کی ہے جو ناظم آباد اور آس پاس کے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے لئے گلشن کے بجائے یہاں زیادہ آسانی رہے گی۔ اس بنگلے کا سامنے والا پورشن خالی کر کے آپ کے آستانے کے لئے مخصوص کر دیتے ہیں۔''

''دراصل' اب میں اس آستانے والے لیبل سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''دنیا بدل رہی ہے' لوگوں کے رجحانات تبدیل ہو رہے ہیں۔ میں اس کام کو جدید بنیادوں پر آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

''اچھی بات تو یقیناً ہے' کیونکہ یہ رئیس شاہ کا آئیڈیا ہے۔'' وہ فخریہ انداز میں سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میرے خیال میں اس تجربے کے لئے سب سے موزوں جگہ گلشن اقبال کا علاقہ ہے۔ میں نے ستاروں کی چال اور سیاروں کی ڈھال کا بڑی باریک بینی سے حساب کیا ہے اور گلشن اقبال کے طول البلد وعرض کا بھی جائزہ لے لیا ہے۔ مجھے یقین ہے' وہاں جاتے ہی میرے بزنس کو کسی سپر سانک جنگی طیارے کے پر لگ جائیں گے۔''

جب رئیس شاہ کی گفتگو میں ستارے' سیارے' طیارے وغیرہ آتے تھے تو میں دانستہ خاموشی اختیار کر لیا کرتی تھی۔ اس نوعیت کے ثقیل الفاظ اور ان کے استعمال و افعال پر غور کرنے سے میرے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔

چند روز کے بعد امی نے مجھے بتایا کہ ہم لوگ نارتھ ناظم آباد والا بنگلا فروخت کر کے گلشن اقبال میں منتقل ہو رہے ہیں۔ رئیس شاہ نے اپنے مخصوص ہتھکنڈے آزما کر امی کو اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔ وہ ویسے بھی شاہ جی سے بے حد متاثر اور مرعوب تھیں۔ پتا نہیں رئیس نے انہیں کیا پٹی پڑھائی کہ وہ جی جان سے اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو گئیں۔ وہ بنگلا امی کے نام تھا لہٰذا وہ اسے فروخت کرنے کا پورا حق رکھتی تھیں' لیکن اس موقعے پر میں نے انہیں یہ مشورہ دیا۔

''امی! میں آپ کو بنگلا بیچنے سے تو نہیں روک سکتی' لیکن میرا ایک مشورہ ہے۔''

''ہاں بولو.....'' انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا مشورہ ہے.....؟''

''جب آپ گلشن اقبال میں گھر خریدیں تو وہ بھی آپ ہی کے نام ہونا چاہئے۔''

''ہوں.....'' انہوں نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''زیب! یہ بات تم کسی خاص سبب سے کہہ رہی ہو؟''

''سبب کا تو مجھے پتا نہیں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔ ''لیکن میری چھٹی حس مجھے بار بار کہہ رہی ہے کہ اگر نیا گھر آپ کے نام نہ ہوا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔''

''تم بھی شاہ جی کے ساتھ رہ کر نجومن بن گئی ہو۔'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولیں۔ 'بڑی بڑی پیش گوئیاں کرنے لگی ہو۔''

''میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں اس کا تعلق علم نجوم سے نہیں ہے۔''

''پھر کس سے تعلق ہے؟''

''یہ میرے دل کی آواز ہے امی.....''

''اچھا ٹھیک ہے' میں اس معاملے کو دیکھ لوں گی۔'' وہ تسلی آمیز انداز میں بات ختم کرتے ہوئے بولیں۔ ''تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

میں امی کی تسلی کے بعد بےفکر ہو گئی۔

آئندہ ماہ نارتھ ناظم آباد والا بنگلا فروخت ہو گیا اور ہم گلشن اقبال کے ایک نسبتاً بڑے بنگلے میں آ گئے۔ بنگلے کی مالکانہ حیثیت کے حوالے سے امی نے ایک انوکھا ہی فیصلہ کیا تھا۔

''اس بنگلے کے کاغذات تمہارے نام سے تیار ہوں گے زیب!'' انہوں نے وکیل کی موجودگی میں انکشاف کیا۔

''میرا تو اب چل چلاؤ ہے۔ پتا نہیں' کب بلاوا آ جائے۔''

میں نے اس موقعے پر امی سے لڑنے کی کوشش کی' لیکن امی بھی ضد پر اتر گئیں۔ چنانچہ ں نے ان کی عمر' مرتبے اور خواہش کے احترام میں گردن جھکا دی۔ اس طرح گلشن اقبال لے بنگلے کی بلاشرکت غیرے میں مالکن بن گئی۔ بعدازاں ایک موقعے پر امی کے منہ سے اروی میں ایک بات نکل گئی' جسے سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ میری چھٹی حس غلط نہیں کہہ رہی ی۔ رئیس شاہ کا کوئی قصہ چل رہا تھا کہ امی نے کہا۔

''شاہ جی نے اگرچہ اپنی زبان سے تو کچھ نہیں کہا' لیکن ان کے انداز سے مجھے یوں سوس ہوا تھا جیسے گلشن والا یہ بنگلہ وہ اپنے نام سے لینے کا ارادہ رکھتے تھے' جبھی میں نے یہ ا تمہارے نام سے خریدا ہے زیب..... میں نے شاہ جی سے بھی وہی کہا تھا' جو تم سے کہہ رہی

ہوں کہ میں اب اپنی زندگی کے آخری دور سے گزر رہی ہوں۔ یہ سب دولت و جائیداد تمہی لوگوں کی ہے۔ میں اس کا کیا کروں گی۔ تم بڑی ہو، مجھے یقین ہے، تم سے زیادہ فیصل کا خیال اور کوئی نہیں رکھ سکتا۔‘‘

امی کا کہا سچ ثابت ہوا۔ گلشن اقبال والے بنگلے میں شفٹ ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد وہ اس دنیا سے اس دنیا میں شفٹ ہوگئیں۔

رئیس شاہ کا کہا بھی درست ثابت ہوا۔ گلشن اقبال والے بنگلے میں کاروبار منتقل کرتے ہی اس پر ہن برسنے لگا اور اس کے بھی کئی اسباب ہیں۔ وہ اب رئیس شاہ یا شاہ جی نہیں رہا بلکہ ’’پروفیسر شاہ‘‘ بن گیا ہے۔ اس کا کاروبار آستانہ رئیسیہ سے نہیں بلکہ ’’شاہ کلینک‘‘ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اب وہ کوئی عام سا نجومی یا عامل نہیں بلکہ کنسلٹنٹ بن گیا ہے اور اس کے اندر سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ وہ انتہائی سفاک، ظالم اور کاروباری ہوگیا ہے۔ پہلے وہ غریب غربا سے تھوڑی بہت رعایت کر دیا کرتا تھا۔ اب ایسی کوئی کہانی نہیں ہے۔ اس کے طلب کردہ پیسے پہلے جمع کراؤ، پھر کام ہوگا۔ پیسے نہیں ہیں تو گھر جاؤ۔‘‘

’’یہ تو بڑی خراب بلکہ بے ہودہ صورتحال ہے۔‘‘ وہ متوقف ہوئی تو میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

’’واہیات کہیں بیگ صاحب!‘‘ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے شاہ جی کے ظلم و ستم کی ترم ناک داستان بیان کرنے لگی۔ ’’میں نے خوامخواہ ہی اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ پچھلے ایک سال میں، میں نے بڑے عبرت ناک نظارے دیکھے ہیں۔ دولت کی ہوس اور امارت کے لالچ نے رئیس شاہ کو بالکل اندھا کر دیا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے کلائنٹس کو لوٹ رہا ہے۔ اپنے پاس آنے والی عورتوں کو وہ بتاتا ہے کہ ان کے شوہر بے وفائی کر رہے ہیں۔ وہ انہیں نظرانداز کر کے دوسری عورتوں کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں، پھر وہ عورتیں اپنے شوہروں کو راہ راست پر لانے کے لئے رئیس سے الواح و طلسمات بنواتی ہیں۔ اسی طرح وہ شوہروں کے ذہنوں میں بھی مختلف رنگ و نسل کے شک کے بیج بوتا ہے۔ کسی سے کہتا ہے کہ اس کی بیوی کا کردار ٹھیک نہیں، کسی کو بتاتا ہے کہ اس کی بیوی نے اسے مٹھی میں رکھنے کے لئے کسی عامل سے الو کا گوشت دم کرا کے اسے کھلا دیا ہے۔ ساسوں کو بہوؤں کے خلاف اور بہوؤں کو ساسوں کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ اس طرح اس کے نگینے اور

واح دھڑا دھڑ بکتے ہیں اور ان دونوں چیزوں میں اس کی بے ایمانی بھی عروج کی آخری نازل کو چھو رہی ہے۔‘‘

’’پچھلے دنوں شرف مشتری پڑا تھا۔ مشتری کی لوح سونے کے پتر پر بنائی جاتی ہے، لیکن یس شاہ نے کسی سستی سی نرم دھات پر سونے کا پانی چڑھوا کر یہ الواح درجنوں کے حساب سے تیار کی تھیں، جنہیں سونے کا کہہ کر اپنے کلائنٹس کو بیچا ہے۔ اسی طرح وہ بیس تیس روپے نہ کے حساب سے خریدے ہوئے پتھروں کو ہزاروں، پانچ سو سے کم میں نہیں فروخت کر رہا۔ رے لئے سب سے زیادہ دکھ اور اذیت کی بات یہ ہے کہ بعض سادہ لوح عورتیں رئیس شاہ ے مطالبے پورے کرنے کے لئے اپنے زیورات تک فروخت کر دیتی ہیں۔ ان بے چاریوں پہلی اور آخری تمنا یہی ہوتی ہے کہ ان کے شوہر راہ راست پر آ جائیں۔ ظلم و بربریت کی سے بڑی مثال اور کیا ہوگی۔ رئیس شاہ کسی انسان نما درندے سے کم نہیں بیگ احب......‘‘

’’واقعی، آپ بڑے آزمائشی حالات سے گزر رہی ہیں۔‘‘ میں نے افسوس بھرے انداز کہا۔ ’’آپ کی روح ایک عذاب میں مبتلا ہے۔‘‘

’’بیگ صاحب! یہ سب تو چل ہی رہا تھا۔‘‘ وہ بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ’’پچھلے دنوں رئیس شاہ کی ایک ایسی حرکت میرے علم میں آئی ہے اور میں نے باقاعدہ اس کی ریق کرنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ مجھے پہلی فرصت میں رئیس شاہ کو اپنی زندگی سے نکال کر پھینک دینا چاہئے۔‘‘

’’کون سی حرکت......؟‘‘ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

’’رئیس شاہ دوسری شادی کی پلاننگ کر رہا ہے۔‘‘ اس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ’’کیا کوئی موٹی مرغی اس کے جال میں آ گئی ہے؟‘‘

’’بیگ صاحب!‘‘ سلطانہ نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ’’کیا آپ بھی جوم میں مہارت رکھتے ہیں؟‘‘

’’نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔‘‘ میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

’’پھر آپ کو موٹی مرغی کے بارے میں کیسے پتا چلا؟‘‘

’’میرا اندازہ سمجھ لیں......‘‘ میں نے کہا۔

''آپ کا اندازہ زبردست ہے۔'' وہ جوش بھرے انداز میں بتانے لگی۔ ''وہ مرغی جسامت میں تو بڑی ڈیشنگ اور سمارٹ ہے' لیکن دولت کے لحاظ سے آپ اسے موٹا کہہ سکتے ہیں۔''

''اس مرغی کا کوئی نام تو ہوگا؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

''نام اس کا پیدائشی تو ماہ جبیں تھا۔'' سلطانہ نے زہریلے انداز میں بتایا۔ ''مگر یہ تجربے کی بات ہے کہ رئیس شاہ کے قریب آنے والے سب سے پہلے اپنے نام سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اب وہ ماہ جبیں' روبی بن چکی ہے۔ رئیس نے اسے احساس دلا دیا ہے کہ وہ ایک قیمتی یاقوت ہے لہٰذا اس کا نام روبی ہونا چاہئے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی' پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بتانے لگی۔

''روبی ہاکی سٹیڈیم کے نزدیک ہی کھڈا مارکیٹ میں ایک بڑا بیوٹی پارلر چلاتی ہے۔ اس کی رہائش فیز فائیو کے ایک لگژری بنگلے میں ہے۔ یہ عورت مطلقہ اور خودمختار ہے۔ مال و دولت کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں۔ آج کل روبی' رئیس شاہ کی مٹھی میں ہے۔ عنقریب وہ شادی کرنے والے ہیں۔''

''یہ ساری معلومات آپ تک کیسے پہنچیں؟'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

''رئیس شاہ کا ایک سابق دوست ریاست علی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''سابق دوست......؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''ریاست علی کی ادھر لیاقت آباد کی صرافہ مارکیٹ میں پتھروں اور نگینوں کی بہت بڑی دکان ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''کسی زمانے میں رئیس شاہ ریاست سے نگینے خریدا کرتا تھا اور اپنے کلائنٹس کو بھی پتھروں کی خریداری کے لئے ریاست ہی کے پاس بھیجا کرتا۔ دونوں میں گہری دوستی تھی اور ریاست اکثر ہمارے گھر بھی آیا کرتا تھا' لیکن جب سے ہم گلشن اقبال میں شفٹ ہوئے ہیں' رئیس شاہ' پروفیسر شاہ بن گیا ہے اور اس نے پرانے دوستوں سے بھی جان چھڑا لی ہے۔ ریاست علی بھی انہی میں سے ایک ہے۔ نگینوں کے معاملات پر تو ان دونوں کے بیچ باقاعدہ جھگڑا بھی ہوا تھا۔'' وہ تھوڑی دیر کے لئے رکی' ایک افسردہ سی سانس خارج کی' پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگی۔

''پچھلے دنوں ریاست نے فون کر کے مجھے رئیس شاہ کے نئے لچھنوں کے بارے میں

ا ہے۔ میں چونکہ رئیس شاہ کی رگ رگ سے واقف ہوں' اس لئے مجھے ریاست کی اطلاع پر
) وقت یقین آ گیا تھا' لیکن میں نے پھر بھی تصدیق ضروری جانی۔ ریاست کی ہدایت اور
ہم کردہ معلومات کی روشنی میں جب میں نے خفیہ انداز میں تحقیق کی تو اس اطلاع کو درست
۔ رئیس شاہ واقعی روبی سے شادی کرنے والا ہے۔''

''کیا آپ اپنے شوہر سے صرف اس لئے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہیں کہ وہ روبی سے
ی کرنے جا رہا ہے؟'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے سوال کیا۔

''بنیادی وجہ تو وہی ہے جو میں آپ کو بتا چکی' رئیس شاہ اپنی فطرت' مزاج اور سوچ کے
بق کسی جنگلی درندے سے کم نہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس قماش کے آدمی
ساتھ زندگی گزارنا کسی جہنم میں سانس لینے کے مترادف ہے۔ پچھلے چھ ماہ سے ہمارے
ن ایک خاموش اعصابی جنگ جاری ہے اور جہاں تک روبی سے رئیس کی شادی کا سوال
تو......'' وہ چند لمحات کی خاموشی کے بعد ایک تھکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے اس بات سے قطعاً کوئی پریشانی نہیں کہ وہ روبی سے شادی کرتا ہے یا زمرد سے۔
ں سے یا پکھراج سے...... میں اس امر کے لئے متفکر ہوں کہ وہ مجھے چھوڑ کر دوسری شادی
ا چاہتا ہے۔''

''آپ کو چھوڑ کر...... کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''روبی نے شرط عائد کی ہے کہ رئیس مجھے فارغ کرنے کے بعد اسے اپنائے گا'' وہ
حت کرتے ہوئے بولی۔ ''پچھلے چند دنوں سے رئیس کا رویہ بھی یہی پیغام دے رہا ہے کہ
ے چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا۔ ہماری شادی کو دو سال ہو گئے ہیں اور ہماری کوئی اولاد بھی
ا۔ دوسری شادی کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو یہ محرومی میرے لئے مائنس اور رئیس
لئے پلس پوائنٹ ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے فارغ کر دے' میں اس سے چھٹکارا
ں کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی بھی قیمت پر طلاق کا طوق گلے میں نہیں لٹکانا۔ ادھر آپ نے
جانب سے خلع کا کیس عدالت میں دائر کیا' ادھر میں بہ حکم عدالت دھکے مار کر رئیس شاہ
پنے بنگلے سے باہر نکال دوں گی۔ جب کیس عدالت میں ہوگا تو رئیس کو ایک شوہر کی
ن سے میرے ساتھ رہنے کا حق بھی نہیں رہے گا۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ ان
ت کا کتنا زبردست بندوبست کرتے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوئی' پھر نفرت

بھرے انداز میں بولی۔

''میں چاہتی ہوں، جب رئیس شاہ، روبی سے شادی کرے تو اس کا سٹیٹس ایک ٹھکرائے ہوئے، گھر سے بے دخل، بلکہ زندگی سے بے دخل کیئے ہوئے شوہر کا ہو۔''

''ایسا ہو جائے گا۔'' میں نے تیقن سے کہا۔ ''میں عدالت کی طرف سے ایسا کامل بندوبست کروا دوں گا کہ رئیس شاہ کو خلع کے پیپرز کے ساتھ ہی گھر سے بے دخلی کا نوٹس بھی ملے گا۔ پہلے اسے گھر چھوڑنا ہوگا، اس کے بعد عدالت میں پیش ہوکر آپ کو بھی آزاد کرنا ہو گا۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جائے گی بیگ صاحب!''

''اس معاملے کے لئے آپ بے فکر ہو جائیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''لیکن خلع کے حوالے سے آپ کو چند اہم باتیں اپنے ذہن میں رکھنا ہوں گی۔''

اس نے گہری سنجیدگی سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''مثلاً کون سی باتیں؟''

میں نے حق وکیل ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''مثلاً یہ کہ...... خلع کا مطالبہ چونکہ آپ کی جانب سے ہوگا لہٰذا تنسیخ نکاح کے نتیجے میں آپ کو اپنے حقوق وغیرہ سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ مثلاً مہر کی رقم......''

''بیگ صاحب! مجھے کچھ بھی نہیں چاہئے۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''اس شاطر شخص نے تو امی کو مٹھی میں لے کر مجھے حاصل کر لیا تھا۔ امی چونکہ اس کی اندھی مریدنی بنی ہوئی تھیں، لہٰذا نکاح کے وقت انہیں نظر ہی نہیں آیا کہ بیٹی کے حقوق کو تحفظ بھی دینا ضروری ہے۔ میرا مہر صرف پانچ ہزار روپے سکہ رائج الوقت پاکستان بندھا تھا۔ آپ خود ہی بتائیں، ان پانچ ہزار کو لے کر میں کون سی ارب پتی بن جاؤں گی اور جہاں تک نان و نفقہ کا تعلق ہے تو......'' اس نے سانس ہموار کرنے کے لئے توقف کیا، پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''اللہ کا شکر ہے بیگ صاحب! اگر میں اپنے بنگلے کا ایک پورشن کرائے پر بھی اٹھا دوں گی تو ہم دونوں بہن بھائی کی گزر اوقات بڑے آسودہ انداز میں ہو جائے گی۔ میں رئیس شاہ کی محتاج نہیں ہوں۔ میں اپنے بنگلے کو فروخت کر کے اس رقم میں تین شاندار فلیٹ بھی خرید سکتی ہوں۔ ایک میں خود رہوں اور باقی دو کو کرائے پر چڑھا دوں تو بھی زندگی بڑے سکھ چین سے

رے گی۔''

''او کے!'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''میں پہلی فرصت میں آپ کا کیس تیار کر، عدالت میں لگاتا ہوں۔ آپ کل دوپہر کے بعد کسی وقت میرے آفس آ کر ضروری غذات پر دستخط کر دیجئے گا اور دل میں یہ نقطہ بھی پختہ کر لیں کہ اب قدم پیچھے نہیں ہٹانا۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بیگ صاحب!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ بں اس دن کا بے تابی سے انتظار کروں گی جب میرے اگلے ہوئے کو وہ مطلقہ روبی نگلے ا۔''

''آپ نے روبی کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر رکھی ہیں۔'' میں نے ہی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ساتھ مطلقہ کا لیبل کیوں لگا ہوا ہے؟''

''چند سال پہلے ماہ جبیں (روبی) نے احمد حسن نامی ایک مالدار شخص سے شادی کی تھی۔'' وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''کچھ ہی عرصے کے بعد احمد حسن اچانک غائب ہو گیا۔ آج ے اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ ماہ جبیں کا بیان ہے کہ احمد حسن اسے طلاق دے کر بیرون ملک گیا تھا۔ ثبوت کے طور پر اس نے ایک طلاق نامہ بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے جس سے پتا چلتا، کہ وہ مطلقہ ہے، حقیقت کیا ہے یہ تو خدا ہی کو معلوم ہوا۔''

''ویسے خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے ٹھکرائے ہوئے دو۔'' میں نے مذاق کے ے میں کہا۔ ''ایک مطلقہ، دوسرا خلع زدہ......''

سلطانہ کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ''خلع کے کاغذات سلطانہ ہی کے نام سے تیار کیئے جائیں نا؟''

''جی ہاں، بالکل۔'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''نکاح نامے پر میرا نام طانہ ہی درج ہے۔ اس کیس سے نمٹتے ہی میں دوبارہ زیب النساء بن جاؤں گی۔ میں رئیس ے کے عطا کردہ اس آسیب (سلطانہ) سے بھی نجات حاصل کر لوں گی۔''

میں نے اپنی فیس وصول کر کے اس کی رسید سلطانہ کو تھما دی۔ وہ میرا شکریہ ادا کرنے، بعد رخصت ہوگئی۔

***

ایک روز بعد میں نے سلطانہ کی جانب سے خلع کا کیس دائر کر دیا۔

اس سلسلے میں‘ میں نے سلطانہ کو عدالتی معاملات کی اونچ نیچ سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔ کیونکہ جب رئیس شاہ کو گھر سے بے دخلی کا نوٹس ملتا تو وہ سٹپٹا کر رہ جاتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ روبی سے شادی کرنے جا رہا تھا اور اسے سلطانہ کی ذرا بھی پروا نہیں تھی‘ لیکن کوئی بھی شخص ”بڑے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے“ ایسی صورت حال سے حتی الامکان بچنے کی کوشش ہی کرتا ہے‘ لہٰذا رئیس شاہ بھی اس سلسلے میں سلطانہ کو بہلانے پھسلانے کی سعی کر سکتا تھا۔ اس بات کے صرف ایک فیصد امکانات تھے کہ رئیس شاہ موجودہ صورت حال کو کھلے دل سے قبول کرتے ہوئے سلطانہ کے گھر سے چلا جاتا...... نہ صرف چلا جاتا بلکہ عدالت میں حاضر ہو کر کیس کا سامنا بھی کرتا۔

عدالتی نوٹس کی ترسیل کے بعد سلطانہ مجھ سے ملنے کے لئے آئی۔ وہ خاصی پریشان اور الجھی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا‘ اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں نے اسے آرام سے بٹھایا اور پوچھا۔

”کیا بات ہے‘ آپ اتنی الجھی ہوئی کیوں ہیں؟“

”رئیس کو گھر سے بے دخلی کا نوٹس مل گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ میری منتیں کر رہا ہے......“

”بے دخلی کے نوٹس کے علاوہ اسے خلع کے حوالے سے بھی عدالت میں پیش ہونے کے احکامات موصول ہوئے ہوں گے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ دونوں میں سے کس کے لئے آپ کی منت سماجت کر رہا ہے؟“

”دونوں ہی معاملات کے لئے......“

”ہوں......“ میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ”اس نے کیا موقف اختیار کیا ہے؟“

”وہ قسمیں کھا کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ روبی سے شادی کرنے کا اس کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں۔ وہ محض اس کے ساتھ بزنس پارٹنر شپ کا ارادہ رکھتا ہے۔“

وہ مجھے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اس کی التجا ہے کہ مجھے جو غلط فہمی ہوئی ہے‘ میں اسے اپنے دل و دماغ سے نکال دوں۔ اگر مجھے اس سے کوئی شکایت ہے تو وہ دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہمیں پیار و محبت سے مل کر ایک ساتھ رہنا چاہئے۔“

”اس کی وضاحت اور منت سماجت تو رہی ایک طرف۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے

میں کہا۔ ”اسے یہ کس نے بتایا ہے کہ آپ اس کی روبی سے ہونے والی شادی کے راز سے قبل از وقت آگاہ ہو گئی ہیں؟“

”یہ تو میں نے ہی اسے بتایا ہے......“ وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔

”یہ آپ نے غلط کیا۔“ اس نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ کی معلومات اس کے علم میں نہ آتیں تو زیادہ اچھا تھا۔“

”اب کیا ہو گا؟“ وہ پریشان نظر سے مجھے تکنے لگی۔

”جو بھی ہو گا‘ اچھا ہی ہو گا۔“ میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ”میں معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ آخری مرتبہ مجھے بتا دیں کہ آپ کا خلع لینے کا فیصلہ اٹل ہے یا اس میں رئیس کی منت سماجت سے کسی لچک کا امکان ہے؟“

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے بیگ صاحب!“ وہ غیر متزلزل انداز میں بولی۔ ”اب واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”دراصل‘ یہ بات میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ میاں بیوی کا رشتہ بہت نازک‘ بہت حساس ہوتا ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”اس میں کسی بھی مرحلے پر مفاہمت اور مصالحت کا امکان موجود ہوتا ہے۔“

”انشاءاللہ ایسا نہیں ہو گا۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا رئیس شاہ ابھی تک آپ کے بنگلے ہی میں رہ رہا ہے؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ”اسے پہلی فرصت میں گھر سے نکال دیں۔“ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”ورنہ کوئی بھی پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔“

”اگر اس نے گھر چھوڑنے میں کوئی پس و پیش سے کام لیا تو......“

”وہ ایسا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔“ میں نے سلطانہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”وہ بنگلہ آپ کا ہے اور جب سے آپ کی جانب سے عدالت میں خلع کا مقدمہ دائر ہوا ہے‘ وہ آپ پر اپنے شوہرانہ حقوق نہیں جتا سکتا۔ یہ کیس فائل ہونے کا واضح مطلب یہی ہے کہ آپ نے علی الاعلان رئیس شاہ کو مسترد کر دیا ہے۔ آپ دونوں کے ازدواجی معاملات کا فیصلہ اب عدالت ہی کرے گی اور اس فیصلے تک رئیس شاہ کو آپ سے دور رہنا ہو گا۔ اگر یہ بنگلا رئیس شاہ کی ملکیت ہوتا تو آپ کو جانا تھا۔ بنگلہ چونکہ آپ کی پراپرٹی ہے لہٰذا ہر حال میں رئیس

شاہ کو جانا ہے اور اگر......'' میں نے سانس ہموار کرنے کے لئے تھوڑا توقف کیا' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ زیادہ ہوشیاری او چالاکی دکھانے کی کوشش کرے تو آپ اپنے علاقے کے تھانے فون کر کے اسے گھر سے بے دخل کر سکتی ہیں۔ وہ عدالتی نوٹس وصول کر چکا ہے۔ آپ پولیس کو بتا سکتی ہیں کہ آپ دونوں کے حوالے سے عدالت میں کیس چل رہا ہے۔''

''یہ آپ نے ایک اچھا مشورہ دیا ہے۔'' وہ اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''اللہ آپ کا بھلا کرے۔''

''اور آپ کا بھی!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ چند منٹ مزید بیٹھی پھر مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئی۔

اسی رات جب میں سونے کے لئے لیٹ رہا تھا کہ میرے رہائشی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس زمانے میں سی ایل آئی کی سہولت نہیں ہوا کرتی تھی۔ فون اٹینڈ کرنے کے بعد ہی پتا چلتا تھا کہ دوسری جانب کون ہے؟

''ہیلو......!'' میں نے ریسیور کو کان سے لگانے کے بعد ماؤتھ پیس میں کہا۔

''بیگ صاحب! یہ میں ہوں۔'' دوسری طرف ایک نسوانی آواز ابھری۔ ''سلطانہ!''

''خیریت تو ہے نا......؟'' میں نے تشویش بھرے انداز میں دریافت کیا۔

سلطانہ کو میں نے اپنے گھر کا نمبر بھی دے دیا تھا۔ اس کا کیس کچھ اس نوعیت کا تھا کہ اسے کسی بھی وقت میری ضرورت پیش آ سکتی تھی' ورنہ میں عموماً کلائنٹس کے تمام تر معاملات آفس اور کورٹ ہی میں نمٹایا کرتا ہوں۔

''بالکل خیریت ہے جناب......!'' سلطانہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''رئیس گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے' لیکن اس کا سامان ابھی ادھر ہی رکھا ہوا ہے۔ وہ صرف ایک بریف کیس ساتھ لے کر گیا ہے' جس میں قیمتی جواہرات اور الواح وطلسمات بھرے ہوئے ہیں۔''

''باقی سامان کے بارے میں اس نے کیا کہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کہہ کر گیا ہے کہ پہلے اپنے رہنے کا بندوبست کر لے پھر آ کر دیگر سامان بھی لے جائے گا۔'' سلطانہ نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے' آپ اس کے کمرے کو تمام تر سامان سمیت لاک کر دیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''جب وہ سامان اٹھانے آئے تو اسے یونہی گھر میں گھسنے کی اجازت نہ دیں۔ آپ اس سے کہیں کہ محلے کے دو تین معزز افراد کو جمع کرے اور ان کی موجودگی میں اپنا سامان اٹھائے۔ یہ خبر آپ کے آس پڑوس کو ہونا چاہئے کہ اب آپ کا رئیس شاہ سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ آپ نے کورٹ میں اس کے خلاف خلع کا کیس دائر کر رکھا ہے۔ آپ کی پوزیشن بہت مضبوط و مستحکم ہے لہٰذا گھبرانے یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگلے ہفتے پیشی بھی ہے۔ یہ کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ دو پیشیوں کا کھیل ہے۔''

''بہت بہت شکریہ بیگ صاحب!'' وہ تشکرانہ لہجے میں بولی' پھر اضطراری انداز میں کہا۔ ''ایک بات تو میں آپ کو بتانا بھول ہی گئی۔''

''کون سی بات......؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

سلطانہ نے بتایا۔ ''وہ آپ سے ملنے کو بھی کہہ رہا تھا۔''

''مجھ سے وہ کس سلسلے میں ملنا چاہتا ہے؟''

''وہ آپ کو بتانا چاہ رہا ہے کہ روبی سے اس کا شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔'' وہ بولی۔ ''آپ مجھے سمجھائیں کہ میں کیس واپس لے لوں۔''

''کیا آپ نے خلع کا جو کیس فائل کیا ہے اس کی بنیادی وجہ رئیس شاہ کا روبی سے دوسری شادی کا ارادہ ہے؟'' میں نے سلطانہ سے یہ سوال پہلے بھی پوچھ چکا تھا۔ لہٰذا اس بار میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''قطعی نہیں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''رئیس شاہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دیگر نصف درجن وجوہات ہیں۔''

''بس' تو پھر آپ مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''رئیس شاہ جو بھی کہہ رہا ہے اسے کہنے دیں۔ اگر وہ میرے پاس کوئی دادفریاد لے کر آیا تو میں اس کے دماغ کے کیڑے جھاڑ کر روانہ کروں گا۔ آپ اس سلسلے میں بالکل ٹینشن نہ لیں۔''

اس نے الوداعیہ کلمات سے پہلے میرا بے حد شکریہ ادا کیا' پھر ہمارے درمیان قائم ٹیلی فونک سلسلہ موقوف ہوگیا۔

میں نے برسوں سے جاری معمول کے مطابق تھوڑا مطالعہ کیا' پھر جسم کر ڈھیلا چھوڑ کر

نیند کے حوالے کر دیا۔ جلد ہی‘ ریشمی آغوش کی حامل یہ طرح دار حسینہ مجھے اپنے ہمراہ خوابوں کی پُرکیف نگری میں لے گئی۔

***

سلطانہ نے بالکل درست کہا تھا۔

میں نے رات کو سلطانہ سے ہونے والی گفتگو کو اپنی یادداشت میں زیادہ جگہ نہیں دی تھی‘ لہٰذا اگلے روز دفتر میں جب میری سیکرٹری آمنہ نے مجھے بتایا کہ کوئی پروفیسر شاہ مجھ سے ملنے آئے ہیں تو فوری طور پر مجھے کچھ بھی یاد نہ آیا اور بے ساختہ میں نے پوچھا۔

”کون پروفیسر شاہ......؟“

”وہ کسی سلطانہ نامی عورت...... کا حوالہ دے رہے ہیں۔“ آمنہ نے انٹرکام پر مجھے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”جو آپ کی کلائنٹ اور پروفیسر صاحب کی بیوی ہے۔“

اس ریفرنس کے بعد چشم زدن میں مجھے یاد آ گیا کہ وہ رئیس شاہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میری اس شخص سے کوئی ذاتی رنجش تو نہیں تھی‘ تاہم سلطانہ کو پیش آمدہ صورت حال کی روشنی میں دیکھا جائے تو رئیس شاہ کے لئے میرے دل میں کوئی خوشگوار جذبات نہیں تھے۔ میں نے آمنہ سے پوچھا۔

”اپائنٹمنٹ والے کلائنٹس میں سے کوئی باقی ہے؟“

”نہیں سر...... سب نمٹ گئے۔“ میری سیکرٹری نے بتایا۔ ”لابی میں اس وقت صرف ایک ہی شخص موجود ہے...... پروفیسر شاہ!“

”ٹھیک ہے‘ پروفیسر صاحب کو میرے پاس بھیج دو۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے ریسیور کریڈل کر دیا۔

اگلے ہی لمحے رئیس شاہ میرے چیمبر میں موجود تھا۔ شاہ جی کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ کسی زمانے میں وہ شلوار قمیص اور ویسٹ کوٹ پہنا کرتا تھا۔ ناظم آباد سے گلشن اقبال شفٹ ہونے کے بعد تو اس کے تیور اور رنگ ڈھنگ سب بدل گئے تھے۔ اس وقت وہ نفیس قسم کے سفارش سوٹ میں ملبوس تھا اور پروفیسر بننے کے بعد وہ نارمل ڈاڑھی سے فرنچ کٹ پر چلا گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی بیشتر انگلیوں میں بیش بہا نگینے جگمگا رہے تھے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد ہمارے درمیان مختصر سی تعارفی گفتگو ہوئی‘ پھر وہ اصل مقصد پر

آ گیا۔ اس نے بڑے قائل کرنے والے انداز میں مجھ سے کہا۔

”بیگ صاحب! سلطانہ کو شدید نوعیت کی غلط فہمی ہو گئی ہے۔“

”کیسی غلط فہمی شاہ جی؟“ میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”یہی کہ میں اسے چھوڑ کر کسی اور عورت سے شادی کرنے والا ہوں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جبھی اس نے آپ کے توسط سے خلع کا کیس دائر کیا ہے۔“

وہ پبلک ڈیلنگ کا آدمی تھا‘ لہٰذا بڑے طریقے سلیقے سے بات کرنے کا ہنر بھی جانتا تھا۔ میں نے انجانے پن سے پوچھ لیا۔

”تو کیا آپ روبی نامی کسی عورت سے شادی کا ارادہ نہیں رکھتے؟“

”بالکل نہیں بیگ صاحب!“ وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور یہی سلطانہ کی غلط فہمی ہے۔ روبی کے ساتھ تو میں پارٹنرشپ میں‘ اپنے بزنس کو آگے بڑھانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

رئیس شاہ کی بزنس پارٹنرشپ کے حوالے سے سلطانہ نے بھی مجھے بتایا تھا۔ اپنی دلچسپی کی خاطر میں نے پوچھ لیا۔

”اس بزنس کے بارے میں آپ مجھے کچھ بتائیں گے؟“

”کیوں نہیں جناب......!“ وہ جلدی سے بولا۔ ”آپ کو بتانا اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ آپ اپنی موکلہ کو زیادہ بہتر انداز میں صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کر سکیں......“ یہاں تک بولنے کے بعد وہ چند لمحے کے لئے رکا‘ ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی‘ پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میرے پاس ہنر ہے اور روبی کے پاس دولت۔ جب ہنر اور دولت شانہ بشانہ آگے بڑھنے کا عزم کر لیں تو پھر کامیابیاں ان کے قدموں کی گزرگاہ بن جایا کرتی ہیں۔ سلطانہ کو میں نے سمجھانے کی بڑی کوشش کی ہے کہ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں‘ تابناک مستقبل کے لئے بہت ضروری ہے‘ لیکن وہ اس موقعے پر الٹی مت کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ یہ منحوس خیال اس کے ذہن سے نکلنے کا نام نہیں لے رہا کہ میں روبی سے شادی کرنے والا ہوں...... اور میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ آگ کس بدبخت نے لگائی ہے۔“

”کس نے......؟“ میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

''اس کمینے کا نام ہے..... ریاست علی۔''

''ذرا اس کمینے کا تاریخ اور جغرافیہ بھی بتا دیں؟''

سب کچھ جاننے کے باوجود بھی تھوڑی دیر کے لئے میں انجان بن گیا' حالانکہ سلطانہ کی زبانی ریاست علی نگینہ فروش کے تمام تر کوائف مجھ تک پہنچ چکے تھے۔ رئیس شاہ نے اپنے اس سابق دوست کے بارے میں بڑے کڑوے انداز میں مختصراً مجھے بتایا' پھر کہا۔

''سلطانہ آج کل اس شخص کے ہاتھ میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔''

''اگر واقعی ایسا ہے تو پھر آپ کی بیوی بہت غلط کر رہی ہے۔'' میں نے اثبات میں رئیس شاہ کی حمایت میں کہا۔ ''کسی کی باتوں میں آ کر اپنے گھر کو آگ لگانا دانشمندی نہیں ہے۔''

''یہ نکتہ آپ سلطانہ کو سمجھائیں نا۔'' وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ''بیگ صاحب! اگر آپ یہ کام کر دیں تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ میرا گھر برباد ہونے سے بچ جائے گا اور اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر بھی دے گا بلکہ.....'' وہ رکا' معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا اور آواز دبا کر بولا۔ ''میں بھی آپ کی ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔''

میں نے رئیس شاہ کو یہی تاثر دیا کہ میں اس کی باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''شاہ جی! خلع کے سلسلے میں میرے پاس جو بھی کیس آتے ہیں' میں ان عورتوں کو یہی سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ میری حتی الامکان یہ سعی ہوتی ہے کہ وہ اس نوعیت کی مقدمے بازی سے باز آ جائیں۔ یہ نصیحت بہت کم عورتوں کی سمجھ میں آتی ہے۔ میں نے آپ کی بیوی کو بھی اس معاملے کے نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا تھا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے خیر.....'' میں نے تھوڑا وقفہ دے کر ایک گہری سانس خارج کی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ کی فرمائش پر میں ایک اور کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ آپ دو تین دن کے بعد دوبارہ آ کر مجھ سے ملیں۔ ہو سکتا ہے اللہ کوئی بہتر راہ نکال دے۔''

''تو اس کا مطلب ہے' آپ میرے لئے کام کرنے کو تیار ہیں؟'' وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

''میں سچائی' صداقت اور انصاف کے حصول کے لئے کام کرتا ہوں شاہ جی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اب جو بھی ان کا طلب گار ہو..... اور جہاں تک میاں بیوی کے ازدواجی معاملات کا تعلق ہے تو.....''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر رئیس شاہ کی آنکھوں میں دیکھا' پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ یہ معاملہ بگڑنے نہ پائے۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں' اس مسئلے کا بھی حل نکل ہی آئے گا۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اپنے ہینڈ بیگ میں سے نوٹوں کی ایک گڈی برآمد کرنے کے بعد بولا۔ ''آپ کی فیس کتنی ہے بیگ صاحب؟''

''میں اس کیس کی فیس آپ کی بیوی سے وصول کر چکا ہوں شاہ جی!''

''وہ معاملہ بگاڑنے کے لئے سلطانہ نے آپ کو دی تھی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں معاملہ بنانے اور سنبھالنے کے لئے دے رہا ہوں۔''

''ابھی یہ رقم آپ میری امانت جان کر اپنے پاس محفوظ رکھیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر اس کیس کا اونٹ آپ کے حسب منشا کروٹ بیٹھ گیا تو میں یہ رقم آپ سے لے لوں گا۔''

''اگر آپ اس اونٹ کی رسی کو طریقے سلیقے سے جھٹکا دیں گے تو اونٹ کیا' اس کا باپ بھی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیدھی کروٹ بیٹھے گا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے بیگ صاحب!''

میں نے دونوں ہاتھ جھاڑ کر اسے دکھائے اور اس کے ہاتھوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت تو سب کچھ آپ کے ہی ہاتھوں میں نظر آ رہا ہے۔''

اس نے چونک کر اپنے ہاتھوں کا جائزہ لیا' پھر اپنی سوچ کی روشنی میں بات کو کہیں سے کہیں لے گیا' گہری سنجیدگی سے اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

''بیگ صاحب! آپ کا سٹار کون سا ہے؟''

''آپ میرا سٹار کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' میں نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

''میں ایک ماہر علم نجوم ہوں۔'' وہ بڑے فخریہ انداز میں سینہ پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ مجھے اپنا سٹار بتا دیں گے تو میں آپ کے بارے میں اہم پیش گوئیاں کر سکتا ہوں۔''

"دراصل...... مجھے علم نجوم سے دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"یہ الگ بات ہے......" وہ برا مانے بغیر بولا۔ "اگر آپ کو دلچسپی نہیں تو پھر میں آپ کو بور نہیں کروں گا، لیکن آپ کو میری جانب سے ایک تحفہ تو ابھی قبول کرنا ہوگا۔"

"تحفہ...... کیسا تحفہ؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ کا سٹار کون سا ہے؟" وہ سسپنس پیدا کرتے ہوئے بولا۔

میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ "مجھے نہیں معلوم......"

وہ جان چھوڑنے کو تیار نہیں تھا، پوچھا۔ "ڈیٹ آف برتھ تو یاد ہوگی؟"

میں نے اسے اپنی تاریخ پیدائش بتا دی۔

"آپ کا برتھ سٹون ٹرا کوائس اور ایمرالڈ ہے، یعنی فیروزہ اور زمرد!" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس وقت یہ دونوں پتھر میرے بیگ میں موجود ہیں۔ میں دکھاتا ہوں۔ آپ ان میں سے کوئی ایک پسند کر لیں...... اور آپ انکار نہیں کریں گے، کیونکہ کسی کے تحفے کو ٹھکرانا اس کا دل توڑنے کے مترادف ہے۔"

میں نے کچھ نہیں کہا او چپ چاپ اس کے ہاتھوں کی حرکات کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ چند لمحات تک اپنے ہینڈ بیگ کے ساتھ مصروف رہا، پھر دو مستطیل لکڑیاں سی بیگ میں سے نکال کر میرے جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"لیں جناب! پسند فرمائیں۔"

مذکورہ مستطیل لکڑیوں میں سے ایک پر عمدہ قسم کا فیروزہ اور دوسری پر اعلیٰ نسل کا زمرد فکس تھا۔ میں نے آج تک پتھر اور جواہرات کو انگوٹھیوں اور زیورات میں جڑا ہوا دیکھا تھا۔ یہ انداز میرے لئے بڑا منفرد اور نیا تھا۔ جب یہی بات میں نے رئیس شاہ سے پوچھی تو اس نے ان الفاظ میں وضاحت کی۔

"یہ نگینے ایران سے منگوائے ہیں میں نے۔ وہاں جواہرات کو ڈسپلے کرنے کا یہی طریقہ رائج ہے۔ ایرانی جوہری اس بات کو سخت ناپسند کرتے ہیں کہ نگینے کو چھو کر دیکھا جائے۔ آپ بھی ٹچ کئے بغیر ہی پسند کر لیں۔"

وہ دونوں نگینے نہایت ہی شفاف اور اعلیٰ معیار کے تھے۔ میں نے رئیس شاہ کے

جذبات کی قدر کرتے ہوئے اور ڈرتے ڈرتے زمرد کا تحفہ قبول کر لیا۔ ڈرتے ڈرتے اس لئے کہ میری معلومات کے مطابق شاہ جی، بڑے عمدہ نظر آنے والے آرٹی فیشل سٹون بھی تیار کرتے تھے۔ بہرحال، چار کیرٹ (قیراط) کا وہ ایمرالڈ بالکل اصلی پتھر تھا۔ میں نے اپنی تسلی کے لئے ایک جوہری دوست سے اس کا ٹیسٹ کرایا تھا۔ میرے مذکورہ دوست کے مطابق اس ایمرالڈ کی اوپن مارکیٹ میں قیمت دو ہزار روپے فی کیرٹ سے کم نہیں تھی، یعنی شاہ جی کا تحفہ آٹھ، دس ہزار روپے مالیت کا تھا۔ آج سے چالیس سال پہلے دس ہزار روپے کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی۔

رخصت سے پہلے میں نے رئیس شاہ سے پوچھ لیا۔ "شاہ جی! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ روبی کے ساتھ کیسی بزنس میں پارٹنر شپ کرنے جا رہے ہیں؟"

"بزنس تو یہی ہے جو میں آج کل کر رہا ہوں مثلاً...... علم نجوم، پتھر و جواہرات، الواح و طلسمات وغیرہ۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "روبی میری ایک کلائنٹ ہے اور میری معتقد بھی۔ وہ مجھ پر بہت بھروسہ کرتی ہے۔ یہ اسی کا آئیڈیا ہے کہ میں اپنے بزنس کو کراچی کے ساتھ ساتھ نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر لے جاؤں۔ اس کام کا آغاز ہم پاکستان یعنی نیشنل لیول پر کریں گے...... پاکستان کے چار بڑے شہروں کراچی، لاہور، ملتان اور راولپنڈی میں ہم دونوں مل کر تین، تین دن کلینک کیا کریں گے۔ جس شہر کا نمبر ہو، اپنی آمد سے دو روز پہلے وہاں کے مقامی اخبارات میں اشتہار کے ذریعے کلینک کی تاریخوں اور اوقات کا اعلان کر دیا جائے گا۔ قیام مذکورہ شہر کے اعلیٰ ہوٹل میں ہوگا اور ہوٹل ہی میں کلائنٹس سے ملاقات کا انتظام بھی کرایا جائے گا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد ہم اس طریقہ کار کو بین الاقوامی سطح پر آزمائیں گے۔ عرب ممالک کے علاوہ ایران، عراق، انڈیا، سری لنکا وغیرہ کے دورے بھی کریں گے۔ تمام تر اخراجات روبی کے ذمے ہوں گے۔ سروس میں دوں گا۔ منافع میں ہم برابر کے حصے دار ہوں گے۔" وہ رکا اور مجھ سے پوچھ بیٹھا۔

"بیگ صاحب! آپ بتائیں، کیسا آئیڈیا ہے؟"

"بہت شاندار اور منافع بخش۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی......"

"کون سی بات؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''یہاں تک تو درست ہے کہ رہن سہن اور سفری اخراجات آپ کی بزنس پارٹنر روبی اٹھائے گی' جس کے لئے وہ منافع میں برابر کی شریک ہے۔'' میں نے اپنے ذہن کی الجھن کو زبان تک لاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وہ ہر جگہ آپ کے ساتھ ساتھ کیوں جائے گی۔ آپ کے اس بزنس میں روبی کا اصل کردار کیا ہوگا؟''

''بہت اچھا سوال کیا ہے آپ نے بیگ صاحب!'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''روبی کو میرے پاس آتے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے۔ وہ میری معتقد ہی نہیں' بلکہ شاگرد بھی ہے۔ روبی بہت ہی ذہین عورت ہے' وہ بڑی تیزی سے علم نجوم میں مہارت حاصل کر رہی ہے۔ وقتی زائچے پر اسے کمانڈ حاصل ہے۔ وہ میری اسسٹنٹ کے طور پر ساتھ جائے گی۔''

رئیس شاہ کی وضاحت کے بعد اس سلسلے میں مزید کسی سوال کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ سلطانہ نے میرے سامنے رئیس شاہ کی شخصیت کو جس انداز میں پینٹ کیا تھا' شاہ جی اس کے بالکل برعکس ثابت ہو رہا تھا۔ اس سے گفتگو کے دوران میں اس کی ذات کے حوالے سے میری رائے میں قدرے نرمی پیدا ہوتی جا رہی تھی یا تو وہ اس وقت مجھے متاثر کرنے کے لئے بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کر رہا تھا یا پھر سلطانہ نے اس کے حوالے سے سراسر غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

''شاہ جی! آپ اپنی بیوی کو بھی تو اسرار علم نجوم سکھا سکتے تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ آپ کے شانہ بشانہ سفر کر سکتی تھی۔ اس طرح سلطانہ کے دل میں کسی قسم کا کوئی شک پیدا نہ ہوتا اور آج آپ دونوں اس واہیات صورت حال کا شکار نہ ہوتے؟''

''آپ کیا سمجھتے ہیں' میں نے اسے سکھانے پڑھانے کی کوشش نہیں کی ہوگی؟'' وہ الٹا مجھی سے مستفسر ہوا۔

''تو آپ کا مطلب ہے' آپ یہ کوشش کر چکے ہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں...... ایک بار نہیں' ہزار بار کوشش کر چکا ہوں۔ لیکن ان تلوں میں ایک قطرہ تیل کا نہیں۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو دراصل آسٹرولوجی (علم نجوم) سے دلچسپی نہیں ہے' اس لئے میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا' لیکن اتنا بتا دوں کہ سلطانہ زحل کی ماری ہوئی ہے۔ ساڑھ ستی کے دوران میں پیدا ہونے والے لوگ زندگی بھر عجیب وغریب

ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں اور پیچیدگیوں کا شکار رہتے ہیں۔ ان کے دماغ پر ایک انوکھی سنک سوار رہتی ہے۔ زحل کے ناقص اثرات کے باعث ان کے ہر کام میں تاخیر واقع ہوتی ہے اور بنتے بنتے کام بگڑ جاتے ہیں' جس کے لئے وہ دوسروں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں اور انہیں اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں۔ ان میں شک اور بداعتمادی کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ یہی حال سلطانہ کا بھی ہے......'' وہ سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوا' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس زحل زدہ سے تو کوئی شادی کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اللہ بخشے اس کی ماں قمر النساء کو۔ وہ میرا بڑا احترام کرتی تھی۔ میں اس کی درخواست کو رد نہیں کر سکا اور اس زحل کی ماری کو گلے لگا لیا' ورنہ آج تک دروازہ کھولے رشتے کا انتظار کر رہی ہوتی۔''

''لیکن شاہ جی......'' میں نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا۔ ''میں نے تو سنا ہے کہ آپ نے ایک خاص پلاننگ کے تحت قمر النساء کو مٹھی میں لے کر سلطانہ سے شادی کی تھی؟''

''یہ فلسفہ آپ نے سلطانہ ہی کی زبانی سنا ہوگا بیگ صاحب!'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اس نے آپ کو یہ بھی بتایا ہوگا کہ میں ایک لالچی' ظالم اور سفاک انسان ہوں۔ میں اپنے پاس آنے والوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر انہیں لوٹتا ہوں۔ میری نظر صرف ان کی دولت پر لگی رہتی ہے' ان کی مجبوریوں کی میری نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں۔''

''ہاں' یہ سب کچھ تو اس نے مجھے بتایا ہے اور انہی اسباب کی بنا پر وہ آپ سے الگ ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تو کیا ایسا کچھ نہیں ہے؟''

''ہرگز نہیں!'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''یہ سب سلطانہ کا دماغی فتور ہے' بیمار ذہن کی پیداوار......''

''حیرت ہے۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''سلطانہ نے آپ کی ذات کے حوالے سے مجھے جو کچھ بتایا ہے' آپ اس کے برعکس بیان کر رہے ہیں۔''

''اس کا دماغ خراب ہوا ہے...... بلکہ خراب کر دیا گیا ہے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ اگر آج قمر النساء ہوتی تو آپ کو بتاتی کہ میں نے کسی لالچ میں آ کر سلطانہ سے شادی کی تھی یہ میرا احسان تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ سلطانہ تعلیم یافتہ تھی' خوب صورت تھی' صاحب حیثیت فیملی

سے تعلق رکھتی تھی، لیکن یہ بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ وہ زحل زدہ تھی۔ پانچ کیرٹ کا ایک عمدہ اور شفاف روبی، ایمرالڈ، سیفائر، ٹوپاز، ڈائمنڈ اگر ایک لاکھ روپے قیمت رکھتا ہو تو اس میں کریک آتے ہی وہ محض کانچ کا ایک خوشنما ٹکڑا رہ جاتا ہے۔ جس طرح پتھر کی قیمت اس کی کوالٹی کی بنا پر طے کی جاتی ہے، اسی طرح انسان کی قدر و قیمت اس کی خوش بختی کی رہین منت ہوتی ہے۔ اگر سلطانہ خوب صورت، سمارٹ، تعلیم یافتہ اور آسودہ حال تھی تو پھر اس کا رشتہ کیوں نہیں آتا تھا۔ اس لئے نا کہ اس کے مقدر کو پیدائشی زحل گرہن لگا ہوا تھا۔ اس آفت زادی کو سینے سے کس نے لگایا؟ میں نے...... اور آج میں ہی سب سے برا ہوں اور جہاں تک ہوس اور لالچ کا تعلق ہے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی، پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''جب میری سلطانہ سے شادی ہوئی، میں کسی فٹ پاتھ پر نہیں پڑا ہوا تھا۔ میں صاحب حیثیت اور صاحب عزت تھا بیگ صاحب۔ میری کوئی ویلیو تھی تو ہزاروں دیگر لوگوں کی طرح قمر النساء بھی میرے آستانے پر پہنچی تھی نا...... میں وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے کا حامی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے ناظم آباد سے گلشن اقبال آنے کے بعد اپنے معاوضے میں اچھا خاصا اضافہ کر دیا ہے، لیکن آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ میں کسی کلائنٹ کو گھر سے بلا کر نہیں لاتا۔ ان کی ضرورت کھینچ کر انہیں میرے کلینک پر لاتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں گن پوائنٹ پر ان کی جیب سے پیسے نکلواتا۔ وہ اپنی ضرورت بیان کرتے ہیں، میں اس کام کا معاوضہ بتاتا ہوں۔ وہ مجھے ادائیگی کرتے ہیں اور میں ان کا کام کر دیتا ہوں۔ جب سب کچھ باہمی افہام و تفہیم سے ہو رہا ہے تو میں کہاں سے ظالم اور سفاک ہو گیا...... بتائیں نا بیگ صاحب؟''

''ہاں...... اس صورت میں تو آپ کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔'' میں نے منطقی انداز میں کہا۔

''اب میں آپ کو اپنی زندگی کا ایک راز بتاتا ہوں بیگ صاحب!'' وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ بات میں نے آج تک کسی کو نہیں بتائی، لیکن پتا نہیں کیوں...... آپ پر اعتماد کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ آپ بہت ہی گہرے انسان ہیں جناب! مجھے امید ہے آپ ہمارے کیس کو عدالت میں لے جائے بغیر اپنی عدالت ہی میں نمٹا دیں گے۔ سمجھ لیں کہ ایک

میاں بیوی کا مقدمہ آپ کی عدالت میں لگا ہوا ہے۔ آپ نے چند روز پہلے والی پیشی پر بیوی کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا ہے۔ آج آپ کے سامنے دوسرے فریق یعنی شوہر کا بیان ہو رہا ہے۔ تیسری پیشی پر آپ فیصلہ سنائیں گے اور فریقین کو اپنے فیصلے کی پابندی کا حکم بھی دیں گے...... آپ بتا چکے ہیں کہ آپ ہمیشہ سچائی، صداقت اور انصاف کے حصول کے لئے کام کرتے ہیں۔''

''ہاں، اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن لائی۔ ''میں بھی اور عدالت بھی اور سب سے بڑھ کر قانون بھی اسی بات پر زور دیتا ہے کہ اگر نازعہ معاملات کو مل بیٹھ کر مصالحت اور مفاہمت سے حل کر لیا جائے تو اس سے اچھی کوئی ات نہیں۔ عدالت اور مقدمے بازی تو آخری آپشن ہے اور اس سے بچنے ہی کی کوشش کرنا پاہئے۔ مجبوری کی بات دیگر ہے۔''

''میرا خیال ہے، ہمارا معاملہ ابھی مجبوری اور بے بسی کے فیز میں داخل نہیں ہوا۔'' وہ فہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ اسے اپنی عدالت میں سماعت کر کے انصاف کے تقاضے ھا سکتے ہیں۔''

''میں کوشش کروں گا......'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''مجھے یقین ہے، آپ کی یہ کوشش ضائع نہیں جائے گی۔''

''شاہ جی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ مجھے اپنی زندگی کے کسی اہم راز سے آگاہ کرنے جا رہے تھے......؟''

''جی، میں اسی طرف آ رہا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ سے ں خلوص بھری درخواست کروں گا کہ میرے اس راز کو اپنے سینے میں دفن کر دیجئے گا۔ آپ سے شیئر کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تا کہ میں اپنے ماتھے پر چسپاں لالچ، ہوس، لوٹ مسوٹ اور ظلم و زیادتی کے متعدد لیبلز کو اتار سکوں۔ میں ہرگز ایسا نہیں ہوں جیسا کہ سلطانہ نے مجھے بنا کر پیش کیا ہے۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''آپ کی زندگی کا یہ قیمتی راز رے دل میں محفوظ رہے گا۔''

''میری ابتدائی زندگی بڑی خراب اور ناقابل ذکر ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں

بتانے لگا۔ ''میں نے سلطانہ سے پہلے بھی سلمٰی نامی ایک عورت سے شادی کی تھی۔ میں اپنی زندگی کے اس حصے کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مختصراً آپ یوں سمجھ لیں کہ میں ان دنوں ایک ناکام اور نامراد شخص ہوا کرتا تھا۔ پھر میری زندگی میں اچانک ایک انقلاب آ گیا۔'' یہاں تک بتانے کے بعد وہ تھما' ایک گہری سانس خارج کی' پھر سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''سلمٰی کی وفات کے بعد میں کچھ عرصہ تو یہیں مارا مارا پھرتا رہا' پھر گھر پر تالا ڈال کر ملک کے دورے پر نکل کھڑا ہوا۔ مختلف دیہاتوں' قصبہ جات اور شہروں سے ہوتے ہوئے میں شیخوپورہ پہنچ گیا۔ پنجاب کا یہ علاقہ جرائم کے لحاظ سے سرفہرست مانا جاتا ہے۔ شیخوپورہ کے بعد اوکاڑہ اور اوکاڑہ کے بعد گوجرانوالہ کا نمبر آتا ہے۔ بہرحال' جرائم کے گڑھ شیخوپورہ میں میری ایک اللہ والے سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ظلمت کی شب تاریک میں حق کا چراغ روشن کیے بیٹھا تھا۔ میں اس چراغ کی روشنی سے چپک کر رہ گیا۔ اس اللہ والے کی صحبت میں' میں نے چند ماہ گزارے اور علم و ہنر کے خزانے سمیٹ کر واپس کراچی آ گیا۔ واپسی کے فیصلے میں انہی بزرگ کا ہاتھ تھا۔ میں ان کے حکم پر ہی واپس آیا تھا۔ میں تو بند کباب اور چناپاپڑی کا ٹھیلا لگانے والا ایک ناقابل ذکر معمولی سا انسان تھا۔ آج میں جو کچھ ہوں' انہی بزرگ کے فیض سے ہوں۔ انہوں نے بہ وقت رخصت مجھے دو نصیحتیں کی تھی۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لئے رکا' پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''نمبر ایک...... انہوں نے فرمایا تھا کہ رئیس تمہارے نصیب میں ازدواجی زندگی کا سکون نہیں لکھا ہوا۔ میرا مشورہ ہے کہ اب شادی نہ کرنا اور اگر کسی مخصوص حالات میں شادی ناگزیر بھی ہو جائے تو پھر ہر دکھ تکلیف اٹھا کر اس عورت کے ساتھ ساری زندگی گزار دینا۔ اسے خود سے خود کو اس سے الگ نہیں ہونے دینا...... یہی وجہ ہے بیگ صاحب......'' وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوا' پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''کہ آج میں اس شادی کو بچانے کے لئے آپ کی منت خوشامد کر رہا ہوں' حالانکہ سلطانہ نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ میں نے قمر النساء کے آنسوؤں کی لاج رکھتے ہوئے سلطانہ سے شادی کا فیصلہ کیا تھا اور اب مجھے ان بزرگ کے فرمان کی لاج رکھنا ہے۔ اگر خلع کے سلسلے میں آپ نے سلطانہ کو نہ سمجھایا تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ آپ اسے

کسی بھی طرح سمجھانے کی کوشش کریں کہ وہ احمقانہ خیال سے باز آ جائے۔ اس کے لئے میں اس کی ہر شرط' ہر مطالبہ ماننے کو تیار ہوں۔ اگر اسے میری زبان کا بھروسہ نہ ہو تو میں اسٹمپ پیپر پر لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ آپ اپنی وکالت میں مجھ سے کسی نوعیت کا ڈاکومنٹ بھی کروا لیں۔''

اس نے بڑی ٹھوس اور وزنی بات کی تھی' جو اس کے سچے جذبات کی ترجمانی کرتی تھی۔ اگر وہ جھوٹا اور فراڈ قسم کا شخص ہوتا تو اتنی بڑی بات کر ہی نہیں سکتا تھا۔ رئیس شاہ نے اپنی پہلی شادی کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی بیٹی صدف کا کہیں ذکر نہیں کیا تھا' جسے سلطانہ کے بقول اس کا ماموں اعجاز حسین اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے بھی ماضی کے اس قصے پر مٹی ڈال دی۔ گڑے مردے اکھاڑنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ اہمیت اس بات کی تھی کہ جو زندہ ہیں ان کی زندگی کو آسان بنانے کی کوشش کی جائے اور میری پوری توجہ اسی نکتے پر لگی ہوئی تھی۔

''اور آپ کے مرشد نے دوسری نصیحت کیا کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نمبر دو......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ''انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اپنی آمدنی کا پچاس فیصد اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا۔ اس سے اللہ میرے کاروبار میں برکت دے گا اور میں ایسا ہی کر رہا ہوں۔ اللہ مجھے معاف کرے' میں اپنی شان جتانے کے لئے نہیں کہہ رہا' لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس وقت درجنوں نہیں بلکہ سیکڑوں بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی کفالت اور تعلیم کی ذمے داری اٹھا رکھی ہے اور یہ یہی وجہ ہے کہ اللہ میرے لئے آمدنی کے مزید دروازے کھول رہا ہے۔ یہ روبی سے پارٹنر شپ والا پروجیکٹ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اللہ نے جب اپنے مفلس اور نادار بندوں کی مدد کرنا ہوتی ہے تو وہ مجھ جیسے گناہ گاروں کو اس نیک کام کا وسیلہ بنا دیتا ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''کیا یہ بات سلطانہ کے علم میں ہے کہ آپ درپردہ ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں!'' اس نے بڑے قطعی انداز میں سر کو نفی میں جھٹکا اور بولا۔ ''آج پہلی بار میں نے آپ کے سامنے یہ راز کھولا ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتی کہ بزرگ ہستی نے میری ناخوشگوار ازدواجی زندگی کی پیشگوئی کی تھی۔ مجھے اپنی ازدواجی زندگی کو بھی بچانا ہے اور اپنے مشن کو بھی جاری رکھنا ہے اور...... اس سلسلے میں آپ میری مدد کریں گے۔''

میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ ''کیا اس بحران کے حوالے سے آپ نے اپنے مرشد سے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھا؟''

''وہ بزرگ ہستی اس دنیا سے پردہ فرما چکی ہے۔'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''میں کچھ عرصہ پہلے اپنے مسائل کے حل کے لئے شیخوپورہ گیا تھا' تاکہ اپنی موجودہ صورت حال سے انہیں آگاہ کرسکوں اور جبھی پتا چلا کہ مجھے نشان منزل دکھانے والا چراغ گل ہو چکا ہے۔'' وہ بڑے رنجیدہ انداز میں متوقف ہوا' پھر ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''اب مجھے اپنے تمام بحرانوں سے خود ہی نمٹنا ہے۔ چاہے وہ سلطانہ کی بددماغی ہو یا ریاست علی کا پھیلایا ہوا شر......''

''یہ ریاست علی تو کبھی آپ کا دوست ہوا کرتا تھا۔'' میں نے اپنی معلومات کی خاطر پوچھ لیا۔ ''پھر وہ ایسی خطرناک دشمنی پر کیوں اتر آیا ہے؟''

سلطانہ مجھے بتا چکی تھی کہ وہ ریاست علی کی فراہم کردہ معلومات پر ہی سرگرم عمل ہوئی تھی اور اپنی تحقیق سے اس نے یہ پتا چلا لیا تھا کہ رئیس شاہ عنقریب اسے طلاق دے کر روبی سے شادی کرنے والا ہے۔ اس کا مطلب تھا' وہ مسلسل ریاست سے رابطے میں تھی۔ اگر رئیس شاہ کے پیش کردہ دلائل پر ہمدردی سے غور کیا جاتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ سلطانہ' ریاست علی کے بہکاوے میں آ کر یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ اسی نکتے کی وضاحت کے لئے میں نے رئیس شاہ سے یہ سوال کیا تھا۔

''بڑی سیدھی اور آسان سی بات تو یہ ہے کہ وہ بدبخت مجھ سے اور میری ترقی سے جلتا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے جب اس سے نگینے لینا بند کئے اور اپنے کلائنٹس کو بھی اس کی دکان پر جانے سے روک دیا تو اس نے مجھ سے شدید ترین جھگڑا کیا تھا۔ بس جبھی سے وہ میرا دشمن ہو گیا تھا اور اب اس نادان سلطانہ کی ڈوریاں ہلا کر وہ اپنی دشمنی نکال رہا ہے۔''

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ نے ریاست علی سے کاروباری معاملات ختم کیوں کر دیئے تھے؟'' میں نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

''کیوں نہیں بیگ صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ میرے بھی وکیل ہیں۔ کہتے ہیں وکیل اور معالج سے کبھی کچھ چھپانا نہیں چاہئے ورنہ اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔''

''تو پھر بتائیں......؟'' میں نے کہا۔

''اس نے بتایا۔'' میں نے ریاست علی کی بے ایمانی اور دھوکا دہی کی وجہ سے معاملات ختم کیے تھے۔ اس نے اپنی دکان کے پچھلے حصے میں ایک بھٹی لگا رکھی ہے۔ جہاں وہ زیورات کی میکنگ کے علاوہ نقلی نگینے بھی تیار کرتا ہے۔ وہ اس شعبے کا پرانا اور گھاگ آدمی ہے۔ سارے گورکھ دھندوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ عام کرسٹل کو مختلف طریقوں سے گزار کر اور بھٹی کی آگ دکھا کر وہ آرٹی فیشل نیلم' پکھراج' یاقوت' ہیرا اور زمرد تیار کرنے کا ماہر ہے۔ اس نے میرے ساتھ بھی فراڈ شروع کر دیا تھا۔ جب میں نے اس کی بدمعاشی پکڑ لی تو اس نے الٹا مجھی پر ملبا ڈال دیا۔ ایک تو اس نے یہ الزام لگایا کہ میں نے نگینہ بدل دیا ہے' اس کے ساتھ ہی پوری مارکیٹ میں میرے خلاف پروپیگنڈا بھی شروع کر دیا کہ میں نقلی جواہرات تیار کر کے فروخت کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب چور کی چوری پکڑی جاتی ہے تو وہ کس طرح شور مچاتا اور بلبلاتا ہے۔ ریاست علی بھی زخمی سانپ کے مانند بس کھول رہا ہے۔''

''اچھا تو اصل صورت حال یہ ہے......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو واقعی بڑی سنگین سچویشن میں گھرے ہوئے ہیں۔''

''بیگ صاحب! میں نے آپ کو سب کچھ سولہ آنے سچ بتا دیا ہے۔'' وہ بڑے مستحکم انداز میں بولا۔ ''اگر کسی مرحلے پر میرا بیان کردہ ایک لفظ بھی غلط ثابت ہو تو آپ ایک جج کی حیثیت سے مجھے جو چاہیں سزا سنا سکتے ہیں۔ میں اف تک نہیں کروں گا۔''

''اچھا یہ بتائیں......'' میں نے پوچھا۔ ''اگر سلطانہ کسی بھی طرح اپنی ضد سے باز نہیں آتی اور آپ کی زندگی سے نکل جاتی ہے تو اس کے اس عمل سے آپ کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟''

''میرے لئے دنیاوی نقصان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس فیصلے کے بعد میری ساکھ کو یقیناً ایک دھچکا تو لگے گا' لیکن مجھے اس کی بھی پروا نہیں۔'' وہ بے حد سنجیدہ انداز میں بولا۔ ''میرے نزدیک سب سے مقدم اور قیمتی وہ عہد ہے جو میں نے اپنی بزرگ ہستی سے کر رکھا ہے یا یوں کہہ لیں کہ جوان کی نصیحت تھی کہ اگر میں شادی کروں تو پھر اس عورت کے ساتھ اپنی زندگی کی آخری سانس تک یا اس کی زندگی کی آخری تک۔'' وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا' بڑی اُمید بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''اگر سلطانہ اپنی ضد سے باز نہ آئی تو قسم ہے پیدا کرنے والے کی۔ میں اپنے مرشد کے سامنے خود کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا' چاہے مجھے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کتنا ہی سنگین قدم کیوں نہ اٹھانا پڑے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں شاہ جی......؟'' میں نے متذبذب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں بیگ صاحب!'' وہ چٹانی لہجے میں بولا۔ ''دس بیس ہزار کے عوض خطرناک سے خطرناک کام کرنے والے مل جاتے ہیں۔ سلطانہ کو پوری زندگی میرے ساتھ' میری بیوی کی حیثیت ہی سے گزارنا ہوگی۔ بہ صورت دیگر اس کے حق میں ڈگری ہونے سے پہلے ہی......''

وہ سیدھا سیدھا سلطانہ کو اجرتی قاتل سے ٹھکانے لگانے کی بات کر رہا تھا۔ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

''شاہ جی! آپ اتنے جذباتی نہ ہوں۔ انشاء اللہ اس انتہائی اقدام کی نوبت نہیں آئے گی۔ میں سلطانہ کو ہینڈل کرلوں گا۔''

''میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ وہ اپنی ضد سے باز آجائے اور مجھے ندامت سے بچا لے۔'' وہ یکدم نارمل ہوتے ہوئے بولا۔ ''جب میں اس کی ہر خواہش' ہر ضرورت اور ہر مطالبے کو تحریری اور عملی شکل میں پورا کرنے کو تیار ہوں تو پھر وہ میرے دشمن کے بہکاوے میں آکر اپنے آشیانے اور میری عاقبت کو خراب کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہے۔''

''دیکھیں شاہ جی!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا کہ آپ لوگوں کا گھر اور زندگیاں برباد ہونے سے بچ جائیں لیکن......''

''لیکن کیا؟'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''لیکن یہ کہ اس سلسلے میں مجھے آپ کی طرف سے فری ہینڈ چاہئے ہوگا۔''

''کیسا فری ہینڈ؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''اس طرح کا فری ہینڈ کہ میں جس بھی قیمت اور جن بھی شرائط پر سلطانہ کو اس کی ضد سے دستبردار ہونے کے لئے تیار کروں' آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے نمائندے کی حیثیت سے اس سے بات کروں گا اور اس کی تسلی کرانے کے بعد اپنی بات منوالوں گا۔''

''ڈن!'' وہ میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ کہیں تو میری جانب سے اپنے لئے مختار نامہ تیار کرلیں۔''

''اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے آپ کی زبان پر بھروسہ ہے۔''

''کاش! سلطانہ بھی مجھ پر ایسا ہی اعتماد کرنے لگے......'' وہ حسرت آمیز انداز میں بولا۔

''ایسا ہونے ہی والا ہے شاہ جی!'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''شاید قدرت نے کسی خاص مقصد کے تحت آپ لوگوں کو میرے پاس بھیجا ہے۔ میری حتی الامکان کوشش یہی ہوگی کہ اسی دفتر میں بیٹھے بیٹھے آپ لوگوں کا معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے۔''

''آپ کے منہ میں گھی شکر بیگ صاحب!'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''آپ مجھے روبی اور ریاست علی کے مکمل ایڈریس اور فون نمبرز فراہم کر دیں۔ میں ایک اجنبی اور لاتعلق شخص کی حیثیت سے انہیں ٹٹولنے کی کوشش کروں گا' تاکہ آپ دونوں کے بیانات کے بعض حصوں کو چیک کیا جاسکے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے بیگ صاحب!'' وہ تعاون آمیز انداز میں بولا۔ ''اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔''

وہ مزید پندرہ منٹ تک میرے پاس رکا' پھر رخصت ہوگیا۔

***

سلطانہ نے مجھے تصویر کا ایک رخ دکھایا تھا۔

رئیس شاہ نے دوسرے رخ سے پردہ اٹھایا تھا۔

اب گیند میری کورٹ میں تھی' جس طرح حالات اس کیس کو میری کورٹ میں لے آئے تھے۔ مجھے بڑی گہری سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ان دونوں میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ دونوں ہی درست ہوتے یا دونوں ہی غلط ہوتے۔ ہاں البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ دونوں کچھ کچھ صحیح اور کچھ کچھ غلط ثابت ہوتے۔

سلطانہ نے رئیس شاہ کو جس انداز میں پینٹ کیا تھا' وہ اس رئیس شاہ سے قطعی مختلف تھا' جس سے میں نے طویل ملاقات کی تھی۔ اگر سلطانہ کا موقف ہی ٹھیک تھا تو پھر اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ رئیس شاہ نے میرے سامنے محض عمدہ اداکاری کا ایک نمونہ پیش کیا تھا' لیکن

اس نے جس کھلے انداز میں پیشکش اور دعوے کئے تھے' اس سے یہی لگتا تھا کہ وہ ایک دم کھرا اور سچا ہے۔

آنے والے دو دنوں میں' میں نے اپنے مخصوص ذرائع استعمال کر کے ماہ جبیں عرف روبی اور جوہری ریاست علی کے بارے میں نہایت ہی اہم معلومات حاصل کر لیں۔ ریاست علی سے تو میں ایک کلائنٹ کی حیثیت سے خود جا کر بھی ملا تھا اور شاہ جی کا تحفہ وہ ایمرالڈ اسے دکھا کر کہا تھا کہ میں اس زمرد کو فروخت کرنا چاہتا ہوں' کتنے پیسے مل جائیں گے؟ اس نے مذکورہ زمرد کو اپنی آنکھوں کے سامنے گھما پھرا کر بڑی بے دلی سے کہا تھا کہ یہ تیسرے درجے کا پتھر ہے۔ ہزار' بارہ سو سے زیادہ کا نہیں ہوگا۔ اس فتوے سے ریاست کی بدنیتی کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اگر میں نے اپنے ایک جوہری دوست سے اس ایمرالڈ کی قدر و قیمت کی تصدیق نہ کی ہوتی تو شاید میں رئیس شاہ ہی کو فراڈ سمجھتا۔ اس کے علاوہ میری تحقیق و تفتیش سے یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ وہ اللہ کا بندہ' بندے دا پتر نہیں تھا۔ سونے میں ملاوٹ کرنا اور کرسٹل کو قیمتی نگینوں میں تبدیل کرنا اس کی زندگی کا حاصل تھا۔ علاوہ ازیں اس کے حوالے سے ایک یہ شکایت بھی عام سننے کو ملی کہ وہ فتنہ ساز' کینہ پرور اور بڑا حاسد قسم کا شخص تھا۔

دوسری جانب روبی کے حوالے سے جو رپورٹ مجھ تک پہنچی وہ بھی شاہ جی کے حق میں جاتی تھی۔ میں نے ڈیفنس فیز فائیو ہی میں رہنے والی اپنی ایک کلائنٹ کو روبی کے پیچھے لگایا تھا۔ اس کا تعلق مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ سے تھا اور اتفاق سے وہ روبی کو ذاتی طور پر بھی جانتی تھی۔ لہٰذا میری ضرورت کی معلومات اگلوانے کے لئے اسے مشکل پیش نہیں آئی۔ روبی نے بڑے اعتماد سے میرے کلائنٹ کو بتایا تھا کہ رئیس شاہ کی حیثیت اس کے لئے ایک استاد کی سی ہے۔ اگر پروفیسر صاحب کی بیوی ہماری شادی کے حوالے سے سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہے تو یہ اس کا پاگل پن ہے۔ بہرحال' اگر سلطانہ اس سے ملاقات کر کے کسی قسم کی تسلی کرنا چاہے تو وہ تیار ہے۔

اپنا ہوم ورک مکمل کرنے کے بعد میں نے سلطانہ کو اپنے دفتر بلا لیا اور نہایت ہی مختصر تفصیل میں رئیس شاہ کے مرشد کا ذکر بھی ہوا اور میں نے ازدواجی ناخوشگواریت کو ایڈٹ کر کے سلطانہ کو صرف اتنا بتایا کہ رئیس شاہ اپنے مرشد کی نصیحت کے مطابق بہت نیک کام کر رہا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ اس کے چہرے کی حالت تبدیل ہوتی رہی اور میرے خاموش ہونے پر اس نے

طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بیگ صاحب! رئیس شاہ نے اس کام کے لئے آپ کو کتنے پیسے دیئے ہیں؟''

میں نے اس چوٹ کا ذرا برا نہیں منایا' کیونکہ وہ حقائق سے واقف نہیں تھی۔ اس سچویشن میں وہ کوئی ایسی ہی سخت بات کر سکتی تھی۔ میں اس کا وکیل تھا اور مخالف پارٹی کی حمایت میں بول رہا تھا۔ اس کا غصے میں آ جانا ایک فطری امر تھا۔

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نہ تو دوغلا ہوں اور نہ ہی کانوں کا کچا۔ میں نے رئیس شاہ کے دعوؤں کی باقاعدہ تصدیق کی ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا ہے وہ صد فیصد درست ہے۔ آپ چاہیں گی تو میں اپنے دفتر میں روبی سے آپ کی ملاقات بھی کرا دوں گا۔ سچ جھوٹ آپ کے سامنے آ جائے گا۔''

چند لمحات کے تذبذب کے بعد اس نے پوچھا۔ ''اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ میں اس سے جو شرائط لکھواؤں گی' بعد میں وہ اس تحریر کی پاسداری بھی کرے گا؟''

''آپ دونوں کے درمیان ہونے والا یہ تحریری معاہدہ پکے کاغذات پر' میری وکالت میں تیار کیا جائے گا۔ میں اس دستاویز کی ورڈنگ ایسی رکھوں گا کہ اس کے فرار کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔ آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں۔''

''تب تو ٹھیک ہے.....'' وہ اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ''گواہوں کے ذیل میں' میں ایک نام روبی کا بھی ڈالوں گا تاکہ کام پکا ہو جائے' جس معاہدے میں روبی کی حیثیت ایک گواہ کی ہو' وہ خود اس کی خلاف ورزی کیسے کر سکے گی۔''

''یہ تو آپ بڑا زبردست کام کر رہے ہیں بیگ صاحب!'' وہ مطمئن لہجے میں بولی۔

''اب تو یقین آ گیا نا..... میں آپ ہی کا وکیل ہوں؟''

''جی ہاں..... بالکل۔'' وہ خجالت آمیز انداز میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''میری اب تک کی تحقیق سے یہی سچائی سامنے آئی ہے کہ رئیس شاہ اتنا برا شخص نہیں جتنا ریاست علی نے اسے بنا کر آپ کے سامنے پیش کیا ہے' جبکہ ریاست کا کردار بڑا منفی اور آگ لگانے والا ہے۔''

میرے اس تلخ مگر مبنی برحقیقت تبصرے پر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔

دیکھتے ہوئے وہ بڑے اضطراری انداز میں اپنے گلاب ہونٹوں کو کاٹنے لگی۔ مجھ سے یہ ظلم دیکھا نہ گیا تو میں نے جلدی سے کہا۔

''اب آپ وہ تمام شرائط اور مطالبات مجھے نوٹ کرادیں' جو آپ رئیس شاہ کے سامنے رکھنا چاہتی ہیں تاکہ میں پہلی فرصت میں ایک دھانسو قسم کا شرائط نامہ تیار کروالوں۔''

وہ میرے سوال کے جواب میں سوچ سوچ کر اپنے تحفظات اور مطالبات مجھے نوٹ کرانے لگی۔ جب اس کی فرمائشی فہرست مکمل ہوگئی تو میں نے کہا۔

''اب یہ تو طے ہے کہ جو کیس خلع کے لئے عدالت میں آپ کی طرف سے دائر کیا گیا تھا' اسے ہم واپس لے رہے ہیں؟''

''ظاہر ہے' اس ایگری منٹ کے بعد کیس چلنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے......'' میں نے کہا۔ ''کل صبح آپ عدالت میں آ کر مجھ سے ملیں۔ معمولی سی قانونی کارروائی کے بعد ہم اس کیس کو واپس لے لیں گے۔''

''اگر یہ کیس ایگری منٹ کی تیاری اور دستخط وغیرہ بعد واپس لیا جائے تو کیسا رہے گا بیگ صاحب؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''چاہیں تو اس ایگری منٹ کے ساتھ ہی آپ ہم سے ایک راضی نامہ بھی لکھوا لیں' جسے عدالت میں پیش کر کے کیس کو خارج کروایا جا سکتا ہے۔''

''یہ آپ نے بڑی عقل مندی کی بات کی ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔''

وہ ننھے بچوں کی طرح خوش ہوگئی۔

میں سمجھ رہا تھا کہ اس نے ایگری منٹ سے پہلے کیس ڈس مس نہ کرنے کی بات کیوں کی تھی۔ اسے یہ اندیشہ رہا ہوگا کہ کہیں کیس خارج ہوتے ہی رئیس شاہ اپنے وعدوں اور دعوؤں سے پھر نہ جائے اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اسے مجھ پر بھروسہ نہ ہو۔ کہیں وہ یہ سمجھتی ہو کہ میں رئیس شاہ کے ساتھ مل کر اسے چکر دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بہرحال' اس کا مشورہ یا تجویز جو بھی سمجھ لیں مبنی بر دانش مندی تھی۔

میں نے سلطانہ کو دو روز بعد اپنے پاس آنے کا کہہ کر رخصت کر دیا۔

اسی رات میں نے رئیس شاہ کو فون کر کے مبارکباد دے دی۔ وہ اپنے ایک عقیدت مند کے پاس پی ای سی ایچ سوسائٹی میں قیام پذیر تھا۔ اس نے میرا بے حد شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''بیگ صاحب! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ میرے لئے تو یہ ایک احسان کی حیثیت رکھتا ہے' لیکن آپ کے نامہ اعمال میں یہ کارنامہ ایک نیکی کی حیثیت سے درج ہوگا...... یقیناً آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے۔''

''کام چھوٹا ہو یا بڑا' اطمینان بخش بات یہ ہے کہ ہوگیا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ خوش تو بہت ہو رہے ہیں' لیکن ذرا سلطانہ کی شرائط بھی تو سن لیں' ہوسکتا ہے' یہ فہرست سماعت فرمانے کے بعد آپ کے کانوں میں سے دھواں خارج ہونے لگے' ریلوے کے کسی انجن کے مانند......؟''

''بیگ صاحب! آپ بھی بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔'' وہ ایک کھوکھلا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''ایک طرف خوشی کی نوید سناتے ہیں اور دوسری جانب ڈراتے بھی ہیں۔''

''تو میں بولنا شروع کروں......؟'

''جی ارشاد......''

میں نے سلطانہ کی پیش کردہ شرائط اور مطالبات ایک ایک کر کے رئیس شاہ کے گوش گزار کرنا شروع کر دیئے۔ چھوٹی بڑی جکڑ بندیوں کے ساتھ جو سب سے سخت شرط عائد کی گئی تھی اسے سن کر رئیس شاہ نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور مایوسی بھرے انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے بیگ صاحب! گھر کو ٹوٹنے سے بچانا ہے تو یہ قربانی تو دینا ہی ہوگی۔''

وہ کڑی شرط کچھ اس طرح تھی کہ رئیس شاہ' روبی سے قطع تعلق کر لے گا اور اس کے ساتھ کسی بھی نوعیت کا کوئی بزنس نہیں کرے گا' وغیرہ وغیرہ......

میں نے کہا۔ ''شاہ جی! دو دن کے بعد آپ کو میرے آفس آنا ہے' اس معاہدے پر سائن کرنے کے لئے۔ میں نے سلطانہ کو بھی اسی روز بلایا ہے۔ اس ایگری منٹ کی تکمیل کے بعد ہی وہ اللہ کی بندی خلع کا دائر شدہ کیس واپس لے گی۔''

''او کے...... میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''لیکن آپ اکیلے نہیں آئیں گے شاہ جی!''

"پھر......؟" اس کے سوال میں الجھن در آئی۔

"اپنے ساتھ روبی کو بھی لے کر آئیں گے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"وہ...... وہ کس لئے......؟" اس کی الجھن دو چند ہوگئی۔

"گواہی کے لئے......"

"کیسی گواہی بیگ صاحب؟"

"جو تحریری معاہدہ آپ اور سلطانہ سائن کریں گے اس میں دو گواہوں کے دستخط بھی لازمی ہیں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ایک گواہ سلطانہ اپنے ساتھ لے کر آئے گی اور ایک گواہ آپ...... یعنی روبی کو۔ اب آپ اس کام کے لئے روبی کو کس طرح تیار کرتے ہیں، یہ آپ کا کام ہے......"

"اسے تو میں کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لوں گا بیگ صاحب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "وہ میرے تازہ ترین حالات سے پوری طرح باخبر ہے۔ وہ میری سچی خیر خواہ اور عقیدت مند ہے۔ میری ازدواجی زندگی کی سلامتی کے لئے وہ اپنے تعلق کی قربانی پیش کر دے گی، لیکن یہ تو بتائیں کہ سلطانہ اپنے ساتھ کس گواہ کو لے کر آ رہی ہے؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"اگر وہ ریاست علی کو لے آئی تو......؟" اس نے ازراہ مذاق پوچھا۔

"اس کا کوئی امکان نہیں شاہ جی!" میں نے بڑے وثوق سے کہا۔ "میں نے ریاست علی کا اصلی چہرہ اس پر عیاں کر دیا ہے۔ اب وہ اس فراڈ جوہری سے شدید نفرت کرنے لگی ہے۔"

پھر میں نے رئیس شاہ کو وہ واقعہ بھی سنایا جب میں لالوکھیت کی صرافہ مارکیٹ میں ریاست کی دکان پر زمرد فروخت کرنے گیا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ سلطانہ کو عقل آ گئی ہے۔" وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "اب آگے بھی انشاء اللہ! سب ٹھیک ہی رہے گا۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے پر وثوق انداز میں تائید کی۔

وہ بولا۔ "بیگ صاحب! میں نے آپ کو اپنا گرو مان لیا ہے۔ آپ بڑے باتدبیر وکیل ہیں۔ بگڑی کو بنانے کا ہنر کوئی آپ سے سیکھے۔"

"شاہ جی! آپ کیوں مجھے گناہ گار کر رہے ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "سب کی

بگڑی بنانے والی تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ میں نے تو آپ کے مختار یعنی اٹارنی کا کردار ادا کیا ہے، آپ نے اس معاملے کو سیٹل کرنے کے لئے مجھے "پاور آف اٹارنی" دیا تھا یا نہیں؟"

"کی نا پھر گروؤں والی بات......" وہ چہک کر بولا۔

ہمارے درمیان الوداعی کلمات کے بعد گفتگو کا سلسلہ سمٹ گیا۔

***

آئندہ روز میں گھر پہنچا تو فون کی گھنٹی نے میرا استقبال کیا۔

میں نے بریف کیس کو ایک صوفے پر رکھا اور ریسیور کو اٹھا کر کان سے لگا لیا، پھر کہا۔

"ہیلو......!"

"ہیلو بیگ صاحب!" دوسری طرف سے رئیس شاہ کی چہکتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ "آپ کیسے ہیں؟"

"اللہ کا کرم ہے۔ الحمدللہ میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔" میں نے جواب دیا، پھر پوچھا۔ "خیریت...... اس وقت آپ نے کیسے یاد فرمایا شاہ جی، آواز سے تو بہت خوش لگ رہے ہیں۔"

"آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔" وہ تصدیقی انداز میں بولا۔ "میں اس وقت واقعی بہت خوش ہوں۔"

"اپنی خوشی کے بارے میں ابھی فون پر بتائیں گے یا ایگری منٹ والے دن؟"

"ابھی اور اسی وقت۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "اور اب کسی ایگری منٹ شیگری منٹ کی کوئی ضرورت نہیں ہے بیگ صاحب!"

"کیا مطلب......؟" میں بری طرح چونک گیا۔

چشم زدن میں میرا ذہن رئیس شاہ کے اس جذباتی اظہار کی طرف چلا گیا تھا، جب اس نے میرے سامنے بیٹھ کر اپنی دولت اور اجرتی قاتلوں کا ذکر کیا تھا۔ اس کی طرف سے ایسی کسی نامعقولیت کی توقع تو نہیں تھی، لیکن انسانی سوچ پر پہرا تو نہیں بٹھایا جا سکتا نا۔ دماغ کو جیسے ہی کلیو ملا، وہ اپنی مرضی کی سمت میں چل پڑا، لیکن اللہ کا شکر کہ رئیس شاہ نے میری توقع کا خون نہیں کیا تھا، میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔

"میں اس وقت اپنے گلشن اقبال والے بنگلے سے آپ کو فون کر رہا ہوں۔ سلطانہ بھی میرے ساتھ ہے اور...... یہ الفاظ اسی کے ہیں کہ اب ہمیں ایک چھت کے نیچے زندگی گزارنے کے لئے کسی تحریری معاہدے کی ضرورت نہیں ہے......"

"تو گویا آپ اپنے گھر واپس آ گئے ہیں؟" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

"یہ جی...... بالکل یہی بات ہے۔"

"یہ انقلاب کس طرح برپا ہوا؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"یہ سب انہی بزرگ کا کمال ہے۔" رئیس شاہ نے بتایا۔ "جن کی صحبت میں، میں نے تربیت حاصل کی تھی، میں شیخوپورہ والی روحانی ہستی کا ذکر کر رہا ہوں۔"

"لیکن آپ نے تو مجھے بتایا تھا کہ...... میرا دماغ الجھ کر رہ گیا۔ "ان بزرگ کا وصال ہو چکا ہے؟"

"میں نے آپ سے غلط نہیں کہا تھا بیگ صاحب!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "لیکن گزشتہ رات وہی بزرگ سلطانہ کے خواب میں آئے تھے اور انہوں نے اسے زندگی کے اسرار رموز کی باریکیوں کے بارے میں بہت سی اہم باتیں سمجھائی ہیں۔ جب صبح یہ بیدار ہوئی تو اس کی کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ یہ آج کا پورا دن مجھے ممکنہ جگہوں پر تلاش کرتی رہی۔ یہ چونکہ میرے کثیر عقیدت مندوں سے واقف بھی ہے لہٰذا اس نے بالآخر مجھے ڈھونڈ نکالا۔ یہ زندگی کی حقیقت کو پا گئی ہے اور اسی کے پرزور اصرار پر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایگریمنٹ کا خیال دل سے نکال دیں اور ہمارے حق میں دعا کریں کہ آئندہ کبھی ایسی صورت حال سے سامنا نہ ہوا۔" وہ لمحے کے لئے رکا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"انشاء اللہ! جلد ملاقات ہوگی۔"

"انشاء اللہ......" میں اتنا ہی کہہ سکا۔

جب میں نے ریسیور کریڈل کیا تو دو بڑی حقیقتیں میرے ذہن میں چمک رہی تھیں۔ اول، جو لوگ اللہ کے سچے دوست ہوتے ہیں انہیں موت نہیں آتی۔ دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی وہ اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔ دوم، جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی......!

***

ضرورت مند

آج اس کیس کی پہلی باقاعدہ ساعت تھی۔ عدالت کا کمرہ پوری طرح بھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سوائے ایک کرسی کے ہر کرسی پر کوئی نہ کوئی موجود تھا اور وہ خالی کرسی تھی، اس شخصیت کی جو اس کیس میں منصف کا کردار ادا کر رہا تھا۔

چند لمحات کے بعد کرسی انصاف بھی خالی نہ رہی۔

جج نے اپنی مسند پر براجمان ہونے کے بعد عدالت کے کمرے میں، ایک جانب سے دوسری طرف تک نگاہ دوڑائی اور تمام متعلقہ افراد کو موجود پا کر اثبات میں گردن ہلا دی، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔

پہلے مرحلے پر جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ میرے موکل اور کیس کے ملزم نے نہایت اطمینان کے ساتھ صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا، پھر باقاعدہ جرح کا آغاز ہو گیا۔ جج کی اجازت حاصل کر کے وکیل استغاثہ ملزم والے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔

استغاثہ کی جانب سے میرے موکل ساجد علی پر ایک طرح دار عورت کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ بنیادی اور سنگین الزام تو یہی تھا، علاوہ ازیں بھی چند چھوٹے موٹے معاملات اس کے ساتھ ہی نتھی تھے۔ جب عدالت میں اس کیس کا چالان پیش کیا گیا تھا تو میں نے اپنے موکل کی ضمانت کرانے کی بھرپور کوشش کی تھی، لیکن مجھے اس کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت تقریباً ناممکن ہی ہوتی ہے اور وہ بھی پہلی پیشی پر تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وکیل استغاثہ لب کشائی سے پہلے چند سیکنڈ تک ملزم کو گھورتا رہا۔ ایک نفسیاتی ردعمل کے

طور پر میرے موکل نے نگاہ جھکا دی۔ ملزم کی اس حرکت کو وکیل استغاثہ نے اس کی کمزوری جانا اور خاصے جارحانہ لہجے میں بولا۔

''گردن اٹھا کر اور نظر ملا کر میری طرف دیکھو۔''

میرے موکل نے خفیف سی بوکھلاہٹ کے بعد وکیل استغاثہ کی فرمائش پوری کر دی۔ وکیل استغاثہ نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا تم کوئی نشہ وغیرہ کرتے ہو؟''

''نہیں جناب، میں نے ایسا کام اپنی زندگی میں کبھی نہیں کیا۔'' ملزم نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''البتہ دن میں پانچ چھ سگریٹ ضرور پی لیتا ہوں۔''

''کون سی سگریٹ؟'' وکیل استغاثہ نے چڑھائی جاری رکھی۔

ملزم نے حیرت بھرے انداز میں پلکیں جھپکائیں اور بولا۔ ''جی کیا مطلب......؟''

''بھری ہوئی یا سادہ سگریٹ؟'' وکیل استغاثہ نے وضاحت کر دی۔

''سادہ نہیں جناب، میں فلٹر والی سگریٹ پیتا ہوں۔'' ملزم کا جواب معصومیت سے معمور تھا۔

''میں نے فلٹر ملٹر کا نہیں پوچھا۔'' وکیل استغاثہ نے درشت لہجے میں کہا۔ ''بھری ہوئی اور سادہ سگریٹ کا فرق تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔''

''جناب!'' ملزم نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ''میری نظر میں تو ہر سگریٹ بھری ہوئی ہی ہوتی ہے۔ اگر کمپنی سگریٹ میں تمباکو نہیں بھرے گی تو اسے خریدے گا کون؟''

''تم بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہو۔'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تمہاری آنکھوں میں تیرتی مخصوص سرخی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ تم کوئی تیز نشہ کرتے ہو۔''

میں کافی دیر سے خاموش کھڑا وکیل استغاثہ کی موشگافیاں سماعت کر رہا تھا۔ جب وہ حد سے تجاوز کرتا نظر آیا تو میں چپ نہ رہ سکا اور تیز آواز میں کہا۔

''آبجیکشن یور آنر......!''

جج نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟''

''جناب عالی! وکیل مخالف میرے موکل کو خوامخواہ ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اگر ملزم کی آنکھوں میں کسی قسم کی سرخی نظر آ رہی ہے تو اس کا یہ مطلب کیسے ہو گیا کہ وہ بھری ہوئی سگریٹ پیتا ہے یا کسی اور نوعیت کا نشہ کرتا ہے اور پھر......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''زیرِ سماعت کیس ایک قتل اور ڈکیتی سے متعلق ہے۔ اس میں ملزم کی آنکھوں کی لالی کا کیا کام۔ وکیل استغاثہ اس نوعیت کی جرح سے معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں...... اور کچھ نہیں۔''

میرے اس وار پر وکیل استغاثہ سلگ اٹھا اور براہ راست مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''تو آپ ملزم کی آنکھوں میں پائی جانے والی سرخی کے بارے میں کیا کہتے ہیں......؟''

''یہ ضروری نہیں ہے کہ نشے بازی ہی کا نتیجہ ہو......'' میں نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔ ''اس کی اور بھی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔''

''دیگر وجوہات آپ کی نظر میں کون سی ہو سکتی ہیں؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

''میرے فاضل دوست!'' میں نے اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر کوئی شخص رات کو ضروری نیند نہ لے سکے یا سرے سے اسے سونے کا موقع ہی نہ ملے تو صبح اس کی آنکھوں میں یقیناً سرخی دیکھنے کو ملے گی' اگر کسی شخص کو کچی نیند سے جگا دیا جائے تو بھی ملی جلی صورت حال کا سامنا ہو گا۔ علاوہ ازیں آشوب چشم اور آنکھوں کی دیگر بیماریاں بھی اسی نوعیت کے اثرات نمایاں کرتی ہیں۔ میں آپ کی اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ نشہ کرنے والے افراد خصوصاً چرس کے رسیا افراد کی آنکھوں کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے لیکن......'' میں بولتے بولتے ایک دم رکا' پھر بڑے ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن ان تمام تر وجوہات کا میرے موکل کی موجودہ حالت پر اطلاق نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں پائی جانے والی سرخی کا کوئی اور ہی سبب ہے...... ایک جینوئن ریزن!''

''میرے موکل کی آنکھوں میں پائی جانے والی سرخی پیدائشی ہے۔'' میں نے جواباً

ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔'' کیونکہ وہ نہ صرف یہ کہ جیمنی ہے بلکہ اس کے طالع پیدائش میں مرکری بھی پڑا ہوا ہے۔''

''یہ جیمنی اور مرکری وغیرہ تو علم نجوم کی اصطلاحات ہیں۔'' وکیل استغاثہ عجیب سے لہجے میں بولا۔'' زیر سماعت کیس کے ساتھ ان کا کیا تعلق ہے؟''

''بڑا گہرا تعلق ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔'' لیکن میں اس کی وضاحت بعد میں کروں گا' پہلے آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ جیمنی اور ورگو افراد کی آنکھوں میں قدرتی طور پر سرخی پائی جاتی ہے اور اگر مرکری بھی طالع پیدائش میں ہو تو یہ سونے پہ سہاگہ والی بات ہو جاتی ہے۔ اب میں آتا ہوں آپ کے سوال کے جواب کی طرف......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک طائرانہ نگاہ حاضرین عدالت پر ڈالی' پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ وکیل استغاثہ ہیں۔ یقیناً آپ کو یہ بات ازبر ہو گی کہ زیر سماعت کیس کا وقوعہ کب پیش آیا تھا؟''

''بارہ دسمبر......'' وہ ترت بولا۔'' یہ بھی کوئی بھولنے والی تاریخ ہے۔''

''اور آج کیا تاریخ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پانچ اپریل......''

''ہم عید الفطر کون سی اسلامی تاریخ کو مناتے ہیں؟''

''یکم شوال۔''

''اور حج بیت اللہ کب ادا کیا جاتا ہے؟''

''نو ذی الحجہ......'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سوال کیا۔'' ان اسلامی اور غیر اسلامی تاریخوں کا حساب ہم کس چیز کی مدد سے لگاتے ہیں۔ اس کائنات میں موجود کون ہمیں بتاتا ہے کہ آج کون سی اسلامی تاریخ اور کون سی غیر اسلامی؟''

''ظاہر ہے' ہم چاند کی مدد سے اسلامی تاریخوں کا تعین کرتے ہیں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔'' اور سورج کی حرکات عیسوی تاریخوں کا حساب بتاتی ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے' سن اینڈ مون؟'' میں نے تصدیق طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو گھورا۔

''جی ہاں......'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔'' چاند اور سورج کو عربی میں قمر و شمس اور انگریزی میں مون اینڈ سن ہی کہا جاتا ہے۔''

''اتنی اہم معلومات بہم پہنچانے پر میں تہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں میرے فاضل دوست!'' میں نے خوش اخلاقی سے کہا' پھر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس سے پوچھ لیا۔'' تو آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری روزمرہ زندگی کا ہر معاملہ تاریخوں کا محتاج ہے اور یہ تاریخیں ہم سن اینڈ مون کی مخصوص فلکیاتی حرکات سے اخذ کر کے ہجری اور عیسوی کیلنڈر تیار کرتے ہیں۔ زیر سماعت کیس میں بھی تاریخوں کا ایک نہایت ہی اہم کردار ہے مثلاً......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے' کافی دیر کے بعد ایک گہری سانس لی' پھر قدرے جارحانہ انداز میں کہا۔

''جیسے مقتولہ نورین کو ایک خاص تاریخ کو قتل کیا گیا' ملزم کی گرفتاری' عدالت میں پیشی' چالان' کیس کی باقاعدہ سماعت اور اس کیس کے فیصلے کے لئے بھی کوئی نہ کوئی تاریخ مخصوص ہو گی' لہٰذا یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ زیر سماعت کیس کے ساتھ مون اور سن کا بڑا گہرا تعلق ہے۔''

''میں نے اعتراض علم نجوم پر کیا تھا۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔'' شمس و قمر تو اس کائنات کے رخشندہ ستون ہیں۔ ان کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔''

''میرے بھائی! کیا عجیب منطق ہے آپ کی۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ 'سورج' چاند اور ستاروں سے تو بھرپور استفادہ کرنے کو تیار ہیں اور اسی فیملی کے دیگر ممبران عطارد' زہرہ' مریخ' مشتری' زحل...... وغیرہ کے اثرات سے انکاری ہیں۔''

اس سے پہلے کہ ہماری بحث طوالت کا کوئی نیا ریکارڈ قائم کرنے میں مصروف ہو جاتی' جج نے بڑی خوبصورت مداخلت کر کے اس سلسلے کو روک دیا اور میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''وکیل صاحب! ملزم کی آنکھوں میں تیرتی سرخی کے حوالے سے اگر آپ کی تحقیق کو تشفی حاصل ہو گئی ہو تو جرح کے سلسلے کو آگے بڑھائیں۔''

وکیل استغاثہ نے خفت بھری نظر سے مجھے دیکھا' پھر جلدی سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم ساجد کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میری وضاحت کے باعث اس کی جو بکی ہوئی تھی'

اس کا سارا غصہ اس نے میرے موکل پر اتارا۔

''تمہاری ذہانت اور چالاکی بڑی اثر پذیر ہے۔'' وہ ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔''تم اپنی جادو اثر شخصیت سے کام لے کر شکار کرتے ہو۔تمہارے مزاج کی سادگی اور چہرے کی معصومیت کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے بھی ذہن میں یہ خیال نہیں آتا کہ تم کتنے خطرناک کھلاڑی ہو۔'' اس نے لمحاتی توقف کے بعد بڑے جارحانہ انداز میں اضافہ کیا۔

''بتاؤ...... اس سے پہلے تم نے کتنی وارداتیں کی ہیں۔مسز نورین تمہارا پہلا شکار تھی یا......؟''

''میں نے نہ تو اس سے پہلے ایسی کوئی حرکت کی ہے اور نہ ہی مسز نورین کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ ہے۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔''آپ خوامخواہ مجھے پریشان کررہے ہیں۔''

''تم کہیں سے پریشان لگتے تو نہیں ہو۔'' وکیل استغاثہ بڑے مضحکہ خیز انداز میں میرے موکل کو سرتاپا دیکھتے ہوئے بولا۔''یہی محسوس ہوتا ہے کہ تم بڑے ٹھنڈے مزاج کے مجرم ہو......ایک خطرناک مجرم۔''

''آبجیکشن یور آنر!'' میں نے ایک مرتبہ پھر نعرۂ احتجاج بلند کیا۔

جج نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔

میں نے خاصے دھواں دھار انداز میں کہا۔''جناب عالی! استغاثہ کی طرف سے میرے موکل پر جو الزامات لگائے گئے ہیں' ان میں سے ابھی تک کوئی بھی ثابت نہیں ہوسکا۔قانون کی نظر میں تاحال میرا موکل ایک ملزم ہے۔اسے مجرم کہنا سراسر زیادتی ہوگی لہٰذا......'' میں نے تھوڑی دیر کو رک کر طنزیہ انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لہٰذا...... استغاثہ کے نمائندے' میرے فاضل دوست کی جانب سے ملزم کے لئے ''خطرناک مجرم'' کے الفاظ کا استعمال انصاف کے اصولوں کے منافی ہے۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی' جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس نے میرے اعتراض کو درست تسلیم کرلیا ہے' پھر اس نے وکیل استغاثہ کو یہ ہدایات دے کر میرے اندازے کی تصدیق کردی۔

''وکیل صاحب! آپ اپنے سوال میں سے لفظ ''مجرم'' کو خارج کرکے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھانے کا عمل جاری رکھیں۔''

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ میرے موکل پر ایک خوبصورت عورت مسز نورین کو قتل کرنے کا الزام تھا۔اس کے علاوہ استغاثہ نے مبلغ پچاس ہزار روپے کی چوری بھی اس کے کھاتے میں چڑھا رکھی تھی' جبکہ حقیقت یہ تھی کہ نہ تو میرے موکل نے کسی کو قتل کیا تھا اور نہ ہی وہ کسی چوری یا ڈکیتی میں ملوث تھا۔اس کی قسمت بری تھی کہ وہ اس کیس میں گردن تک دھنس چکا تھا۔

وکیل استغاثہ' جج کی ہدایت سن کر تھوڑا خفیف ہوا' پھر مجھ پر ایک ناپسندیدہ نگاہ ڈالنے کے بعد وہ دوبارہ اس کیس کے ملزم اور میرے موکل ساجد علی کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ مقتولہ نورین کو تم کافی عرصے سے جانتے تھے؟''

''جی ہاں...... یہ درست ہے۔''

''کتنے عرصے سے......؟''

''پچھلے چھ ماہ سے......'' ملزم نے جواب دیا۔

''پچھلے چھ ماہ سے۔'' اس کی مراد یقیناً وقوعہ سے چھ ماہ پہلے کے عرصے سے تھی۔وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''ان چھ ماہ میں تم کتنی مرتبہ اسے ملنے اس کے فلیٹ پر گئے تھے؟''

مقتولہ نورین ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں چوتھے فلور پر رہائش پذیر تھی اور اس کے قتل والی واردات بھی اسی فلیٹ میں پیش آئی تھی۔ملزم نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں بتایا۔

''میں اس عرصہ کے دوران میں دس سے زیادہ مرتبہ اس کے فلیٹ پر گیا تھا۔''

''مذکورہ فلیٹ میں مقتولہ کے علاوہ اور کتنے افراد رہائش پذیر تھے؟''

''کوئی بھی نہیں......''

''گویا مقتولہ اپنے فلیٹ میں اکیلی رہتی تھی؟''

''جی ہاں۔'' ملزم نے اثبات میں جواب دیا۔''اس کا شوہر روزگار کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا ہے...... بلکہ گیا ہوا تھا۔''

"گیا ہوا تھا..... کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب وہ واپس پاکستان آ چکا ہے۔"

ملزم نے پُراعتماد لہجے میں بتایا۔ "اس واقعے نے اسے واپس آنے پر مجبور کر دیا تھا اور....." اس نے لمحاتی توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک گہری نگاہ ڈالی' پھر ایک جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نجیب غوری اس وقت بھی عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔"

"تو گویا تم مقتولہ کے شوہر کو بھی اچھی طرح پہچانتے ہو؟"

ملزم نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"کیا تم ان لوگوں کے رشتے دار ہو؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

"نہیں....." ملزم قطعی لہجے میں بولا۔

"فیملی فرینڈ ہو؟"

"جی نہیں....."

"مقتولہ کے شوہر کے ساتھ تمہاری دوستی وغیرہ ہوگی.....؟" وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "جبھی تم چھ ماہ میں دس سے زیادہ مرتبہ مقتولہ کے فلیٹ پر گئے تھے.....؟"

"جی نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔" ملزم نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔ "دوستی تو بہت دور کی بات ہے' میں تو مسز نورین کے شوہر سے ایک بار بھی نہیں ملا تھا' بلکہ اسے تو پہلی مرتبہ میں نے یہیں عدالت میں دیکھا ہے یا پھر اس سے پہلے مقتولہ کے فلیٹ میں اس کی ایک بڑے سائز کی تصویر لگی دیکھی تھی' اسی لئے جب میں نے اسے عدالت میں دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔"

ملزم کی وضاحت ختم ہوئی تو وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔ "تمہاری نہ تو مقتولہ کے شوہر سے دوستی تھی' نہ تم ان کے رشتے دار اور نہ یہ کوئی اور تعلق ناتا تھا' پھر تم گاہے بہ گاہے مقتولہ کے گھر کے چکر کیوں کاٹتے رہتے تھے' جبکہ تم اچھی طرح یہ بھی جانتے تھے کہ مقتولہ کا شوہر گھر پر موجود نہیں تھا۔"

"پھر کس کی مرضی سے وہاں جاتے تھے؟" وکیل استغاثہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"تمہیں اس کام کے لئے کون مجبور کرتا تھا.....؟"

"مقتولہ نورین اپنی ضرورت کے پیش نظر خود مجھے بلایا کرتی تھی۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتی تھی.....؟"

"آپ کہہ سکتے ہیں....." ملزم جزبز ہوتے ہوئے بولا۔

"کہہ سکتے ہیں..... کیا مطلب؟" کیا تمہیں یقین نہیں کہ مقتولہ تمہیں بے حد پسند کرتی تھی' اسی لئے اپنی ضرورت کے وقت وہ تمہیں فلیٹ پر بلا لیا کرتی تھی؟"

"آپ بات کو کسی اور رخ پر لے جا رہے ہیں وکیل صاحب!" ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرے کہنے کا وہ مطلب نہیں تھا جو آپ عدالت کے سامنے اجاگر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"تم اپنے مطلب کی وضاحت کرو۔" جج نے براہ راست ملزم کو حکم دیا۔

"جناب عالی!" ملزم کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "پہلی بات تو یہ کہ مقتولہ مجھے نہیں بلکہ میرے کام کو پسند کرتی تھی' دوسری بات یہ کہ اس نے ایک مرتبہ بھی مجھے خوامخواہ اپنے فلیٹ پر نہیں بلایا۔ اسے جب بھی میری ضرورت پیش آئی' وہ مجھے فون کر دیتی تھی اور میں اپنی سہولت کے مطابق آ کر اس کا کام کر دیا کرتا تھا۔ اپنی محنت کا معاوضہ وصول کر کے میں واپس چلا جاتا تھا' لیکن وکیل استغاثہ....."

وہ لمحاتی توقف کر کے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پلکیں جھپکا کر اسے تسلی دی کہ وہ بالکل ٹھیک جا رہا ہے۔ وہ اپنی وضاحت کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"وکیل استغاثہ کی جرح سے بالکل ایک منفی تاثر ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ اس سے نہ صرف میرا بلکہ مرحومہ کا کردار بھی شک کی لپیٹ میں آ رہا ہے' جبکہ حقیقت صرف اتنی سی ہے کہ مقتولہ میرے کام سے مطمئن اور خوش تھی' اسی لئے جب بھی فلیٹ میں لکڑی کا کوئی کام نکلتا' وہ مجھی سے کراتی تھی۔"

میرا موکل پیشے کے اعتبار سے کارپینٹر (بڑھئی) تھا اور اپنے کام میں اس کے تجربے اور مہارت کو دشمن بھی تسلیم کرتے تھے۔ اگر مقتولہ اس کی پیشہ ورانہ صلاحیت اور کارکردگی سے مطمئن تھی تو اس میں حیرت یا اچنبھے والی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی' مگر وکیل استغاثہ میرے موکل کو نروس اور پریشان کرنے کے لئے اس معاملے کو خوامخواہ خطرناک انداز میں طول دے

رہا تھا۔ میں اپنے موکل کی اس بات سے پوری طرح متفق تھا کہ وکیل استغاثہ کے تیکھے اور ٹیڑھے سوالات مقتولہ اور ملزم کے مابین غیر اخلاقی تعلق کی جانب اشارہ کرتے دکھائی دیتے تھے۔ وکیل استغاثہ کو تو اتنا بھی لحاظ نہیں تھا کہ مقتولہ کا شوہر بھی عدالت کے کمرے میں موجود تھا۔ اس کی موجودگی میں ایسے بے ہودہ استفسارات کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا تھا۔

میں اگر چاہتا تو کسی بھی موقع پر ''آبجیکشن یور آنر'' کا نعرہ لگا کر میدان جنگ میں اتر سکتا تھا۔ وکیل استغاثہ اب تک اعتراض کے بہت مواقع فراہم کر چکا تھا' لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ میرا موکل بڑے خوب صورت انداز میں اپنا دفاع جاری رکھے ہوئے تھا' میں اس کی کارکردگی سے خاصا مطمئن تھا' اسی لئے خاموشی سے تماشا دیکھ رہا تھا۔

''تو وقوعہ کے روز بھی تم مقتولہ کے بلانے پر لکڑی کا کوئی کام کرنے اس کے فلیٹ پر پہنچے تھے......؟'' وکیل استغاثہ نے تیز نظر سے ملزم کو گھورا۔

''جی ہاں...... اسے ایک صوفے کی مرمت کرانا تھی۔'' ملزم نے جواب دیا۔

''کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ مقتولہ کے گھر بار بار جانے سے تم وہاں کی تفصیلات سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ ڈرائنگ روم' بیڈ روم' کچن' کامن روم اور دیگر مقامات کی کیا پوزیشن ہے...... کون سی چیز کہاں پائی جاتی ہے؟''

''میں اس حقیقت سے انکار نہیں کروں گا۔'' ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''کیونکہ میں نے اس دوران میں مقتولہ کے فلیٹ کے مختلف حصوں میں کام کیا تھا۔ مقتولہ نے اپنے کچن میں مجھ سے ایک دیوار گیر کیبنٹ بنوائی تھی۔ گیلری میں کپڑے سکھانے کے لئے کھونٹیاں لگوائی تھیں' بیڈ روم میں موجود کپڑوں کی بڑی الماری کا لاک تبدیل کروایا تھا' ڈرائنگ روم میں رکھے صوفوں کی مرمت کرائی تھی۔ چھوٹے موٹے کام اس کے علاوہ ہیں......''

''وقوعہ کے روز تم کس کام کی غرض سے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچے تھے؟'' استغاثہ نے سوال کیا۔

''میں تھوڑی دیر پہلے اس کا ذکر کر چکا ہوں۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس روز مقتولہ نے ایک صوفے کی مرمت کے لئے مجھے اپنے فلیٹ پر بلایا تھا۔ مذکورہ

صوفے کا اسٹر کئی جگہ سے نکل رہا تھا' لہٰذا اس کی مرمت ضروری ہو گئی تھی۔''

وکیل استغاثہ نے فوراً زاویہ سوالات تبدیل کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تم جب بھی کسی کام کی غرض سے مقتولہ کے فلیٹ پر جاتے تھے تو وہ تم پر خاصی مہربان ہوا کرتی تھی۔''

''جی...... میں سمجھا نہیں۔'' ملزم نے حیرت بھری نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔

''آپ کی اس بات کا مطلب کیا ہے؟''

''مطلب یہ کہ......'' وکیل استغاثہ بڑے مکارانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''مقتولہ تمہیں تمہارے کام کا معاوضہ دینے کے علاوہ بھی نوازتی رہتی تھی؟''

''ایسی کوئی بات نہیں جناب!'' ملزم نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں۔ کام شروع کرنے سے پہلے معاوضہ طے کر لیتا ہوں اور کام ختم کر کے اپنی اجرت لے کر واپس آ جاتا ہوں۔ اللہ اللہ' خیر سلا......''

''کیا مقتولہ کے ساتھ بھی تمہارا یہی رویہ تھا؟''

''جی ہاں' بالکل......''

''میں اس بات کو ثابت کر سکتا ہوں کو مقتولہ تمہیں عام کاریگر کی بہ نسبت زیادہ اہمیت دیتی تھی۔'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ ''وہ تمہارے محنتانے کے علاوہ بھی تمہارا خیال رکھتی تھی' جو اس امر کی دلیل ہے کہ وہ تم پر خصوصی توجہ دیتی تھی لیکن......'' وہ بولتے بولتے اچانک رکا' جج کی جانب معنی خیز نظر سے دیکھا' پھر اپنی بات مکمل کرنے کے لئے دوبارہ ملزم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''لیکن تم نے......'' وہ بڑے ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''تم نے اس مہربان عورت کے خلوص کا ناجائز استعمال کیا...... نہ صرف یہ کہ اس کے اعتماد کا خون کیا...... بلکہ خود اسے ہی خون میں نہلا دیا۔''

''یہ جھوٹ ہے...... مجھ پر الزام ہے۔'' ملزم نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ مقتولہ کے قتل سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔''

''آبجیکشن یور آنر!'' میں نے مداخلت ضروری جانتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ ''اس وقت عدالت میں نورین مرڈر کیس زیر سماعت ہے' لیکن میرے فاضل دوست متعلقہ سوالات کو پس پشت ڈال کر سارا زور وکالت اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ مقتولہ کسی خاص

زاویے سے ملزم پر مہربان تھی اور ابھی انہوں نے اس حوالے سے ثبوت فراہم کرنے کی بات بھی کی ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وکیل استغاثہ کو وہ ثبوت سامنے لانے کا موقع فراہم کیا جائے' جو اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ مقتولہ اور ملزم کے بیچ کام کے علاوہ بھی کوئی معاملہ چل رہا تھا' کیونکہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ جب تک......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اپنی بات کو مدلل انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جب تک میرے فاضل دوست اس حوالے سے اپنے دل اور دماغ کا سارا غبار نکال نہیں لیں گے' ان سے ٹو دی پوائنٹ کسی معقول جرح کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ بار بار جس انداز میں مقتولہ اور ملزم کے تعلقات کا ذکر کر رہے ہیں' اس سے معزز عدالت اور یہاں پر موجود تمام سامعین کے ذہن میں مختلف نوعیت کے خدشات اور شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں' لہٰذا اس ایشو کو ایڈریس کرنے کے بعد آگے بڑھا جائے تو زیادہ اچھا ہوگا۔''

جج نے گہری سنجیدگی سے میری بات سنی اور مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے وکیل استغاثہ سے کہا۔ کہنے کا انداز ہدایات دینے والا تھا۔

''وکیل صاحب! آپ ڈیفنس کے اعتراض کے جواب میں کیا کہنا چاہیں گے؟''

وکیل استغاثہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا' معاندانہ نظر سے مجھے گھورا' پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''جناب عالی! میں اس سلسلے میں ذرا وضاحت سے بات کرنا چاہوں گا۔''

''اجازت ہے۔'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جناب عالی! ملزم شاندار شخصیت کا مالک ہے۔ مقتولہ اس پر خصوصی توجہ دیا کرتی تھی۔ یہ جب بھی کسی کام کی غرض سے مقتولہ کے فلیٹ پر جاتا' وہ اس کی ٹھیک ٹھاک خاطر تواضع کرتی تھی اور یہ ایسی پیشکش کو فوراً قبول بھی کر لیا کرتا تھا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لئے تھما' پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ملزم اپنی معصوم شکل سے جتنا سیدھا نظر آتا ہے' حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس نے مقتولہ کی مہربانی اور نوازش سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دیا۔ مقتولہ اس کے ساتھ خاصی گھل مل گئی تھی اور یہ آزادانہ طور پر گھر کے ہر حصے میں جا سکتا تھا۔ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ملزم نے مقتولہ کی توجہ کے جواب میں یہ

ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ وہ بھی اسے پسند کرتا ہے' چنانچہ مقتولہ پر اس پر اندھا اعتماد کرنے لگی اور پھر وقوعہ کے روز ملزم نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا۔''

وکیل استغاثہ نے بات ختم کی تو میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اپنے فاضل دوست سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

''پرمیشن گرانٹیڈ۔'' جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی!'' میں نے اپنی بات کا آغاز جج کو مخاطب کرتے ہوئے کیا۔ ''گھر آئے ہوئے کسی بھی شخص کو چائے پانی کا پوچھنا اخلاقی اقدار کا حصہ ہے اور یہ تو عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ راج' مستری' بڑھئی' الیکٹریشن' پلمبر اور اسی طرح کے دیگر کاریگر جب کسی کے گھر کے اندر آ کر کام کرتے ہیں اور گھر کے مالک کی ان سے واقفیت بھی ہوتی ہے تو انہیں کھانے پینے کو ضرور پوچھا جاتا ہے۔ مقتولہ کا یہ عمل تو معاشرتی اقدار' ایٹی کیٹس اور مینرز وغیرہ میں شمار ہوتا ہے۔ اگر وکیل استغاثہ کے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں اور وہ مقتولہ کے ان آداب و اخلاقیات کو منفی نظر سے دیکھ کر ایک سکینڈل کا دینا چاہتے ہیں تو میں موصوف کی ذہنی کیفیت کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا......'' میں نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ کر کندھے اچکائے اور وکیل استغاثہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''وکیل صاحب! استغاثہ کی جانب سے میرے موکل پر چوری اور قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ آپ نے اب تک کی جرح میں مختلف زاویوں سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرے موکل نے اپنی پراثر شخصیت کے ذریعے مقتولہ کے دل میں جگہ بنائی اور وہ ملزم پر اندھا اعتماد کرنے لگی۔ آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ ملزم کے ذہن میں ایسا کون سا منصوبہ تھا؟''

''چوری کا منصوبہ......'' وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔ ''ملزم مقتولہ کی الماری کا صفایا کرنا چاہتا تھا......اور اس نے ایسا کر بھی دکھایا۔''

''آپ کا اشارہ ان پچاس ہزار روپے کی جانب ہے جو بقول استغاثہ' ملزم نے مقتولہ کے فلیٹ سے چرائے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''جی ہاں......آپ بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔''

"تو آپ کے خیال میں پچاس ہزار کی وہ رقم مقتولہ نے اپنی الماری میں رکھی ہوئی تھی؟" میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں...... بالکل......" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"مقتولہ اپنا کیش کپڑوں والی الماری کے اندر بنے ایک مخصوص لاک میں رکھا کرتی تھی۔ مذکورہ الماری مقتولہ کے بیڈ روم میں موجود تھی...... بلکہ اب بھی وہیں موجود ہے۔"

"آپ کو یہ بات کیسے پتا چلی کہ مقتولہ بیڈ روم والی الماری میں کیش رکھا کرتی تھی؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"پولیس کی تفتیش کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے۔"

"اور یہ کیسے پتا چلا کہ مقتولہ کے لاکر میں وقوعہ کے روز پچاس ہزار روپے کی رقم موجود تھی، جو ملزم چوری کر کے لے گیا؟" ایک بار پھر میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"اس امر کے ٹھوس ثبوت اور شواہد موجود ہیں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "وقوعہ والے دن شام میں مقتولہ نے ایک پارٹی کو پچاس ہزار روپے ادا کرنا تھے جو اسی روز دوپہر میں اس نے بینک سے نکلوائے تھے۔ اسے شام میں پیمنٹ کرنا تھی، لہٰذا اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ مقتولہ نے یہ رقم اپنی الماری کے لاکر میں رکھی ہوگی۔"

"یہ کوئی مسلمہ فارمولا نہیں کہ بینک سے رقم نکلوانے کے بعد گھریلو لاکر ہی میں رکھی جائے۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "رقم کا مالک اپنی رقم کو کہیں بھی رکھنے کا مجاز ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مقتولہ نے وہ رقم اسی پارٹی کو دے دی ہو، جس کے لئے اس نے بینک سے نکلوائی تھی۔"

"نہیں جناب...... ایسا ہرگز ممکن نہیں۔" وہ بڑی قطعیت سے بولا۔ "استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں اس شخص کا نام بھی شامل ہے۔ وہ اپنی باری پر اس بات کی گواہی دے گا کہ مقتولہ کے ساتھ اس کی ملاقات شام میں طے تھی اور اس ملاقات سے پہلے ہی سہ پہر میں مقتولہ کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔"

"آپ کا مذکورہ گواہ جب کٹہرے میں آ کر کھڑا ہوگا تو اس سے بھی بات ہو جائے گی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ فی الحال مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ میرے موکل کو یہ بات کیسے پتا چلی تھی کہ مقتولہ کی الماری کے لاکر میں پچاس ہزار روپے کی رقم موجود ہے۔ کیا

آپ کی نظر میں ملزم کرنسی نوٹوں کو سونگھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، مطلب یہ کہ اسے دور ہی سے نوٹوں کی مخصوص خوشبو آ جاتی ہے یا اس کے پاس کوئی پراسرار علم ہے......؟"

"ایسی کوئی بات نہیں جناب!" وہ میرے سوال کے جواب میں برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "آپ خوامخواہ حقیقت میں فسانہ ملانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"اگرچہ میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ مجھے فیکٹس اینڈ فکشن کا فرق بخوبی معلوم ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "بہرحال، آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ ملزم کو یہ کیسے پتا چلا کہ مقتولہ کی کپڑوں والی الماری کے لاکر میں ایک خطیر رقم مبلغ پچاس ہزار روپے رکھے ہیں؟"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ ملزم پچاس ہزار روپے کی رقم کے بارے میں جانتا تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ملزم کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ مقتولہ الماری والے لاکر میں رقم رکھا کرتی تھی۔"

"آپ کے خیال میں یہ معلومات مقتولہ نے ملزم کو فراہم کی تھیں؟" میں نے قدرے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

"میں اس بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "یہ بات طے ہے کہ ملزم اس راز سے واقف ہو گیا تھا کہ مقتولہ اس الماری کے لاکر میں رقم رکھتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ملزم نے معزز عدالت کے سامنے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ مقتولہ نے مذکورہ الماری کا لاک بھی اسی سے تبدیل کروایا تھا۔ اس کام کے دوران میں ملزم نے الماری کے اندرونی حصوں کا بھی جائزہ یقیناً لے لیا ہوگا اور عین ممکن ہے، اس نے نئے لاک کی ایک چابی اپنے پاس رکھ لی ہو اور"

"اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" عدالت کی مخصوص فضا میں ملزم کی احتجاجی آواز ابھری۔

مجھ سمیت تمام حاضرین عدالت نے چونک کر اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب دیکھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔

"سوال نہ پیدا ہونے کا سبب کیا تھا؟"

ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "جناب! پہلی بات تو یہ کہ مقتولہ نے نیا لاک خود

مجھے فراہم کیا تھا۔ پرانا لاک نکالنے کی ضرورت کیوں پیش آئی' یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے.....'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''پہلے سے الماری میں نصب لاک میں کوئی خرابی نہیں تھی' بلکہ لاک کی چابی اندر پھنس کر ٹوٹ گئی تھی۔ چابی پھنسنے پر جب مقتولہ نے زور لگا کر گھمانے کی کوشش کی تو چابی کا دندانوں والا حصہ اندر ہی ٹوٹ گیا تھا' جسے نکالنا آسان کام نہیں تھا۔ میں نے مقتولہ پر واضح کر دیا تھا کہ اگر لاک کے اندر سے چابی کے ٹوٹے ہوئے حصے کو نکالنے کی کوشش کی گئی تو لاک کے خراب ہو جانے کے امکانات ہیں' چنانچہ مقتولہ نے لاک کی مرمت کے بجائے نیا لاک لگوانے کا فیصلہ کیا اور یہ بھی کہا تھا کہ گھر میں دو مخفی قفل (ان سائڈ لاکس) رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی فٹ ہو سکتا ہو تو میں وہی لگا دوں۔ میں نے دونوں لاکس کا معائنہ کرنے کے بعد ایک کو اس الماری کے لئے پاس کر دیا تھا۔ میں نے پرانا لاک نکالنے کے بعد نئے لاک کو الماری میں فٹ کیا اور گھر سے نکل آیا۔ اس موقعے پر مقتولہ نے اپنے ہاتھ سے چابی لگا کر لاک کو چیک کیا تھا اور چابیوں والا ننھا سا رنگ اسی کے پاس رہا تھا' لہٰذا اس لاک کی کسی چابی کا میرے پاس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

ملزم کی بات ختم ہوئی تو وکیل استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تم تو اتنے ماہر فن کارپینٹر ہو کہ یہ چھوٹے موٹے لاک کو کھولنے کے لئے تمہیں کسی چابی کی ضرورت ہی پیش نہیں آ سکتی۔''

''آبجیکشن یور آنر.....'' میں نے نیم احتجاجی انداز میں کہا۔ ''وکیل سرکار میرے موکل کے ساتھ بہت زیادتی کر رہے ہیں۔ کسی ماہر فن کارپینٹر کو کسی چور سے تشبیہ دینا تقاضائے اخلاق کے منافی ہے۔ یہ تو ایسی بات ہوئی کہ کسی تجربہ کار سرجن کو آپ قصائی کہہ دیں۔''

''اگر میں نے ملزم کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جس سے اس کے چور ہونے کا تاثر ابھرتا ہے تو اس میں زیادتی والی کون سی بات ہے۔'' وکیل استغاثہ نے چوٹ کرنے والے انداز میں کہا۔ ''چوری تو اس نے کی ہے نا..... نہ صرف چوری بلکہ سینہ زوری کا بھی ثبوت دیا ہے..... مسز نورین کا قتل ایک سنگین جرم ہے۔''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''آپ کا فلسفہ میری سمجھ سے بالاتر ہے.....؟''

''میں نے ایسی کون سی فلسفیانہ بات کہہ دی ہے؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کیا آپ اپنی بات کی وضاحت فرمائیں گے؟''

''کیوں نہیں جناب!'' میں نے خوشگوار انداز میں کہا۔ ''آپ نے تو بہت چھوٹی سی فرمائش کی ہے۔ میں ضرور اس فرمائش کو پورا کروں گا۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی' پھر دوبارہ وکیل استغاثہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میرے فاضل دوست! آپ نے ملزم پر جرح کے ابتدائی اور وسطی حصے میں اپنا پورا زور اس امر کو ثابت کرنے پر خرچ کیا ہے کہ ملزم ایک عیار اور چالاک شخص ہے۔ اس نے اپنی معصوم صورت اور پراثر شخصیت کا جادو چلا کر مقتولہ کو رام کر لیا تھا۔ مقتول' ملزم کو پسند کرنے لگی تھی' یعنی ان دونوں کے درمیان دوستی اور اپنایت کا رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا.....؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' وہ اپنی گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

''اور یہ بھی آپ ہی کا دعویٰ ہے کہ ملزم نے مقتولہ کی الماری کی دراز (لاکر) میں سے پچاس ہزار روپے چرا لئے تھے؟''

''بالکل صحیح۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ ''استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق' مقتولہ نورین کو ملزم ہی نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی ہاں..... میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''یہی تو میرے لئے الجھن کا باعث ہے۔'' میں نے متاملانہ انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔

''اس میں تامل یا الجھن والی کون سی بات ہے؟''

''اچھا سوال ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میری الجھن اور پریشانی یہ ہے کہ اگر ملزم اور مقتولہ میں خوش گوار تعلقات تھے تو پھر ملزم کا مقتولہ کے گھر سے رقم چرانے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔''

اگر یہ تعلقات ہاتھی کے دانتوں کی حیثیت رکھتے تھے اور ملزم کی نیت چوری پر لگی ہوئی تھی تو پھر مقتولہ کے قتل کا سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ موقع ملتے ہی مقتولہ کی رقم اڑاتا اور خاموشی سے چلا جاتا۔'' میں نے تھوڑی دیر کو رک کر وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں جھانکا اور معتدل انداز میں کہا۔

''وکیل صاحب! اب تو آپ میری پریشانی کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے......؟''

''جی ہاں' بالکل سمجھ گیا ہوں۔'' وہ بڑے فخر سے بولا۔ ''اور بڑی آسانی سے میں آپ کی الجھن کو دور بھی کرسکتا ہوں۔''

''یہ تو آپ کا مجھ پر احسان عظیم ہوگا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''آپ مجھے اپنی بات مکمل کرنے دیں۔'' وہ ناگواری سے بولا۔ ''پھر سب کچھ آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔''

''ارشاد......'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''جیسا کہ میں نے بتایا......'' وہ بیان کرنے لگا۔ ''ملزم صرف مقتولہ کی الماری کا صفایا کرنے کی نیت رکھتا تھا۔ مقتولہ کا خون اس کے پروگرام کا حصہ نہیں تھا۔ اس کی خاطر تواضع کا بندوبست کرنے جب مقتولہ کچن کی طرف گئی تو اسے واردات کا موقع مل گیا۔ یہ چپکے سے ڈرائنگ روم سے نکل کر بیڈ روم میں پہنچا اور الماری کے لاکر پر طالع آزمائی کرنے لگا' لیکن قبل اس کے کہ وہ یہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتا' مقتولہ کسی کام سے بیڈ روم میں پہنچ گئی۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر ملزم بری طرح بوکھلا گیا۔ اس کی چوری رجسٹر ہو جانے کے بعد مقتولہ کی جانب سے مزاحمت ضروری تھی اور اس نے مزاحمت کی بھی چنانچہ ملزم نے اپنا راز افشا ہونے سے بچانے کے لئے مقتولہ کی مزاحمت کے جواب میں' اس کی کنپٹی پر آہنی ہتھوڑی کا وار کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا...... تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری...... میں جانتا ہوں کہ آپ اس وقت کیا سوچ رہے ہوں گے......''

اس نے سسپنس پیدا کرنے والے انداز میں بات ادھوری چھوڑی' پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بولا۔

''آپ یقیناً مجھ سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ کیا میں جائے واردات پر بھی موجود تھا' جو اتنی تفصیل سے اس واقعے کی منظرکشی کی ہے...... ہیں نا؟''

''آپ تو بڑے ذہین وکیل ہیں۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کا اندازہ سو فیصد درست ہے۔''

وہ بڑے فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''میرے وہاں موجود ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔ جائے وقوعہ از خود یہ کہانی سناتی ہے۔ وہاں کی افراتفری کو دیکھ کر یہی تاثر ابھرتا تھا کہ موت کے منہ میں جانے سے قبل مقتولہ نے ملزم کے خلاف اچھی خاصی مزاحمت کی تھی۔ بیڈ روم میں موجود کپڑوں والی الماری کے دونوں پٹ پوری طرح کھلے ہوئے تھے اور اندرونی لاکر کی بھی یہی کیفیت تھی۔ مذکورہ الماری کے قریب ہی فرش پر مقتولہ کی لاش پڑی تھی۔ اسے جس آہنی ہتھوڑی سے کنپٹی پر ضرب لگا کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا' وہ بھی لاش کے قریب ہی پڑی مل گئی تھی۔ یہ تمام تر شواہد جن حقائق کی جانب اشارہ کرتے ہیں' وہی ایک کہانی کی شکل میں تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کے سامنے بیان کئے ہیں۔''

''میں نے آپ کی وضاحت کو دل و جان سے مان لیا وکیل صاحب!'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''ان تمام تر واقعاتی شہادتوں سے وہی حقیقت اجاگر ہوتی ہے جو ابھی آپ نے بیان کی ہے' لیکن میرا وہ سوال ابھی تک تشنہ جواب ہے جہاں سے اس بحث کا آغاز ہوا تھا۔''

''کون سا سوال؟'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وقوعہ کے روز مقتولہ نے اپنے بیڈ روم میں' موت کے منہ میں جانے سے قبل جس ہتھوڑی بردار شخص کے خلاف مزاحمت پیش کی وہ اس مقدمے کا ملزم اور میرا موکل ساجد علی ہی تھا......؟''

''اس امر کا سب سے بڑا ثبوت تو آلہ قتل ہی ہے۔'' وکیل استغاثہ نے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے کہا۔

''کیوں...... آلہ قتل کو کیا ہوا ہے؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ ''آلہ قتل پر ملزم کے فنگر پرنٹس پائے گئے تھے۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......''

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ نورین کی موت بارہ دسمبر کی سہ پہر چار اور

پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آلہ قتل کیل ٹھونکنے والی آہنی ہتھوڑی تھی‘ جس کی مدد سے مقتولہ کی کنپٹی کو نشانہ بنایا گیا تھا اور یہ ضرب اتنی کاری ثابت ہوئی تھی کہ مقتولہ تیورا کر وہیں گری تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔

استغاثہ کے مطابق انکوائری آفیسر جب وقوعہ پر پہنچا تو اسے بیڈروم کے فرش پر مقتولہ کی لاش پڑی ملی تھی۔ کمرے کے اندر اس نوعیت کی ابتری بھی پائی گئی تھی‘ جیسے مقتولہ نے موت کے منہ میں جانے سے پہلے اچھی خاصی مزاحمت پیش کی ہو۔ کپڑوں والی الماری کے دونوں پٹ بھی کھلے پائے گئے تھے اور اس لاکر کا دروازہ بھی کھلا ملا تھا جس کے اندر سے مبینہ طور پر پچاس ہزار روپے کی رقم چرائی گئی تھی۔

آلہ قتل یعنی آہنی ہتھوڑی کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ہی منسلک تھی۔ اس ہتھوڑی کے آہنی حصے پر مقتولہ کے خون کے علاوہ اس کے سر کے چند بال بھی چپکے ہوئے پائے گئے تھے‘ جبکہ چوبی دستے پر میرے موکل یعنی اس کیس کے ملزم ساجد علی کی انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔

اس سے پہلے کہ استغاثہ کی جانب سے گواہوں کی پیشی کا سلسلہ شروع ہوتا‘ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے درخواست کی۔

”جناب عالی! اگر اجازت ہو تو میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس سلسلے میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“

جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مجھے اجازت دے دی۔

جج کے اشارے پر مذکورہ آئی او وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا اور منتظر نگاہ سے میری طرف دیکھنے لگا۔

اس آئی او کا نام امتیاز شاہ تھا۔ وہ ایک دراز قامت‘ مضبوط کاٹھی کا مالک‘ سانولا شخص تھا۔ سر کے بال وسطی سی جھالر کے مانند کنپٹیوں کے اوپر سے ہوتے ہوئے اور کانوں کے عقب سے گزرتے ہوئے سر کے پچھلے حصے کی جانب چلے گئے تھے۔ وہ چہرے کے تاثرات سے خاصا بیزار اور غصیلا نظر آتا تھا۔ عہدے کے اعتبار سے وہ ایک سب انسپکٹر تھا۔

”شاہ جی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”اس واقعے کی اطلاع آپ کو کس نے دی تھی؟“

”عباسی صاحب نے.....“ اس نے جواب دیا۔

”نادر عباسی نے؟“

”یہ کون صاحب ہیں؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”عباسی صاحب اسی اپارٹمنٹس بلڈنگ میں رہتے ہیں جہاں مقتولہ رہائش پذیر تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”بس بلاک کا فرق ہے۔ مقتولہ بلاک اے کے فلیٹ نمبر چار سو ایک میں رہتی تھی‘ جبکہ عباسی صاحب بلاک بی کے فلیٹ نمبر تین سو تین میں۔“

میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی! نادر عباسی نے وقوعہ کے روز آپ کو کیسے اور کتنے بجے اس سانحے کی اطلاع دی تھی؟“

”ہمارے روزنامچے کے مطابق اس واقعے کی اطلاع سہ پہر ساڑھے پانچ بجے دی گئی تھی۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اور یہ اطلاع بذریعہ فون دی گئی تھی۔“

”آپ کتنے بجے جائے وقوعہ پر پہنچے تھے؟“

”ٹھیک چھ بجے۔“

”کیا اس وقت نادر عباسی بھی وہاں موجود تھا؟“

”جی ہاں موجود تھا۔“

”کیا آپ نے نادر عباسی سے یہ سوال نہیں کیا کہ بی بلاک کے ایک فلیٹ میں رہتے ہوئے اسے یہ کیسے پتا چلا کہ بلاک اے میں کسی خاتون کا قتل ہو گیا ہے؟“

”پوچھا تھا.....“ اس نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ”عباسی صاحب کو بلڈنگ کے چوکیدار حنیف نے اس واقعے سے مطلع کیا تھا۔“

”جب آپ وقوعہ پر پہنچے تو وہاں کی کیا کیفیت تھی؟“ میں نے استفسار کیا۔

انکوائری آفیسر نے بڑے مفصل انداز میں مجھے کیفیت سے آگاہ کیا‘ جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

”جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کے بعد آپ کے ذہن میں پہلا خیال کیا آیا تھا؟“

”یہی کہ..... یہ ایک قتل اور ڈکیتی کی واردات ہے۔“

”مقتولہ کی لاش بیڈروم کے فرش پر پڑی تھی‘ لہٰذا فوراً ذہن میں قتل کے حوالے سے کوئی

خیال ابھر آنا تو نارمل سی بات ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''لیکن آپ کو یہ اندازہ کیسے ہوا کہ وہاں کوئی ڈاکا بھی پڑا ہے یا کوئی چوری وغیرہ ہوئی ہے؟''

''کپڑوں والی الماری کی حالت اس امر کی منہ بولتی تصویر تھی۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''رہی سہی کسر زبیر سلطان کے بیان نے پوری کر دی تھی۔''

''زبیر سلطان......'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ بھی اسی کیس کا کوئی کردار ہے......؟''

''جی ہاں......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''زبیر سلطان پیشے کے اعتبار سے ایک رئیل اسٹیٹ ایجنٹ ہے۔ مقتولہ وقوعہ کی شام اسی شخص سے ملاقات کرنے والی تھی۔ اس ملاقات میں مقتولہ نے زبیر سلطان کو پچاس ہزار روپے ادا کرنے تھے' جو اس نے اس روز بینک سے نکلوائے تھے۔ ان دونوں کے بیچ کسی فلیٹ کی خریداری کے سلسلے میں کوئی ڈیل چل رہی تھی۔''

''اچھا اچھا' یہ وہ صاحب ہیں......'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''ان کا نام تو استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں بھی شامل ہے۔''

''جی' شامل ہے۔'' آئی او نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''آئی او صاحب! کیا آلہ قتل آپ کو آسانی سے مل گیا تھا یا اس سلسلے میں آپ کو دشواری اٹھانا پڑی تھی؟''

''آلہ قتل مقتولہ کی لاش کے قریب ہی فرش پر پڑا تھا۔'' انکوائری آفیسر نے جواب دیا۔ ''اس کی تلاش کے سلسلے میں ہمیں کوئی خاص محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔''

''آلہ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''صرف اسی بنا پر آپ نے میرے موکل کو اس کیس کا ملزم قرار دیا ہے یا اس کے علاوہ بھی آپ کو کوئی ثبوت ملا تھا؟''

''آلہ قتل پر ملزم کے فنگر پرنٹس مل جانا ایک اہم ثبوت تھا۔'' تفتیشی افسر نے جواب دیا۔ ''پھر ملزم نے اس بات کا بھی اقرار کیا ہے کہ مذکورہ ہتھوڑی اسی کی ملکیت ہے۔''

''اگر آپ میرے ذاتی پستول سے کسی کو قتل کر دیں تو کیا اس کیس میں مجھے قاتل قرار دیا جائے گا؟'' میں نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ''آئی او صاحب! یہ تو کوئی فارمولا نہ ہوا؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں' اس بات کو فارمولا نہیں بنایا جا سکتا۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن آلہ قتل پر ملزم کے فنگر پرنٹس غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ حالات و واقعات اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ یہ قتل ملزم ہی نے کیا ہے۔''

''آپ نے ملزم کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا تھا؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

''اس کی دکان سے......'' آئی او نے جواب دیا۔ ''اور اس وقت لگ بھگ سات بجے کا وقت تھا۔''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ نورین کی موت بارہ دسمبر کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور آپ نے ملزم کو لگ بھگ سات بجے شام یا سات بجے رات گرفتار کیا تھا۔'' میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم انتہائی وقت سمجھتے ہوئے یہ فرض کر لیں کہ مقتولہ کو پانچ بجے قتل کیا گیا تھا تو آپ کے مطابق اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ ملزم اس واردات کے بعد بڑے آرام سے اپنی دکان پر موجود رہا تھا اور اگر آپ وہاں پہنچ کر اسے ہتھکڑی نہ لگاتے تو ممکن تھا یہ مزید کچھ وقت اپنی دکان پر بیٹھا رہتا......؟''

''جی ہاں' حالات تو اسی جانب اشارہ کرتے ہیں۔''

اس نے گول سا جواب دیا۔

''کیا گرفتاری کے وقت آپ نے ملزم کی اور اس کی دکان کی تلاشی لی تھی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''دکان کی تو نہیں البتہ......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے ملزم کی مکمل جامہ تلاشی لی تھی۔''

''کیا آپ نے ملزم کی جامہ تلاشی کے دوران میں مقتولہ کی الماری کے لاکر میں سے چوری ہونے والے پچاس ہزار روپے برآمد کروا لئے تھے؟''

''جی نہیں' اس کے پاس سے کوئی رقم برآمد نہیں ہوئی تھی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''اس کے بعد یقیناً آپ نے ملزم کی دکان کو کھنگال ڈالا ہوگا......؟''

"جی نہیں......" وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد بولا۔

"آئی او صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔" میں نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ "مقتولہ کی الماری کے لاکر میں سے ایک بڑی رقم چرا لی گئی اور آپ کا دعویٰ ہے کہ یہ رقم میرے موکل نے چرائی تھی تو پھر گرفتاری کے وقت آپ نے اس کی دکان کی تلاشی کیوں نہیں لی......؟"

"جی ہاں' بہت ضروری تھی۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن اس وقت تک خانہ تلاشی کا جواز سامنے نہیں آیا تھا۔ ہم نے ملزم کی جامہ تلاشی تو موقع کی کارروائی کے تقاضے نبھاتے ہوئے کی تھی۔"

"آپ صرف کمال ہی نہیں بلکہ غضب بھی کر رہے ہیں آئی او صاحب!" میں نے آنکھیں پھیلا کر تیکھے لہجے میں کہا۔

"معزز عدالت کے سامنے اس بات کی وضاحت کریں کہ ملزم کی گرفتاری کے وقت' اس کی دکان کی تلاشی کا جواز کیوں آپ کو نظر نہیں آ رہا تھا' جبکہ قتل کی واردات کے ساتھ ہی جائے وقوعہ سے پچاس ہزار روپے بھی غائب ہوئے تھے......؟"

"وہ بات دراصل یہ ہے جناب......" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ "ملزم کی گرفتاری کے وقت صرف مقتولہ کا قتل ہمارے پیش نظر تھا۔ رقم کی چوری کا قصہ تو بعد میں سامنے آیا تھا۔"

"اوہ......ویری انٹرسٹنگ!" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "تو گویا رقم کی چوری والا قصہ اس سٹوری کا ایڈیشن ہے......؟"

"جو بھی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مقتولہ کی الماری کے لاکر میں سے پچاس ہزار روپے غائب ہوئے تھے۔" وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔ "ہمارے پاس اس امر کے ٹھوس ثبوت ہیں۔ بینک کی چیک بک کا ریکارڈ' اکاؤنٹ میں سے نکالی جانے والی پچاس ہزار کی رقم کا ثبوت' زبیر سلطان کی گواہی......"

"ان تمام تر واقعاتی شہادتوں اور گواہوں کو ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "سردست معزز عدالت کو آپ یہ بتائیں کہ آپ کوئی بھی ایسا ٹھوس ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ مقتولہ نے مسروقہ رقم واقعتاً الماری میں رکھتے دیکھا ہو۔" وہ بیزاری سے بولا۔

"آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ استغاثہ کے پاس اس امر کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے؟"

"جی ہاں......ایسا ہی سمجھ لیں۔"

"سمجھ لیا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا' پھر استفسار کیا۔ "پھر تو استغاثہ کے سٹاک میں اس امر کا بھی کوئی عینی شاہد نہیں ہوگا کہ یہ دعویٰ کر سکے کہ اس نے ملزم کو مقتولہ کی الماری میں سے پچاس ہزار روپے اڑاتے دیکھا ہے؟"

"جی ہاں......یہی بات ہے۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "مذکورہ رقم کی لاکر میں موجودگی کو بینک کی دستاویزات اور زبیر سلطان کے تناظر ہی میں سمجھا اور ثابت کیا جا سکتا ہے۔"

"آخری سوال!" میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "کیا آپ نے ملزم کے پاس سے وہ رقم برآمد کر لی تھی؟"

آئی او نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں اس چوبی میز کی جانب بڑھ گیا جہاں آلہ قتل یعنی کیل ٹھونکنے والی ہتھوڑی سیلوفین بیگ کے اندر محفوظ رکھی نظر آ رہی تھی۔ ہتھوڑی کے سر یعنی آہنی حصے پر موجود مقتولہ کا خون اب سیاہی مائل رنگت اختیار کر چکا تھا اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ قائم نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے اس کا رنگ سرخ بھی رہا ہوگا۔

میں نے مذکورہ سیلوفین بیگ میز پر سے اٹھا لیا اور اکیوزڈ باکس میں کھڑے اپنے موکل کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے سوال کیا۔

"جانتے ہو' اس بیگ کے اندر کیا ہے؟"

"ہتھوڑی ہے......" اس نے جواب دیا۔

"استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ اس ہتھوڑی کی مدد سے مقتولہ نورین کو قتل کیا گیا تھا۔" میں نے اپنے موکل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

"بہت ساری باتیں جو انتہائی سادہ اور سامنے کی ہوتی ہیں انہیں بڑے طریقے سلیقے سے عدالت کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے اور ان لمحات میں' میں یہی کام کر رہا تھا۔ میں نے پچھلے دنوں اس کیس کے حوالے سے بڑی بھاگ دوڑ کی تھی اور دو تین ملاقاتیں ملزم سے بھی ہوئی تھیں' جس کے نتیجے میں مجھے بیش قیمت معلومات حاصل ہوئی تھیں' جنہیں میں گاہے بہ گاہے' مناسب موقع دیکھ کر عدالتی کارروائی کے دوران میں استعمال بھی کر رہا تھا۔

ملزم نے میرے استفسار کے جواب میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور نہایت ہی مختصر سا جواب دیا۔ ''جی......!''

''کیا تم اس ہتھوڑی کو پہچانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''اس کے دستے پر تمہارے فنگر پرنٹس پائے گئے ہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کیا اس ہتھوڑی کا تمہارے ساتھ کوئی تعلق بنتا ہے۔ ایسا لگتا ہے' یہ تمہارے استعمال میں رہی ہو......ہوں؟''

''جی ہاں......آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''اس ہتھوڑی کا مجھ سے بڑا گہرا تعلق ہے' بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارا ساتھ پانچ سال سے زیادہ عرصے کا ہے اور یہ میرے استعمال میں بھی رہی ہے' جبھی تو اس کے دستے پر میری انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔''

''ویری گڈ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ تمہاری یہ دیرینہ رفیق جائے وقوعہ پر کیسے پہنچی؟''

''میرا خیال ہے......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''وقوعہ کے روز جب میں مقتولہ کے گھر میں کام ختم کرنے کے بعد واپس آیا تھا تو یہ ہتھوڑی وہیں ڈرائنگ روم میں رہ گئی تھی۔''

''اچھا!'' میں نے پرمعنی انداز میں گردن ہلائی۔ ''تم جب اپنے اوزار سمیٹ کر مقتولہ کے فلیٹ سے نکلے تو اس وقت تمہیں یہ پتا نہیں تھا کہ یہ ہتھوڑی وہیں رہ گئی ہے؟''

''جی ہاں' مجھے اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔'' وہ سادگی سے بولا۔ میں نے صوفے کی مرمت کے دوران میں سارے اوزار ڈرائنگ روم کے فرش پر پھیلا رکھے تھے اور جب کام ختم ہو گیا تو میں انہیں اپنے مخصوص تھیلے (ٹولز کٹ) میں رکھ کر مقتولہ کے فلیٹ سے نکل آیا تھا۔ مجھے یقین ہے' میں اس ہتھوڑی کو تھیلے میں رکھنا بھول گیا تھا۔''

''تم مقتولہ کے فلیٹ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''میرا خیال ہے' اس وقت سہ پہر کے تین بجے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور تم مقتولہ کے فلیٹ پر کتنی دیر رکے تھے؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ......'' وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کام تو میں نے چالیس پینتالیس منٹ میں ختم کر لیا تھا۔ اس کے بعد مقتولہ نے مجھے چائے پینے کو دی' جس کی وجہ سے مزید دس پندرہ منٹ مجھے اس کے فلیٹ میں رکنا پڑا تھا' لیکن یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی' پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''جب میں مقتولہ کے فلیٹ سے نکلا تو اس وقت چار بجنے میں ایک دو منٹ باقی تھے۔''

''یعنی جب تم مقتولہ کے فلیٹ سے باہر آئے تو اس وقت مقتولہ زندہ سلامت تھی؟'' میں نے تصدیق طلب انداز میں استفسار کیا۔

''بالکل...... میں اسے صحیح سلامت وہاں چھوڑ کر آیا تھا۔'' اس نے میرے حسب توقع جواب دیا۔ ''بلکہ وہ میرے ساتھ دروازے تک آئی تھی اور جب میں فلیٹ سے باہر نکلا تو اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔''

''آخری سوال......'' میں نے ملزم کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے استفسار کیا۔ ''جب تم اپنا کام ختم کر کے مقتولہ کے فلیٹ سے رخصت ہوئے تو کیا اس وقت فلیٹ کے اندر مقتولہ کے علاوہ کوئی اور شخص بھی موجود تھا؟''

''نہیں جناب......وہ گھر میں اکیلی ہی تھی۔''

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد استغاثہ کی طرف سے دو گواہ یکے بعد دیگرے شہادت کے لئے کٹہرے میں لائے گئے' جن میں سے ایک تو اسی اپارٹمنٹس بلڈنگ کا رہائشی تھا اور دوسرا بھی اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ ان دونوں گواہوں کے بیانات اور بعد ازاں ان پر ہونے والی جرح میں کوئی خاص یا نئی بات موجود نہیں تھی۔ دونوں کا موقف وکیل استغاثہ کے ابتدائی زور وکالت کا عکاس تھا اور مجھے تو ان کے بیانات میں صرف یہی بات سمجھ میں آئی کہ انہیں ملزم کا مقتولہ کے فلیٹ میں جانا اور اس سے خاطر تواضع کرنا ہضم نہیں ہوتا تھا۔

کوئی عورت اپنے شوہر کے بغیر کہیں اکیلی رہ رہی ہو تو بہت سوں کی ہوس بھری بھوکی نظریں اس پر لگ جاتی ہیں۔ یہ دونوں گواہان استغاثہ بھی اسی چکر میں دکھائی دیتے تھے۔ آپ

اسے خوامخواہ کا حسد بھی کہہ سکتے ہیں۔

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے پر جج نے آئندہ پیشی کے لئے تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو ملزم کا بھائی رزاق میرے ساتھ تھا۔ رزاق فریج اور ایئر کنڈیشنر وغیرہ کی ریپئرنگ وغیرہ کا کام کرتا تھا اور اپنے شعبے کا ایک تجربہ کار اور قابل بھروسہ ماہر سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اسے جب بھی دیکھا تو اس کا شیو ہلکا سا بڑھا ہوا نظر آیا۔ وہ درمیانے قد کا ایک فربہ اندام اور ہنس مکھ شخص تھا۔ وہ ہر وقت سر پر ٹوپی لگائے رہتا تھا۔

رزاق نے مجھ سے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ کی نظر میں اس وقت کیس کی کیا پوزیشن ہے؟''

''انتہائی تسلی بخش۔'' میں نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''یعنی ساجد باعزت بری ہو جائے گا نا......؟'' وہ متذبذب لہجے میں مستفسر ہوا۔

''آپ مجھے ایک بات بتائیں رزاق صاحب!'' جواب دینے کے بجائے میں نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

''کیا آپ کی نظر میں ساجد علی نے یہ قتل کیا ہے؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!'' وہ اٹل لہجہ میں بولا۔ ''ساجد ایسا کام کر ہی نہیں سکتا۔ والد صاحب مرحوم نے ہماری جس انداز میں تربیت کی تھی اس کی روشنی میں چوری' ڈکیتی' ہیرا پھیری کی ہم سے توقع نہیں کی جا سکتی اور...... انسانی جان کا قتل تو بہت دور کی بات ہے۔''

''گویا آپ کی نظر میں ساجد علی بے گناہ ہے......؟''

''جی ہاں' بالکل!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

''جب یہ بات اتنے وثوق سے آپ کو معلوم ہے تو پھر وہ قادر مطلق بھی اس حقیقت سے بہ خوبی واقف ہوگا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''وہ ذات پاک تو علیم الخبیر ہے' سمیع البصیر ہے۔''

''اور وہ انصاف کرنے والا بھی ہے۔''

''بے شک!''

''تو پھر آپ مطمئن ہو جائیں۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنے بھائی کو اور میں اپنے موکل کو بے گناہ سمجھتا ہوں اور ہم دونوں کا یہ بھی ایمان ہے کہ وہ قادر مطلق تمام تر زمینی حقائق سے پوری طرح آگاہ ہے۔ جب وہ اپنے بندے پر کرم کرے گا اور میں اپنے موکل کی بریت کے لئے کوشش کروں گا تو پھر ملزم اس عدالت سے باعزت ہی اپنے گھر جائے گا۔''

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

***

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی طرف سے پراپرٹی ایجنٹ زبیر سلطان کو سب سے پہلے گواہی کے لئے پیش کیا گیا۔ زبیر سلطان بھاری تن و توش کا مالک ایک ہشاش بشاش شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی تیزی پائی جاتی تھی۔ وہ گندمی رنگت کا مالک ایک دوربین انسان تھا۔

زبیر سلطان نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا' پھر اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لئے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ وہ مختلف سوالات کے ذریعے گواہ کی زبان سے یہ ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہا کہ مقتولہ نے وقوعہ کے روز بینک سے پچاس ہزار روپے نکلوائے تھے' جو وہ شام سات بجے اسے دینے والی تھی۔ اس گفتگو کے دوران میں چیک بک اور بینک کے ریکارڈ کا بھی کئی بار ذکر آیا۔ بہرحال حاصل بحث صرف اتنا تھا کہ وقوعہ کے روز مقتولہ کے گھر میں پچاس ہزار روپے کی رقم موجود تھی۔

وکیل استغاثہ نے گواہ کو فارغ کیا تو جج سے اجازت لے کر میں گواہوں والے کٹہرے کے نزدیک چلا گیا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کچھ اس انداز میں اپنی جرح کا آغاز کیا۔

''زبیر صاحب! کیا یہ بات درست ہے کہ آپ کا تعلق ایک خاص کمیونٹی سے ہے؟''

''جی ہاں' یہ بات سولہ آنے درست ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کی کمیونٹی میں نوکری وغیرہ کرنے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔'' میں نے بڑے میٹھے انداز میں جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ کاروبار کو ترجیح دیتے ہیں؟''

"بات محض ترجیح کی نہیں ہے وکیل صاحب......" وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ صرف کاروبار اور تجارت ہی کرتے ہیں۔ ہماری کمیونٹی کے روحانی پیشوا نے ہمیں ملازمت وغیرہ سے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ ہم صرف اور صرف اپنا کام کرتے ہیں' چاہے ہمیں چنے کی چھابڑی کیوں نہ لگانا پڑے۔"

"بہت خوب......" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "کامیاب تجارت کے لئے تو ایمانداری بنیادی شرط سمجھی جاتی ہے۔ کیا آپ کے ہاں بھی اس بنیادی لوازم کا خیال رکھا جاتا ہے؟"

"جس طرح ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں' بالکل اسی طرح دنیا میں پائے جانے والے تمام افراد بھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ہماری کمیونٹی میں سو فیصد دیانت دار لوگوں کا پایا جانا لازمی نہیں ہے۔" وہ بڑے خوبصورت پیرائے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "البتہ' آپ نے جس کاروباری اصول کا ذکر کیا ہے اس کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جو بھی شخص اس اصول پر کاربند رہتا ہے وہ فلاح وترقی پاتا ہے۔"

"ہم دوسروں کی بات نہیں کرتے' صرف آپ کی ذات کو فوکس کرتے ہیں۔" میں نے بڑی رسان سے کہا۔ "کیا آپ نے اپنے بزنس میں متذکرہ بالا اصول کے لئے جگہ بنا رکھی ہے؟"

"الحمدللہ......" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"زبیر صاحب!" میں نے اچانک سوالات کا زاویہ بدل دیا۔ "کیا آپ کے پاس کوئی ایسی صلاحیت بھی ہے کہ لوگ آپ کو اپنے گھریلو رازوں میں بھی شریک کر لیتے ہیں؟"

"اگر یہاں لوگوں سے مراد میرے گھر کے افراد ہیں تو الحمدللہ......اس معاملے میں' میں واقعی بہت خوش قسمت ہوں۔" وہ پُراعتماد انداز میں بولا۔ "میرے فیملی کے تمام افراد اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کرتے ہیں۔"

"میں آپ کے گھر کی نہیں' بلکہ دوسرے لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے وضاحت ضروری جانی۔ "دوسرے لوگ جیسے......مقتولہ نورین......؟"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں جناب!" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "دوسرے لوگ بھلا کیوں مجھے اپنے رازوں میں شریک کرنے لگے؟"

"وکیل استغاثہ نے آپ کے ساتھ جو بیس پچیس منٹ صرف کئے ہیں اس کا لب لباب اور اس لب لباب میں سے اٹھنے والے بلبلے اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ مقتولہ اپنے مالیاتی راز آپ کے ساتھ شیئر کیا کرتی تھی جبھی آپ کو یہ بات پتا تھی کہ وقوعہ کے روز اس نے پچاس ہزار روپے بینک سے نکلوا کر اپنی الماری کے لاکر میں رکھے تھے......؟"

"نہیں جناب' ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ نے وکیل استغاثہ کی گفتگو سے خود ہی یہ مطلب اخذ کر لیا ہے' ورنہ میں نے تو ایسا کوئی تاثر نہیں دیا۔"

"تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مقتولہ نے آپ کو نہیں بتایا تھا کہ اس نے پچاس ہزار کی رقم اپنی الماری کے لاکر میں رکھی تھی؟" میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

"جی' میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "وہ بھلا مجھے اپنے بیڈروم اور اس میں رکھی الماری کے لاکر کے حوالے سے کیوں بتانے لگی......"

"تو گویا آپ کی معلومات صرف اس حد تک ہیں کہ مقتولہ نے وقوعہ کے روز بینک سے پچاس ہزار روپے نکلوائے تھے؟" میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "آپ یہ بات دعوے سے نہیں کہہ سکتے کہ اس نے مذکورہ رقم اپنی الماری کے لاکر ہی میں رکھی تھی؟"

"جی یہی حقیقت ہے۔" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ "مجھے صرف مقتولہ نے یہ بتایا تھا کہ اس نے بینک سے پچاس ہزار روپے نکلوا لئے ہیں' جو وہ شام کو میرے آفس آ کر مجھے ادا کر دے گی۔ اب اس نے ان پچاس ہزار روپوں کو الماری میں رکھا تھا' تکئے کے نیچے چھپایا تھا' اپنے پرس میں ڈالا تھا یا کسی گلے میں دبایا تھا' یہ تو وہی جانتی تھی اور یا پھر خدا کو معلوم تھا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں زبیر صاحب!" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا' پھر پوچھا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو معزز عدالت کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ مقتولہ کس سلسلے میں آپ کو پچاس ہزار روپے ادا کرنے والی تھی؟"

اس عدالت میں نورین مرڈر کی سماعت ہو رہی تھی' لیکن زیادہ زور پچاس ہزار روپے کی چوری پر دکھائی دیتا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ استغاثہ نے اس مرڈر کو پچاس ہزار روپے کی چوری کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

استغاثہ کے گواہ نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا کہ مقتولہ اس کے توسط سے

ایک فلیٹ کا سودا کر رہی تھی اور وقوعہ کے روز ٹوکن کے طور پر پارٹی کو پچاس ہزار روپے ادا کرنا تھے تاکہ سیل ایگری منٹ تیار کیا جاسکے' لیکن مقتولہ کی موت کے باعث یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ میں نے مزید دو چار ضمنی سوالات کے بعد زبیر سلطان کو فارغ کر دیا۔

میرے حساب سے زبیر سلطان کی گواہی محض وقت کا زیاں ثابت ہوئی تھی۔ استغاثہ اس کے بیان سے صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مقتولہ نے اپنے الماری کے لاکر میں پچاس ہزار روپے رکھے تھے' وغیرہ وغیرہ...... اور میں نے استغاثہ کے اس سٹینڈ کو قدموں سے اکھاڑ پھینکا تھا۔

اگلا گواہ نادر عباسی تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے تھانے فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ عباسی لوکل گورنمنٹ کا ملازم تھا۔ اس کے محکمے یا عہدے کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہو گا۔ نادر عباسی اسی اپارٹمنٹس بلڈنگ کے بی بلاک میں رہائش پذیر تھا' جس کے بلاک اے میں مقتولہ نورین کا فلیٹ تھا۔ عباسی سانولی رنگت کا مالک ایک پستہ قامت شخص تھا۔

وکیل استغاثہ نے اپنی جرح مکمل کر لی تو میں نے اپنی باری پر گواہوں والے کٹہرے کے پاس پہنچ گیا۔ میں چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے عباسی کو دیکھتا رہا' پھر جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''عباسی صاحب! پولیس کے ریکارڈ کے مطابق اس اندوہناک واقعے کی اطلاع آپ ہی نے متعلقہ تھانے کو دی تھی۔ کیا یہ سانحہ آپ کی نظر کے سامنے وقوع پذیر ہوا تھا؟''

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وقوعہ استغاثہ کے گواہ نادر عباسی کے سامنے پیش نہیں آیا تھا' تاہم میں نے اسے ایک خاص زاویے سے گھسنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے نہایت ہی مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

''نہیں وکیل صاحب......''

''پھر آپ کو اس واقعے کی خبر کیسے ہوئی؟''

''مجھے بلڈنگ کے چوکیدار نے اس بارے میں بتایا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''جب چوکیدار نے آپ کو یہ اطلاع دی اس وقت آپ کہاں تھے؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو رفتہ رفتہ آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''میں چند لمحے پہلے ہی بلڈنگ میں داخل ہوا تھا۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں

بتایا۔ ''میں جیسے ہی گاڑی پارک کر کے باہر نکلا' چوکیدار حنیف نے میرے پاس آ کر یہ اطلاع دی اور اس کے ساتھ ہی درخواست بھی کہ میں اس افسوسناک واقعے کی اطلاع پولیس کو دے دوں' سو......'' وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوا' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں جلدی سے گھر پہنچا اور متعلقہ تھانے میں فون کر دیا۔''

''آپ نے لگ بھگ کتنے بجے تھانے فون کیا تھا؟''

''میرے خیال میں اس وقت سہ پہر کے ساڑھے پانچ بجے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بلکہ شام ہونے والی تھی۔ سردیوں میں دن گھٹ کر کافی چھوٹا ہو جاتا ہے۔''

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا' پھر پوچھا۔ ''آپ کے خیال میں بلڈنگ کے چوکیدار حنیف کو یہ کیسے پتا چلا تھا کہ بلاک اے کے فلیٹ نمبر چار سو ایک میں رہنے والی مسز نورین کو کسی نے قتل کر دیا ہے؟''

''آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے وکیل صاحب!'' وہ تعریفی انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے پولیس کو فون کرنے سے پہلے اس بارے میں چوکیدار سے استفسار کیا تھا۔''

''پھر اس نے آپ کو کیا جواب دیا تھا؟''

''چوکیدار کو یہ بات آمنہ سے پتا چلی تھی۔'' عباسی نے جواب دیا۔

اس کیس میں ایک نیا کردار سامنے آیا تھا' لہٰذا میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''آمنہ کون......؟''

''آمنہ ایک ماسی (نوکرانی) ہے جناب۔'' عباسی نے بتایا۔ ''وہ ہماری بلڈنگ کے چند گھروں میں کام کرنے آتی ہے۔ مقتولہ کے گھر پر بھی وہی کام کرتی تھی۔ وقوعہ کے روز سہ پہر میں جب وہ کام کے لئے مقتولہ کے گھر پہنچی تو اس نے مقتولہ کو بیڈ روم کے فرش پر مردہ حالت میں پڑے دیکھا۔ اس کے بعد ہی وہ دوڑتی ہوئی چوکیدار کے پاس پہنچی تھی۔''

میں نے اپنی فائلوں میں جھانکا اور وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''استغاثہ کی رپورٹ اور گواہان کی فہرست میں آمنہ نامی کسی کردار کا ذکر نظر نہیں آتا۔ یہ کچھ عجیب سی بات نہیں؟''

''اس میں آپ کو کیا عجیب محسوس ہو رہا ہے؟'' اس نے اکھڑے ہوئے انداز میں الفاظ مجھی سے پوچھ لیا۔

''آمنہ وہ عورت ہے جس نے سب سے پہلے مقتولہ کو مردہ حالت میں دیکھا تھا۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''رپورٹنگ پرسن کا نام تو کسی بھی رپورٹ میں بڑے اہتمام کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور یہاں اس ماسی بے چاری کا ذکر تک پڑھنے کو نہیں ملتا۔ اس سنگین نظر اندازی کا کیا سبب ہے؟''

''کوئی سبب نہیں۔'' وہ بہ دستور اکھڑے ہوئے انداز میں بولا۔ ''استغاثہ نے جس بات کو ضروری سمجھا' اسے رپورٹ میں شامل کر لیا اور......''

''اور جس بات کو غیر ضروری جانا اسے گول کر دیا۔'' میں نے اس کا بیان مکمل ہونے سے پہلے ہی طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہی بات ہے نا میرے فاضل دوست؟''

''آپ جو بھی سمجھ لیں......'' وہ رکھائی سے بولا۔

''جو بھی سمجھنے کی بات نہیں ہے مائی ڈیئر......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ترشی سے کہا۔ ''میں نے وہی سمجھا ہے جو آپ نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔'' پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور نہایت ہی ادب کے ساتھ عرض کیا۔

''جناب عالی! جس عورت نے سب سے پہلے مقتولہ نورین کی لاش کو دیکھا' ڈیفنس کی نظر میں وہ بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ مجھے تو اس بات پر سخت حیرت ہے کہ استغاثہ کی رپورٹ میں آمنہ ماسی کا کہیں ذکر تک نہیں کیا گیا۔ میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ مذکورہ ماسی کو عدالت میں حاضر کرنے کا خصوصی بندوبست کیا جائے۔ میں اس گھریلو ملازمہ پر اپنے انداز میں جرح کرنا چاہتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس کے ساتھ ہی بلڈنگ کے چوکیدار حنیف کو بھی اگلی پیشی پر عدالت میں بلایا جائے۔ اس شخص سے پوچھ گچھ بھی اس کیس کے سلسلے میں معاون اور میرے موکل کے حق میں مفید ثابت ہو سکتی ہے۔''

معزز عدالت نے میرے مطالبے کو راست جانتے ہوئے متعلقہ عدالتی عملے کو خصوصی ہدایات جاری کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی دس دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست

کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!''

***

آئندہ پیشی پر آمنہ ماسی عدالت میں موجود نہیں تھی۔ استغاثہ کی طرف سے وضاحت دی گئی کہ آمنہ اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے اور اسے بلانے کی مہم کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ آمنہ کا گاؤں بلوچستان کا ایک دور دراز علاقہ تھا اور وہ کراچی کے علاقے گولی مار میں' ندی کے کنارے ایک بستی میں رہتی تھی' جہاں زیادہ تک اسی کی ہم پیشہ عورتوں یعنی ماسیوں کے خاندان آباد تھے۔

پتا نہیں کیوں...... مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ استغاثہ آمنہ ماسی کے سلسلے میں جان بوجھ کر تاخیری حربے آزما رہا تھا۔ ورنہ دس دن کا وقت کوئی کم نہیں ہوتا۔ اس عرصے میں پاکستان کے کسی بھی کونے سے آدمی کو کھینچ کر عدالت میں پہنچایا جا سکتا ہے۔ بہر حال' میں نے کراچی لیول پر ملزم کے بھائی رزاق کو خصوصی ہدایات کے ساتھ ایک ڈیوٹی سونپ دی تھی۔ اسے نہایت ہی غیر محسوس انداز میں آمنہ کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مجھ تک پہنچانا تھیں۔

اس پیشی پر بلڈنگ کا چوکیدار حنیف عدالت میں حاضر تھا لہٰذا میں نے اس روز اسی پر گزارہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ حنیف کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل نہیں تھا' تاہم اس کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ہی کی تھی۔

حنیف نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا تو وکیل استغاثہ پوچھ گچھ کے لئے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ دو چار سرسری سے سوالات پوچھ کر وکیل استغاثہ نے اسے فارغ کر دیا۔ اس کے بعد یقیناً میری باری تھی۔

حنیف کی عمر پینتیس سال کے آس پاس رہی ہو گی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ میں نے کسی تمہید کے بغیر ہی خلاف عادت براہ راست جرح شروع کر دی۔

''کیا یہ سچ ہے کہ مقتولہ کی ماسی آمنہ نے تمہیں اس کے قتل کے بارے میں بتایا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی ہاں' یہ بالکل صحیح بات ہے۔'' اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"تم اس وقت کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے جب ماسی نے تمہیں یہ اطلاع دی؟"

"میں بلڈنگ کی چھت سے نیچے آ رہا تھا۔" وہ بولا۔

"سیڑھیوں پر ماسی آمنہ سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ اندر مقتولہ یعنی نورین کی لاش پڑی ہے۔"

"تم بلڈنگ کی چھت پر کیا کرنے گئے تھے؟"

"پانی کھولنے....." اس نے بڑی رسان سے جواب دیا۔

مجھے مذاق کی سوجھی، ترت پوچھا۔ "کیا آپ لوگوں نے پانی کو بلڈنگ کی چھت پر کہیں قید کر رکھا ہے جو تم اسے کھولنے گئے تھے؟"

"ایسی بات نہیں ہے وکیل صاحب۔" وہ کھسیانا سا ہو کر بولا۔

"پھر کیسی بات ہے؟" میں نے تفریحاً پوچھ لیا۔

"جناب! بات دراصل یہ ہے کہ....." وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "بلڈنگ کے گھروں کو پانی سپلائی کرنے والی ٹینکی چھت پر بنی ہوئی ہے۔ میں پانی نہیں، بلکہ اس کے والوز کھولنے چھت پر گیا تھا۔ یہ کام میں صبح و شام دونوں وقت کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے..... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تم ٹینکی کا والوز کھول کر چھت سے نیچے آ رہے تھے تو اس وقت کم و بیش سہ پہر کے پانچ بجے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں، میرے خیال میں اس وقت شام کے پانچ دس ہوئے تھے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں والوز کھولنے کے بعد تقریباً دس منٹ تک چھت پر ہی موجود رہتا ہوں۔"

"تم جس اپارٹمنٹس بلڈنگ میں چوکیداری کرتے ہو اس میں کل کتنے فلور ہیں؟" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"چھ....." اس نے بتایا۔ "یعنی گراؤنڈ پلس پانچ فلور۔"

"مطلب یہ کہ پانچ فلور یعنی چھ منزلیں؟"

"جی ہاں، بالکل ایسا ہی ہے۔"

"مقتولہ کا فلیٹ کس فلور پر واقع ہے؟"

"فورتھ فلور پر....." اس نے جواب دیا۔ "فلیٹ نمبر چار سو ایک۔ یہ فلیٹ زینوں کے

سامنے ہی پڑتا ہے۔"

"ویری گڈ!" میں نے جلدی سے کہا، پھر پوچھا۔ "جب تم والوز کھول کر بلڈنگ کی چھت سے نیچے آئے تو ماسی آمنہ نے تمہیں مقتولہ کی لاش کے بارے میں بتایا تھا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، تم دونوں کی ملاقات بلڈنگ کے کس حصے میں ہوئی تھی؟"

اس نے ایک لمحہ سوچنے کی اداکاری کی، پھر جواب دیا۔ "جناب! اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے۔ جب میں اوپر سے نیچے اتر رہا تھا تو فورتھ فلور پر پہنچتے ہی ماسی آمنہ اچانک میرے سامنے آ گئی تھی۔ بس وہیں زینے پر، مقتولہ کے فلیٹ کے دروازے کے سامنے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔"

"آمنہ اچانک ہی تمہارے سامنے آ گئی تھی۔" میں نے اسی کے الفاظ دہرائے، پھر پوچھا۔ "وہ آئی کہاں سے تھی؟"

"ج..... جی....." وہ الجھن بھرے انداز میں بولا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"میں نے تم سے ریاضی کا کوئی پیچیدہ سوال نہیں کیا جو تم اس قدر پریشان نظر آ رہے ہو؟" میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوچھا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ زینوں کی طرف سے آئی تھی یا گیلری میں موجود تھی یا چھت سے ٹپکی تھی یا....."

"وہ گھر کے اندر سے نکلی تھی....." وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

"کس کے گھر سے؟"

"نورین کے گھر سے....." اس نے جواب دیا۔

"میں جیسے ہی زینے اترتے ہوئے فورتھ فلور پر پہنچا، فلیٹ نمبر چار سو ایک کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور ماسی باہر نکلی۔ وہ اس وقت بہت گھبرائی ہوئی تھی۔۔"

"اس نے تم سے کیا کہا تھا؟" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

"اس نے بوکھلاہٹ بھرے لہجے میں بتایا کہ اندر نورین کی لاش پڑی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر تم نے کیا، کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں بھاگتا ہوا نیچے اترا اور عباسی صاحب کے پاس پہنچ گیا۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے بتایا۔ "میں جب چھت پر تھا تو میں نے ان کی گاڑی کو بلڈنگ میں داخل ہوتے دیکھ لیا

تھا۔ عباسی صاحب ایک پڑھے لکھے سرکاری افسر ہیں۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ اس واقعے کی اطلاع عباسی صاحب ہی کو دینا چاہئے۔ وہ بلڈنگ کی یونین کے عہدے دار بھی ہیں۔'' وہ لمحے بھر کے لئے تھما' پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بولا۔

''میری بات سن کر وہ جلدی سے اپنے گھر گئے' پھر انہوں نے اپنے گھر سے پولیس کو فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔''

''کیا تم نے مقتولہ نورین کی لاش کو اس کے بیڈ روم میں پڑے دیکھا تھا؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''نن..... نہیں.....'' وہ بوکھلا گیا۔ ''ہاں..... دیکھا تھا.....''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔ ''ہاں..... کہ..... نہ؟''

''وہ جناب! بات دراصل یہ ہے کہ.....'' وہ اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''جب ماسی آمنہ نے مجھے مقتولہ کے قتل کے بارے میں بتایا تو میں گھبرا گیا تھا اور میں تیزی سے زینے اتر کر عباسی صاحب کے پاس پہنچ گیا تھا' پھر جب پولیس ہماری بلڈنگ میں آئی تو میں عباسی صاحب اور پولیس والوں کی موجودگی میں مقتولہ کے گھر کے اندر گیا تھا اور میں نے بیڈ روم کے فرش پر اس کی لاش پڑی دیکھی تھی۔ پولیس نے مجھے بیڈ روم کے اندر تو نہیں جانے دیا تھا۔ میں نے کامن روم میں کھڑے کھڑے' بیڈ روم کے فرش پر پڑی مقتولہ نورین کی لاش دیکھی تھی۔''

''یعنی جب آمنہ ماسی نے تمہیں اس واقعے کی اطلاع دی تو تم اس وقت مقتولہ کے فلیٹ میں داخل نہیں ہوئے تھے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''جی..... جی ہاں.....'' وہ ایک بار اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں بعد میں عباسی صاحب کی موجودگی میں مقتولہ کے فلیٹ کے اندر گیا تھا۔''

میں نے چوکیدار حنیف پر اپنی جرح ختم کر دی اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! اس کیس کے تمام گواہ بھگتائے جا چکے ہیں' سوائے ایک کے اور وہ گواہ ہے..... آمنہ ماسی۔ میری معزز عدالت سے پرزور استدعا ہے کہ آئندہ پیشی پر ماسی آمنہ کی گواہی کو یقینی بنایا جائے تاکہ اس کیس کو جلد از جلد نمٹایا جا سکے۔ دیٹس آل یور آنر.....''

جج نے اثبات میں سر ہلایا اور وکیل استغاثہ کو ضروری ہدایات دینے لگا' پھر ایک ہفتہ کی

تاریخ دے کر اس نے عدالت برخاست کر دی۔

***

منظر اسی عدالت کا تھا اور کٹہرے میں آمنہ ماسی کھڑی تھی۔

وہ گھروں میں کام کرنے والی ایک ماسی تھی اور ماسی ہی دکھائی بھی دیتی تھی۔ آمنہ کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ دھان پان' درمیانے قد۔ کی مالک اور گوری چٹی عورت تھی۔ دبلا پتلا ہونے کے باوجود بھی وہ خاصی پھرتیلی نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک خاص قسم کی تیزی پائی جاتی تھی۔ اس کے چہرے کی خاص نشانی یہ تھی کہ اس نے اپنے دونوں کانوں کو متعدد مقامات سے چھدوا رکھا تھا اور دونوں کانوں کے بالائی حصوں میں چھوٹی چھوٹی بالیوں کی قطاریں سجا رکھی تھیں۔ یہ طلائی بالیاں' کانوں کے بالائی حصے میں نیچے سے اوپر تک چلی گئی تھیں۔

وکیل استغاثہ نے واجبی سی جرح کر کے جب اسے فارغ کر دیا تو میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ ان لمحات میں وہ خاصی گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ آمنہ میری دریافت تھی' لہٰذا اس سے سوال و جواب کی ذمے داری بھی مجھی پر عائد ہوتی تھی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا' پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا خیال ہے آمنہ..... اس مرتبہ تم نے گاؤں میں کچھ زیادہ ہی دن نہیں لگا دیئے.....؟''

''ہاں' ادھر گاؤں میں کچھ مسئلہ ہو گیا تھا۔'' وہ ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''میرا چاچا فوت ہو گیا تھا۔''

''تو اب تم گاؤں والے معاملات نمٹا کر واپس آ گئی ہو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''تمہارے دل و دماغ سے غم کے بادل چھٹ چکے ہیں اور میں تم سے جو بھی پوچھوں گا' تم حاضر دماغی سے اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو گی؟''

''جی.....'' وہ نحیف سی آواز میں بولی۔ ''آپ پوچھیں.....''

میں نے پوچھا۔ ''آمنہ! گھروں میں کام کرنے والی ماسیاں عموماً صبح ہی آیا کرتی ہیں۔ تمہارے سہ پہر آنے کی کوئی خاص وجہ.....؟''

''باجی دیر تک سونے کی عادی تھی جناب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ ساڑھے دس' گیارہ بجے سے پہلے سوکر نہیں اٹھتی تھی اور میرے پاس اس وقت ایک گھر لگا ہوا تھا۔ میں باجی کے پاس صبح دس سے پہلے آ سکتی تھی' لہٰذا اس نے مجھے شام میں بلا لیا تھا۔''

''باجی!'' سے آمنہ کی مراد مقتولہ نورین تھی۔ میں نے آمنہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تم مقتولہ کے گھر کتنے بجے کام کرنے آیا کرتی تھیں؟''

''جی..... پانچ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور تمہارا کام کب تک ختم ہو جاتا تھا؟''

''جب باجی کپڑے بھی دھلاتی تھی تو پھر چھ تو بج ہی جاتے تھے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''اگر صرف جھاڑو پونچھا اور برتن وغیرہ ہوں تو میں یہ کام آدھے گھنٹے میں نمٹا کر فارغ ہو جاتی تھی۔''

''یعنی زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ بجے.....؟''

''جی.....'' وہ متلاشی نظر سے عدالت کے دروازے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جی ہاں۔''

آمنہ کی حرکات وسکنات میں ایک خاص قسم کا اضطراب پایا جاتا تھا۔ وہ بار بار عدالت کے دروازے کی جانب اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ جب کوئی شخص پہلی مرتبہ گواہی دینے عدالت میں پیش ہوتا ہے تو اس پر لازماً ایک گھبراہٹ سی طاری ہوتی ہے لیکن آمنہ کی گھبراہٹ بڑی منتظرسی اور انوکھے انداز کی تھی۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آمنہ! کیا وقوعہ کے روز بھی تم پانچ بجے سہ پہر ہی مقتولہ کے گھر پہنچی تھیں؟''

''جی اس روز میں ذرا جلدی آ گئی تھی۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''کتنی جلدی؟''

''آدھا گھنٹہ پہلے.....'' اس نے جواب دیا۔

''یعنی ساڑھے چار بجے؟''

''جی ہاں!''

''اس روز جلدی آنے کی کوئی خاص وجہ تھی؟''

''جی..... میرا بچہ بیمار تھا.....'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اسے پانچ بجے ڈاکٹر کو دکھانا تھا' اسی لئے میں نے سوچا کہ ذرا جلدی چلی جاتی ہوں تاکہ کام جلدی ختم کر کے گھر واپس آ جاؤں۔''

''جب تم مقتولہ کے گھر پہنچیں تو پھر کیا ہوا تھا؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

''میں گھر میں داخل ہوئی' جھاڑو اٹھائی اور بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔'' وہ بتانے لگی۔ ''اس دن میں جھاڑو پونچھے کے ارادے ہی سے وہاں گئی تھی اور جھاڑو کا کام میں بیڈ روم ہی سے شروع کیا کرتی تھی.....'' اس نے بات مکمل کر کے ایک بار پھر عدالت کے دروازے کی جانب نگاہ دوڑائی۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیا تمہیں کسی کا انتظار ہے؟''

''جی..... نہیں!'' اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔

''یہاں سے جانے کی جلدی ہے؟''

''ایسی بات نہیں.....'' وہ دھیمے انداز میں بولی۔ ''وہ جی..... میں پہلی مرتبہ عدالت میں آئی ہوں نا اس لئے..... دل بہت گھبرا رہا ہے۔''

''اپنے دل کو قابو میں رکھو آمنہ' ابھی تو جرح کا آغاز ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تم سے ڈھیروں سوالات پوچھنا ہیں۔ تم وہ گواہ ہو جس نے سب سے پہلے مقتولہ کی لاش کو دیکھا تھا۔ اگر تم نے اسی طرح گھبراہٹ کو خود پر طاری رکھا تو مجھے ڈر ہے تم چکرا کر کٹہرے کے فرش پر گرو گی اور بے ہوش ہو جاؤ گی۔''

''جی..... میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''شاباش!'' میں نے بہ آواز بلند کہا' پھر پوچھا۔ ''جب تم جھاڑو اٹھائے مقتولہ کے بیڈ روم میں داخل ہوئیں تو تم نے وہاں کیا دیکھا تھا؟''

''باجی..... بیڈ روم کے فرش..... پر پڑی تھی۔'' وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ''اس کے سر سے خون نکل رہا تھا اور کپڑوں والی الماری بھی کھلی پڑی تھی۔''

''ذرا اچھی طرح سوچ کر بتاؤ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد سے لے کر بیڈ روم تک پہنچنے میں تمہیں کتنا وقت لگا ہو

گا؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک منٹ جی......''

''وقوعہ کے روز تمہارے بیان کے مطابق تم ساڑھے چار بجے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچی تھیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔''اور ایک منٹ بعد ہی تم نے بیڈ روم میں مقتولہ کی لاش پڑی دیکھ لی تھی۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی' پھر کہا۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''

''جی......ایسا ہی ہوا تھا۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پھر تم نے کیا' کیا تھا؟''

''باجی کو مردہ حالت میں فرش پر پڑے دیکھ کر میں تو گھبرا گئی تھی وکیل صاحب!'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔''میری کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں فلیٹ سے باہر کی جانب دوڑ پڑی تھی۔''

''اور فلیٹ سے باہر قدم رکھتے ہی چوکیدار حنیف سے تمہارا سامنا ہو گیا تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''وہ چھت کی طرف سے زینہ اترتے ہوئے نیچے آ رہا تھا...... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی ہاں' آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔''میں نے حنیف کو بتایا کہ اندر باجی کی لاش پڑی ہے۔ یہ بات سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔''

''کیا چوکیدار نے فلیٹ کے اندر آ کر مقتولہ کی لاش دیکھی تھی؟'' میں نے چوکیدار حنیف کے بیان کی تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔

''نہیں جناب! وہ گھر کے اندر داخل نہیں ہوا تھا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔''میری بات سنتے ہی وہ بھی گھبراہٹ بھرے انداز میں نیچے کی طرف چلا گیا تھا' یہ کہتے ہوئے کہ نیچے عباسی صاحب موجود ہیں۔ میں انہیں اس واقعے کے بارے میں بتانے جا رہا ہوں۔''

''پھر چوکیدار نے عباسی صاحب کو بتایا' عباسی صاحب نے پولیس کو فون کیا اور تھوڑی دیر کے بعد پولیس وہاں پر موجود تھی۔'' میں نے سادگی سے کہا۔''ایسا ہی ہوا تھا نا......؟''

''جی ہاں' آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''تم وقوعہ کے روز سہ پہر ساڑھے چار بجے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچی تھیں۔'' میں نے اپنی جرح میں یک دم تیزی بھرتے ہوئے کہا۔''چار اکتیس پر تم جھاڑو تھامے مقتولہ کے بیڈ روم میں داخل ہوئیں۔ بیڈ روم کے فرش پر مقتولہ کی لاش پڑی دیکھ کر تمہارے اوسان خطا ہو گئے اور تم گھبراہٹ کے عالم میں باہر کی طرف دوڑیں۔ تم جیسے ہی فلیٹ سے باہر نکلیں' تمہاری نظر چوکیدار پر پڑی اور تم نے اسے مقتولہ کی لاش کے بارے میں بتایا۔''

میں سانس ہموار کرنے کے لئے متوقف ہوا' پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔''اگر ہم فرض کرلیں کہ بیڈ روم سے نکل کر فلیٹ کے داخلی دروازے تک پہنچنے میں تمہیں زیادہ سے زیادہ تین منٹ لگے ہوں گے۔ اس حساب سے جب تم نے چوکیدار کو مقتولہ کی موت کے بارے میں بتایا' اس وقت سہ پہر کے چار بج کر چونتیس منٹ ہوئے ہوں گے۔ اگر میرے حساب میں کوئی غلطی ہو تو بتاؤ......؟''

''نہیں جی' آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ عدالت کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں بولی۔''اس وقت یہی ٹائم تھا۔''

''لیکن......'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''چوکیدار حنیف نے معزز عدالت کے روبرو یہ بیان دیا ہے کہ جب تم نے اسے مقتولہ کی لاش کے بارے میں بتایا اس وقت سہ پہر کے پانچ بج کر دس منٹ ہوئے تھے...... یہ لگ بھگ ایک گھنٹے کا فرق کیسے آ گیا؟''

''چوکیدار......بھول رہا......ہو گا......'' وہ اٹک اٹک کر بولی۔''وقت تو......وہی تھا جو میں نے......آپ کو بتایا ہے۔''

میرے سوال نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ خوف کے سائے منڈلاتے دیکھے اور پہلی ہی بار مجھے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی میری جرح میں بھی تندی آ گئی اور میں نے درشت انداز میں آمنہ سے استفسار کیا۔

''چوکیدار کے بھولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ روزانہ شام میں ٹھیک پانچ بجے چھت کی ٹینکی کے والوز کھولنے اوپر جاتا ہے اور کم و بیش دس منٹ تک وہ چھت پر موجود رہتا ہے۔ وہ چھت سے نیچے آ رہا تھا کہ تمہاری اس سے ملاقات ہو گئی۔ اس وقت لگ بھگ پانچ

بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ تم اپنی بات پر ڈٹی ہوئی ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تم سراسر غلط بیانی سے کام لے رہی ہو...... آخر کیوں؟''

''مم...... میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' وہ بگڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ بولی۔'' بلکہ چوکیدار جھوٹ سے کام لے رہا ہے۔''

''وہ کیوں جھوٹ بولے گا۔'' میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔'' اس کی تم سے کیا دشمنی ہے؟''

''یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔'' وہ برہمی سے بولی۔'' مجھے کیا پتا......؟''

''اگر تمہیں نہیں پتا تو فکر نہ کرو' آج پتا چل جائے گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ چوکیدار کو تو تم نے جھوٹا قرار دے دیا ہے۔ یہ بتاؤ' عباسی صاحب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''عباسی کون......؟'' وہ سوچے بغیر بول گئی۔

''لگتا ہے' تمہاری یادداشت رخصت ہو رہی ہے۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''میں ان عباسی صاحب کا ذکر کر رہا ہوں جو بی بلاک کے فلیٹ نمبر تین سو تین میں رہتے ہیں۔ یہ وہی عباسی صاحب ہیں جن کو چوکیدار نے مقتولہ کو پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بتایا تھا اور ان کے فون کرنے پر پولیس وقوعہ پر پہنچی تھی؟''

''اچھا اچھا...... آپ ان عباسی صاحب کی بات کر رہے ہیں۔'' وہ خفت آمیز لہجے میں بولی۔

''اچھا ہوا' تمہیں خود ہی یاد آ گیا۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

میرے لہجے کی سنگینی نے اس کی آنکھوں میں ایک بے نام سی وحشت بھر دی۔ وہ کمزور سی آواز میں بولی۔'' ان عباسی صاحب کو کیا ہو گیا ہے؟''

''انہیں بھی چوکیدار کی طرح جھوٹ کا مرض ہو گیا ہے۔'' میں نے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ میں کہا۔'' ان کا بیان ہے کہ چوکیدار حنیف نے کوئی سوا پانچ بجے انہیں مقتولہ کی موت کی اطلاع دی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر سے جب متعلقہ تھانے فون کیا تو پولیس سٹیشن کی گھڑی میں سہ پہر کے ساڑھے پانچ بجے تھے۔ پولیس کوئی چھ بجے جائے وقوعہ پر پہنچی تھی۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے آمنہ سے کہا۔

''یہ اتنے سارے لوگ جھوٹ بول رہے ہیں اور ایک صرف تم ہی سچی ہو..... ہیں نا؟''

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور اپنی گردن کو نرخرے کے مقام پر سے سہلاتے ہوئے فریاد لہجے میں بولی۔'' پپ...... پپ...... پانی......''

''پانی ضرور ملے گا اور ابھی ملے گا۔'' میں نے بلند آہنگ کراری آواز میں کہا۔'' مگر اس سے پہلے تمہیں بہت سوچ سمجھ کر میرے ایک سوال کا جواب دینا ہوگا۔''

وہ بہ دستور گلے کو سہلاتے ہوئے وحشت بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔'' وقوعہ کے روز جب تم خلاف معمول ذرا جلدی کام کرنے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچیں تو گھنٹی کی آواز پر تمہارے لئے دروازہ کس نے کھولا تھا......؟''

وہ سوچ سمجھ کر جواب دینے کا مقام بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ ادھر میرا سوال ختم ہوا' ادھر اس نے کھٹ سے جواب دیا۔'' باجی نے......''

''لیکن تمہاری باجی تو اپنے بیڈروم کے فرش پر مردہ پڑی تھی۔'' میں نے طنزیہ نظر سے اسے گھورا۔'' وہ تمہارے لئے دروازہ کیسے کھول سکتی تھی۔ اب ایک ہی بات ممکن ہے کہ......''

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے تمسخرانہ انداز میں وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا' پھر دوبارہ آمنہ ماسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''جب تم مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچیں تو مقتولہ نے تمہارے لئے دروازہ کھولا تھا اور...... اور...... تم نے اسے قتل کر دیا؟''

میری بات کی تکمیل کے ساتھ ہی عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ آمنہ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ برسوں کے مریض کی طرح کٹہرے کی ریلنگ کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ وہاں موجود ہر شخص کی نگاہ اسی پر لگی ہوئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر اس بار آمنہ نے بھولے سے بھی عدالت کے داخلی دروازے کی طرف نہیں دیکھا بلکہ...... یکایک کٹہرے سے نکل کر دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔

اس منظر نے جج سمیت ہر شخص کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ فرار کی راہ اختیار کر کے اپنے جرم کا اقبال کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ عدالت کے دروازے تک پہنچ پاتی' عدالت کے کمرے میں موجود آئی او نے اپنے ایک پیٹی بھائی کے تعاون سے اسے قابو کر لیا۔ اگلے ہی

لمحے اس کے ہاتھوں میں آہنی زیور پہنا دیا گیا۔

+++

پچھلی پیشی پر رونما ہونے والی ڈرامائی صورت حال نے میرے موکل کی بے گناہی ثابت کر دی تھی۔ لہٰذا آئندہ پیشی پر عدالت نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ساجد کو باعزت بری کر دیا۔

آمنہ کو گزشتہ پیشی پر ہی حراست میں لے لیا گیا تھا۔ پولیس کسٹڈی کی پہلی رات ہی اس نے اپنا جرم قبول کر لیا تھا۔ مقتولہ کی الماری سے پچاس ہزار روپے اسی نے چرائے تھے اور پکڑے جانے پر اس نے ہتھوڑی سے مقتولہ کی کنپٹی پر ایک کاری ضرب لگا کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ اس کے اقبالی بیان کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

اس نے بچے کی بیماری کا محض بہانہ کیا تھا۔ وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وقوعہ کے روز آدھا گھنٹہ پہلے وہاں پہنچ گئی تھی۔ ڈرائنگ روم کے فرش پر بکھرے لکڑی اور کپڑے کے کچرے میں اسے ملزم کی ہتھوڑی پڑی نظر آئی تو اس نے ایک فوری خیال کے تحت اس ہتھوڑی کے آہنی حصے یعنی سر کی طرف سے پکڑا اور اپنے ساتھ بیڈ روم میں لے گئی۔ اس کے ذہن میں آیا تھا کہ اگر وہ چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی تو اپنی حفاظت کے لئے اسی ہتھوڑی کو استعمال کرے گی۔ ہتھوڑی کو آہنی حصے کی جانب سے پکڑنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے دستے پر اپنی انگلیوں کے نشانات نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک ٹی وی ڈرامے میں دیکھا تھا کہ فنگر پرنٹس کی مدد سے پولیس بہ آسانی مجرم تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ ہتھوڑی ساجد علی کی تھی' لہٰذا پولیس کی تحقیق ساجد ہی کو مجرم ٹھہراتی۔ اس نے بہ ضروری ضرورت ہتھوڑی کے دستے کو ایک رومال سے پکڑ کر مقتولہ کی کنپٹی پر آزمایا تھا' لہٰذا ساجد علی کے فنگر پرنٹس ہتھوڑی کے دستے پر محفوظ رہے تھے۔

اس کیس میں بلکہ آمنہ ماسی کے بیان میں سب سے دلچسپ' بلکہ افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ آخر اسے رقم چرانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی تھی۔ آمنہ کے مطابق' اس کے چھوٹے بہن بھائیوں اور بوڑھے ماں باپ کو گاؤں کے سردار نے اپنی پرائیویٹ جیل میں قید کر رکھا تھا۔ کسی زمانے میں آمنہ کے باپ نے سردار سے پانچ ہزار روپے قرض لئے تھے جو سود در سود بڑھ کر پچاس ہزار ہو گئے تھے۔ سردار نے نہ صرف آمنہ کی فیملی کو اپنی خفیہ قید میں ڈال دیا تھا'

بلکہ ان کے کچے مکان کو بھی اپنے ایک ملازم کے استعمال میں دے دیا تھا۔ اس سردار کا بس ایک ہی مطالبہ تھا کہ جب تک اس کے پچاس ہزار روپے ادا نہیں کیے جائیں گے' وہ ان لوگوں کو نہیں چھوڑے گا۔ آمنہ کو کسی طرح دو دن پہلے پتا چل گیا تھا کہ وقوعہ کے روز مقتولہ دوپہر میں بینک سے ایک تگڑی رقم نکال کر گھر لائے گی' جو شام تک گھر کے اندر ہی موجود رہے گی لہٰذا اس نے اپنے خاندان کی آزادی کے جرم کی دلدل میں کودنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے یہ جرم نظریہ ضرورت کے تحت کیا تھا۔

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ نظریہ ضرورت کے تحت کیا گیا جرم جائز ہو جائے گا' لیکن لمحہ فکریہ تو یہ ہے کہ آمنہ نے جرم کیا' وہ قانون کی گرفت میں آئی اور عدالت نے انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس ضرورت مند کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا' مگر سرداروں اور وڈیروں کی پرائیویٹ جیلیں اب بھی آباد ہیں اور خدا جانے کب تک آباد رہیں گی۔ قانون کی نگاہ اور ہاتھ وہاں تک رسائی کیوں نہیں حاصل کر پاتے۔

قانون اور انصاف تو ہر شاہ و گدا کے لئے یکساں ہونا چاہئے نا... آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

+++